جرمِ مسلماں

(ناول)

پرویز بلگرامی




والز اسٹریٹ کا اسٹاپ آ گیا تھا۔ مجھے یہیں اترنا تھا۔ میں ایگزیٹ ڈور کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ میرے جسم پر اوور کوٹ تھا اور اس پر برساتی تھی۔ پھر بھی سرد ہوا نے نیچے اترتے ہی مزاج پوچھ لیا۔ تیز ہوا نشتر کی طرح ہر موئے تن میں چبھی۔ میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ روئی کے گالے سے اڑتے برف کے ذرات خوش نما لگے۔ جھل ملاتی سفید چادر سی چھائی نظر آ رہی تھی۔ لوگ چھتریاں لگائے۔ رین کوٹ پہنے آ جا رہے تھے۔ میں ان کے درمیان سے ہوتا ہوا اس بلڈنگ میں داخل ہو گیا۔ کارڈ پر یہیں کا پتا تھا۔ تیسری منزل کے اس کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ نظر آ گیا۔ اس کے برابر میں ایک اور آدمی بیٹھا تھا۔ دوسرا آدمی خباثت والے چہرے کا مالک تھا اس لیے میں نے پہلے آدمی کو مخاطب کیا "کیا آپ ہی مسٹر جوین الفارڈ ہیں؟"

"جی ہاں..... آپ شاید لارڈ ڈلفی کے......" اس نے کہا ہی تھا کہ میں نے اس کی بات کاٹی۔

"جی ہاں... آپ نے صحیح پہچانا۔"

"میرا اسسٹنٹ کاغذات تیار کرا چکا ہے۔ آپ دستخط کر دیں اور جتنی جلد ہو قبضہ حاصل کر لیں۔"

"مگر میں ان کاغذات پر نہ تو دستخط کرنا چاہتا ہوں اور نہ جائداد پر قبضہ۔"

میری بات پر وہ دونوں ہی چونک گئے۔ "آپ کو معلوم ہے یہ جائداد کتنے کی ہے؟ مسٹر ڈیوڈ! پورے ستر لاکھ پاؤنڈ سے زیادہ کی ہے؟"

"کتنے ہی کی کیوں نہ ہو مجھے نہیں لینا۔" میں نے صاف بات کی۔

"اگر آپ نہیں لیں گے تو یہ وصیت کے خلاف بات ہوگی۔" وکیل نے کاغذات سمیٹتے ہوئے کہا۔

"آپ ایسا کریں کہ یہ جائداد میری این جی او کو ڈونیٹ کر دیں۔" وکیل کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔

"فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"عجیب پاگل شخص ہے۔" وکیل کی بڑبڑاہٹ مجھے صاف سنائی دے گئی تھی مگر میں رکا نہیں۔ دفتر سے نکل کر باہر آ گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں ساؤتھ ہال کی طرف جاؤں مگر میں نے سوچا کہ ایک عرصہ ہو گیا ہے امجد صدیقی چچا کی طرف گیا نہیں آج وہاں کا ایک چکر لگا آؤں۔ اسی خیال سے میں اس طرف جانے والی بس کے انتظار میں ٹرمینل پر کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

ڈور بیل بجاتے ہی دروازہ کھل گیا۔ سامنے ہی شہلا چچی کھڑی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی خوشی سے چہکارتے ہوئے بولیں۔ "ارے آج اتنے دنوں بعد کیسے راستہ بھول پڑے۔ ہم تو تمہاری شکل دیکھنے کے لیے بھی ترس گئے ہیں۔"

"بس چچی جان' مصروفیت ہی اتنی ہے کہ کہیں آنے جانے کا سوچ کر ہی رہ جاتا ہوں۔ امی کے بعد میں بہت زیادہ اپ سیٹ ہو گیا ہوں۔ کسی بھی کام میں دل نہیں لگتا۔" میں نے کہا تو وہ بھی افسردہ ہو گئیں۔ پھر بولیں "کیا اندر آنے کا ارادہ نہیں ہے۔ اندر تو آؤ۔"

میں اندر داخل ہوا تو ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے چچا جان نظر آ گئے۔ میں نے سلام کیا تو وہ دعا دیتے ہوئے بولے "بیٹا مجھے تو تم سے شکایت ہے ہی مگر شہلا کو بہت زیادہ ہے۔ بوڑھی ہو گئی ہے نا۔"

"بوڑھے تم ہوئے ہو' میں کیوں ہونے لگی۔" شہلا چچی مصنوعی غصے میں بولیں اور میں مسکرا کر رہ گیا۔

شہلا چچی میرے لیے بہت اہم تھیں میں انہیں ناراض کیسے کر دیتا اسی لیے جلدی سے بولا "چچی جان کو منا لینا کون سا مشکل ہے۔ آپ مجھ سے ناراض ہو ہی نہیں سکتیں۔"

"چل شیطان کہیں کا۔" شہلا چچی نے میرے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔

چپت اگر ہلکے سے پڑے تو پیار کا پرتو' اور اگر زور سے پڑے تو دشمنی کی ابتدا۔ اس میں پیار تھا۔ وہ پیار جو بچپن سے مجھ پر نچھاور ہوتا آیا ہے۔ میں نہال ہو گیا۔ ہنستے ہوئے بولا "بس اسی چپت کی لالچ میں تو میں آج آیا ہوں' کتنے دن ہو گئے آپ نے چپت نہیں ماری۔"

"اب تو بڑا بھی تو ہو گیا ہے۔" چچی نے پیار سے سر سہلا کر کہا۔

"پہاڑ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جائے آسمان سے نیچے ہی رہتا ہے۔ آپ میرے لیے شفقت بھرا آسمان ہیں۔" میں نے ان کے آگے سر جھکا کر اداکاری کے انداز میں مکالمہ بولا تو چچا نے ہنس کر کہا:

"کیا اوپیرا سے آ رہے ہو۔ یہ ڈائیلاگ کیوں پھینکا جا رہا ہے؟"

"دراصل میرا موڈ خراب ہو گیا۔ اسی تلخی کو چچی جان کی حلاوت میں دور کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ صبح ہی صبح وکیل کا فون آ گیا تھا۔ اس سے ہی مل کر آ رہا ہوں۔"

"اس نے کیا کہا؟" چچا جان کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

"وہی مرغی کی ایک ٹانگ' بہت بڑی جائداد ہے' لے لو۔"

"اس جائیداد پر تمہارا حق بنتا ہے تمہیں لے لینا چاہیے۔" چچا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں' میں اس جائیداد کو ہاتھ بھی لگانا نہیں چاہتا۔" میں نے صاف لہجے میں کہا۔

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس جائداد کی مالیت ستر لاکھ پاؤنڈ سے زیادہ کی ہے' یہ ایک بہت بڑی رقم ہے۔ تم ایک چھوٹے سے مکان میں زندگی گزار رہے ہو' ایک ایک پیسے کے لیے ترستے ہوئے زندگی گزار چکے ہو پھر بھی؟" چچا کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جی ہاں ! پھر بھی لارڈ ڈلفی کی جائیداد پر میں تھوکتا ہوں۔" میرے الفاظ سے نفرت عیاں تھی۔

"آخر کب تک تم نفرت کی آگ میں جلتے رہو گے' کچھ بھی ہو اب لارڈ ڈلفی اس دنیا میں نہیں رہے۔ ان کو معاف کر دو۔"

"اگر میری ماں نے انہیں معاف کر دیا ہوتا تو شائد میں بھی معاف کر چکا ہوتا۔" میرے لہجے میں درد سمٹ آیا۔

"میری واقعی مریم تھی' حضرت مریم کی طرح معصوم۔ وہ ایک ترحم کے جذبے سے سرشار عورت تھی۔ اگر وہ آج رہتی تو تمہیں بھی یہی مشورہ دیتی کہ تم لارڈ ڈلفی کو معاف کر دو۔"

"امی جان اب اس دنیا میں رہی نہیں اس لیے ان کا ذکر اب فضول ہے۔" میں نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

"تمہارے اس پاگل پن کا علاج اب تمہاری چچی ہی ڈھونڈیں گی۔ یہ بتاؤ کہ آئندہ کا پلان کیا ہے۔ کیونکہ اب تو تم نے تعلیم بھی مکمل کر لی۔ کس کے ساتھ مل کر کام شروع کرو گے؟ کسی انگریز کے ساتھ یا صفدر اینڈ کمپنی میں شامل ہو جاؤ گے۔"

"فی الحال میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔"

"کیا؟"

"آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں لندن میں پلا بڑھا ضرور ہوں مگر مجھے اس سرزمین سے کبھی پیار نہ تھا۔ کبھی اس ملک کو اپنا نہیں سمجھا کیوں کہ میرے دل و دماغ پر شروع سے پاکستان چھایا رہا ہے۔ بچپن سے میں اسی ملک کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ میرے لبوں پر ہمہ وقت بس ایک ہی دعا ہوتی تھی کہ میں ایک بار' صرف ایک بار اس پاک سرزمین کو دیکھ لوں۔ اس سرزمین کو جس کے حصول کے لیے ماؤں نے اپنے جگر گوشے' بہنوں نے اپنی آبرو گنوائی۔ ننھے ننھے بچوں کے گلے رہتے گئے۔ جوانوں کے امنگوں بھرے سینے چھیدے گئے۔ جسے اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے۔"

"تو گویا تم نے پاکستان جانے کی ٹھان لی ہے؟"

"جی ہاں کیوں کہ اب تک میں چاہ کر بھی پاکستان جا نہیں سکا۔ میری راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ میری ماں تھی۔ ان کا پیار تھا۔ ممتا کا قرض کون چکا سکا ہے؟ پھر میری امی تو بہت معصوم اور بہت اخلاق والی تھیں۔ اسی لیے بار بار پاکستان دیکھنے کا خواب دیکھتے ہوئے بھی میں ان سے منہ بھر کر کبھی فرمائش نہیں کرتا تھا۔ لیکن اب میں اپنے اس خواب کو ضرور پورا کروں گا۔"

"پاکستان جانا چاہتے ہو چلے جانا۔ میں خود انتظام کر دوں گا مگر پہلے تم لارڈ ڈلفی کی جائیداد پر اپنا حق جما لو۔ اسے حاصل کر کے کسی کیئر ٹیکر کے سپرد کر کے جاؤ۔"

"آپ کا مشورہ میرے سر آنکھوں پر اس لندن میں آپ لوگوں کے سوا نہ کوئی پہلے تھا اور نہ اب کوئی ہے۔ آپ لوگ میرے بھلے کے لیے ہی سوچتے ہیں مگر....." میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ان باتوں کو گولی مارو پہلے کھانا کھاؤ۔ تمہاری پسندیدہ ڈش ماش کی کھچڑی فٹافٹ تیار کی ہے۔" کہتے ہوئے چچی جان نے ڈائننگ ٹیبل پر رکھی پلیٹ میں کھچڑی نکالتے ہوئے کہا۔

ساؤتھ ہال میں پاکستان سے لائی ہوئی تمام اشیاء مل جاتی ہے جس میں اصلی گھی اور اچار بھی ہے۔ میں نے ابھی تک پاکستان تو دیکھا نہیں ہے مگر پاکستانی ڈش چچی کی بدولت کھاتا رہا ہوں۔ ماش کی کھچڑی گھی ڈال کر اور آم کا اچار۔ میں خود کو روک نہ سکا اور ٹیبل کی طرف کھنچا چلا آیا پھر کھانے پر ٹوٹ پڑا۔

"دیکھو بیٹا' اس دنیا میں پیسے کی ضرورت قدم قدم پر پڑتی ہے اس کا احساس تمہیں بھی ہوگا۔ اسی لیے میرا مشورہ ہے کہ جذبات کو تھپکیاں دے کر سلا دو اور لارڈ ڈلفی کی جائیداد اپنے نام کرا لو۔" کھانے کے درمیان بھی چچا سمجھاتے رہیں۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں نے کہا "آپ کی اس بات کا جواب میں کل دوں گا۔ ابھی مجھے ایک ضروری کام سے مانچسٹر کے لیے نکلنا ہے۔ کل تک لوٹ آؤں گا پھر آپ کو بتا دوں گا کہ میں نے کیا سوچا ہے۔"

میں ان کے گھر سے نکل آیا۔

ابھی میں باہر نکلا ہی تھا کہ نوبل الفسٹن سے ملاقات ہو گئی۔ وہ میرے بچپن کا دوست تھا۔ ایک ساتھ کھیل کر ہم بڑے ہوئے۔ وہ مجھے اپنا دوست ہی نہیں بھائی کہتا تھا۔ وہ بھی نسلاً انگریز تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "ہیلو ڈیوڈ کیسے ہو؟ اتنے دن بعد نظر آئے۔ تعلیم مکمل کر لی ناں۔"

"ہاں...." میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"آؤ وہاں بیٹھتے ہیں' تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

میں اس کے ساتھ سامنے والے پارک میں آ گیا۔

اس نے ایک خالی بینچ پر بیٹھتے ہوئے کہا "ڈیوڈ تم میرے دوست ہی نہیں میرے بھائی کی طرح ہو۔ ایسٹ لندن میں تم سے زیادہ قریب میرے اور کوئی نہیں ہے۔ بچپن سے میں تم سے خود کو بہت قریب سمجھتا رہا ہوں۔ تمہارے دل میں پتا نہیں میرے لیے کیا جذبات ہیں میں نہیں جانتا۔"

"میں تمہاری اس تمہید کا مقصد سمجھ نہیں پایا؟" میں نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں نے سنا ہے کہ تمہارے گرینڈ پا لارڈ ڈلفی نے اپنی وصیت میں ساری جائیداد تمہارے نام کر دی ہے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے؟"

"ہاں یہ سچ ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اور تم اس دولت کو ٹھکرا رہے ہو؟"

"ہاں یہ بھی صحیح ہے۔" میں نے اقرار کیا۔

"ایسا اس لیے نا کہ تمہاری مما نے لارڈ ڈلفی کے گھر میں رہنا پسند نہیں کیا تھا۔ وہ ان سے ناراض تھیں۔"

"ہاں!"

"گزرے وقت کی باتوں کو سینے سے لگائے رکھنا عقل مندی نہیں ہے۔ لارڈ ڈلفی کی اپنی ایک حیثیت تھی۔ ان کا بہت بڑا نام تھا۔ ان کے نام سے جڑنا بھی فخر کی بات ہے۔ میری مانو تو لارڈ کی وصیت پر عمل کر لو۔ ان کی جائیداد پر قبضہ لے لو ورنہ..."

"ورنہ کیا؟"

"تم سمجھتے کیوں نہیں ہو لارڈ ڈلفی کی جائیداد پر گدھ نظریں لگائے ہوئے ہیں۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔

"گدھ؟ کون سے گدھ ؟" میں نے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"میں ایک راسخ العقیدہ کیتھولک ہوں۔ پابندی سے چرچ جاتا ہوں......"

"ہاں یہ میں مانتا ہوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"اس کا بھی تمہیں علم ہے کہ جو خدا باپ کے پیارے بیٹے کو غلط سمجھتا ہے میں اسے غلط سمجھتا ہوں خواہ وہ یہودی ہو یا مسلم۔"

"ہاں یہ بھی جانتا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر مسلمانوں کے مقابلے میں یہودیوں کو بدترین سمجھتا ہوں کیونکہ انہوں نے خدا کے بیٹے کو اذیت دی۔ اسے سولی چڑھایا۔" وہ اپنے دل کا غبار نکال رہا تھا اور میں دوستی کے ناطے برداشت کر رہا تھا۔ وہ مذہب کے معاملے میں جنونی تھا مگر دوست تھا اس لیے میں خاموش تھا۔ مجھے یار کی یاری سے مطلب تھا۔ یار کے فعل سے نہیں۔ اس لیے بھی میں ہمہ تن گوش ہونے کی اداکاری کر رہا تھا۔

"یہ خدا باپ کی مجرم قوم ہے۔ سبت کی مجرم ہے۔ من سلوا کی ٹھکرائی ہوئی قوم ہے۔ یعنی کہ طمع وحرص میں بھری قوم ہے۔ لالچ ان کی سرشت میں ہے۔ دنیا کی سب سے

لالچی اور کینہ پرور قوم ہے۔ مگر آپس کے اتحاد میں ان کا ثانی نہیں ہے۔" کہہ کر اس نے میرے چہرے کا جائزہ لیا جیسے وہ میرے چہرے پر اپنے الفاظ کا پرتو ڈھونڈ رہا ہو۔ ردعمل دیکھ رہا ہو۔ میں اس کی اس تقریر سے اکتاہٹ محسوس کرنے لگا تھا مگر اس کی نگاہوں کی تپش سے فوراً ہی متوجہ رہنے کی اداکاری کرنے لگا۔ اس نے سلسلہ کلام کو آگے بڑھایا "اپنے اکلوتے ملک کی خاطر وہ پوری دنیا سے سرمایہ اکٹھا کرتے ہیں۔ ہر سطح پر ایسی اطلاع بھی ملی ہے کہ یہ چھوٹے موٹے جرائم انفرادی طور پر بھی کرتے ہیں اپنے ملک کی خاطر۔ یعنی جو جہاں جس طرح جس سے ہوتا ہے اپنے ملک کی معیشت کو سنبھالا دینے کے لیے سرمایہ بھیجتا رہتا ہے۔ دنیا کے جس کونے میں یہودی ہے وہ اپنے ملک کی ترقی کے لیے کوشاں ہے۔ اس وقت ایک یہودی گروپ یہاں بھی کارروائیاں کر رہا ہے۔ میرے دوستوں کی اطلاع کے مطابق ایک گروپ تمہارے گرانڈ پا کی جائداد پر نظریں گڑائے ہوئے ہے۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت بھرے انداز میں پوچھا۔ اب میری دلچسپی اس کی باتوں میں بڑھ گئی تھی۔ "وہ لارڈ ڈلفی کی جائداد میں دلچسپی کیوں لینے لگے؟"

"اس لیے کہ اس کی قیمت وہ کھڑی کر کے اپنے ملک بھیج سکیں۔ زرمبادلہ ان کے ملک میں پہنچتا رہے۔ یا پھر وہ اسے اپنے کسی کام میں لانا چاہتے ہوں۔ میرا مشورہ ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو جائیداد پر قبضہ حاصل کر لو۔"

اس کی باتوں نے مجھے سوچ میں ڈال دیا تھا۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتا تھا مگر اسرائیلیوں کے مفاد کی خاطر جائیداد چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ یوں بھی مجھے یہودیوں سے سخت نفرت ہے۔ ان کی ظلم کی داستانیں میں میڈیا پر دیکھتا رہتا تھا مگر میں عالمی میڈیا تو تھا نہیں کہ ان ظالموں کے ظلم کو نظرانداز کر دیتا۔ وہ مظلوم فلسطینیوں کی بستیاں اجاڑتے رہیں۔ ان کی لاشیں گراتے رہیں اور ہم خاموش رہیں۔ میں ان لوگوں جیسا تو تھا نہیں جو مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے دہشت گردی پر اتر آئے ہیں اور اپنے ہی ملک میں دہشت گردی کر کے اپنے ہی لوگوں کو قتل کرتے ہیں تا کہ اقوام عالم کہہ سکے کہ مسلمان دہشت گرد ہوتے ہیں۔ یعنی یہودیوں کی سازش کا خود ہی شکار ہو رہے ہیں۔ ایسی ہی سازش سوچنے کی وجہ سے میں ان یہودیوں کو ناپسند کرتا تھا کہ وہ دشمن کو اپنے ہی ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ لینے پر مجبور کر دینے والی سازش تیار کرتے ہیں۔ اب مجھے یاد آ گیا تھا کہ وکیل کے ساتھ جو آدمی بیٹھا تھا اس کے چہرے پر وہی خباثت تھی جو ہر یہودی

کے چہرے کا خاصہ ہے۔ مجھے نوبل کی بات سچ لگنے لگی تھی۔

"اتنے بڑے لندن میں انہوں نے مجھے کیسے تاک لیا؟" میں نے اپنے ذہن میں ابھرتے سوال کا جواب مانگا۔

"یہ بات سب کو معلوم ہے کہ تم پاکستان جانے کی سوچ رہے ہو۔ اس ملک میں جانا چاہتے ہو جس کو تم نے دیکھا بھی نہیں ہے۔ اور یہ بات بھی تمہارے علم میں ہوگی کہ تعصب پرست اس ملک کو اچھا نہیں سمجھتے۔ اس لیے کہ وہ ایک مسلمان ملک ہے۔ ایسا ملک جو مسلمانوں کو خاص اہمیت دیتا ہے۔ بم برستا ہے فلسطین میں اور لوگ روڈ پر نکل آتے ہیں پاکستان میں۔"

"ایسا ہونا تعجب خیز بات نہیں ہے۔ تم ایک کیتھولک عیسائی ہو۔ کسی بھی کیتھولک کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے تو تمہارا دل دکھتا ہے نا؟"

"وہی سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ ملک ہر اسلام دشمن شخص کی نظروں میں خار ہے۔ پاکستان واحد ملک ہے جسے کیسل آف اسلام کہا جا سکتا ہے۔ وہاں تمہارے جانے کا سن کر ہی وہ متوجہ ہوئے ہوں گے۔ ان کی گدھ جیسی نظریں ہیں۔ وہ ہر ایک پر نظر رکھتے ہیں۔"

میرے ذہن میں ایک لاوا سا پکنے لگا تھا۔ گویا یہودیوں نے اس جائیداد پر آنکھیں گڑا دی ہیں۔ اسے بچانا ضروری ہے۔ ہم یہی سمجھتے ہیں کہ یہودی صرف بڑے بڑے کام کرتے ہیں مگر اب پتا چلا کہ وہ ہر سطح پر کام کر رہے ہیں۔ اپنی قوم اور ملک کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے لارڈ ڈلفی کی جائداد پر قبضہ جما لینا چاہیے ورنہ یہ بھی ان ڈائرکٹ وے میں یہودیوں کی پراپرٹی ہو جائے گی۔ وہ ایک ایک پینی جمع کر رہے ہیں تاکہ ان کے ملک کو ترقی ملتی رہے۔ وہ دنیا پر اپنا قبضہ برقرار رکھ سکیں۔

"اچھا یار میں اس بارے میں اپنے لوگوں سے مشورہ کرتا ہوں۔" کہہ کر میں کھڑا ہو گیا۔

"میری باتوں پر غور کرتے رہنا۔" اس نے ہاتھ ملایا اور باہر چلا گیا۔ میں بھی پارک سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔

میں اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا۔ میں نے ٹیکسی لینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ بس پیدل ہی پیدل آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ میرے ذہن میں کوئی لائحہ عمل بھی نہیں تھا۔ مجھے کہاں

جانا ہے۔ کیا کرنا ہے۔ دماغ میں کوئی بات واضح نہیں تھی۔ بس میں سوچ میں ڈوبا ہوا چلا جا رہا تھا۔ حالانکہ کل تک میں صرف پاکستان جانے پر غور کر رہا تھا۔ اس پاکستان جہاں نواب افتخار الملک تھے۔ وہ افتخار الملک جنھیں میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر میرے لیے وہ بہت اہم تھے۔

نواب افتخار الملک بھارتی شہر پانی پت کے تھے مگر اب وہ پاکستانی شہری ہیں۔ وہاں کے شہر کراچی میں رہتے ہیں۔ وہ خود تو کراچی میں رہتے ہیں مگر ان کی محبت میرے دل میں رہتی ہے۔ اس لیے بھی کہ امی انھیں دل کی گہرائی سے چاہتی تھیں۔ امی میرے لیے سب کچھ تھیں۔ وہ جیسا کہتی تھیں میں ویسا ہی کرتا تھا، انھوں نے لندن کے ماحول سے ہٹ کر میری پرورش کی تھی۔ بالکل اسلامی انداز میں۔ اس لیے میں انھیں ممی یا موم نہیں امی جان کہتا تھا۔ امی کے ساتھ ایک اور ہستی تھی جس نے میرے نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ تھیں شہلا چچی۔

شہلا چچی کے شوہر امجد صدیقی' امی کے ساتھ آکسفورڈ میں پڑھتے تھے۔ انھوں نے ہی امی کا تعارف نواب افتخار الملک سے کرایا تھا۔ افتخار الملک ان کے دوست تھے' وہ بہت معصوم اور بہت جینئس تھے۔ امی نے یہی بتایا تھا۔ ان کی معصومیت نے ہی امی کو ان کا گرویدا بنایا تھا۔ انہوں نے افتخار الملک کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ جسے افتخار الملک نے بھی دل سے قبول کر لیا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ یہ دوستی محبت میں بدل گئی اور پھر شادی کے روپ میں ڈھل گئی۔ دونوں ایک بندھن میں بندھ گئے تھے۔

امی انگریز والدین کی بیٹی تھیں' خطاب یافتہ انگریز کی' اور انگریز برصغیر کے حکمران تھے۔ وہ خود کو آقا اور ہندوستانیوں کو غلام سمجھتے تھے۔ اس لیے امی کے پاپا لارڈ ڈلفی اور ان کی مما نے ان کا بائی کاٹ کر دیا۔ مگر امی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ ذرا بھی نہیں گھبرائیں۔ ابو کا ہاتھ پکڑ کر اپنی مما پپا کا گھر چھوڑ دیا۔ ایسے وقت میں امجد چچا نے ان کا ساتھ دیا۔

امجد چچا نے لندن کے مضافات میں ایک گھر لے رکھا تھا۔ وہ اپنی بیگم کے ساتھ رہتے تھے۔ شہلا چچی پکی مذہبی خاتون تھیں۔ نماز روزے کی سخت پابند۔ ان پر امجد چچا نے ذمے داری ڈال دی تھی کہ وہ امی کو اسلامی تعلیمات سمجھایا کریں گی، انھوں نے امی کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا، نماز روزے کے طریقے بتائے۔ پہننے اوڑھنے کا سلیقہ سکھایا۔ تاکہ وہ پوری طرح سے مسلمان نظر آئیں۔

ابو امی کی پیار کی نشانی کے طور پر میں اس دنیا میں آنے والا تھا کہ برصغیر میں تعصب کے عفریت نے منہ پھاڑ دیا۔ انسانیت مرگئی حیوانیت کا بول بالا ہو گیا۔ بستی کی بستیاں جلائی جانے لگیں۔ لاشوں کے مینار کھڑے کیے جانے لگے۔

وہاں کے بگڑتے ہوئے حالات دیکھ کر ابو کے والدین نے ٹیلی گرام دیا کہ فوراً آجاؤ۔ ابو تار ملتے ہی پانی پت چلے گئے۔

ابو ایسے گئے کہ پھر انھوں نے مڑ کر خبر نہ لی۔ امی شہلا چچی کے تہ خانے یعنی بیسمنٹ میں زندگی گزارنے لگیں۔ تعلیم یافتہ تھیں۔ انھیں ایک اچھی سی نوکری بھی مل گئی۔

وقت تیزی سے گزرنے لگا اور میں چار سال کا ہو گیا۔ امجد چچا نے ابو کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی۔ جب بھی کوئی ہندوستان سے آتا یا وہاں جاتا امجد چچا اس سے ابو کے بارے میں معلوم کرانے کی کوشش ضرور کرتے۔ مگر کہیں سے بھی حوصلہ افزا خبر نہ ملتی۔ ہندوستان سے آنے والے بتاتے کہ اب وہاں پانی پت میں مسلمان نہیں رہے۔ افتخار الملک کی حویلی جل کر راکھ ہو چکی ہے۔ شہر میں مسلمانوں کا نام ونشان نہیں ہے۔ یوں بھی ان دنوں ہندوستان مسلمانوں کا مقتل بنا ہوا تھا۔ اخبارات مسلمانوں کی تباہی و بربادی کی الم ناک داستانیں سنا رہے تھے۔ وہاں سے آنے والے خبروں کی تائید کرتے کہ اب تک لاکھوں لوگ مارے جا چکے ہیں۔ امی نے بھی خود کو بیوہ تسلیم کر لیا تھا مگر اسلامی احکامات کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوئیں۔ ان کے والدین نے بہت زور دیا کہ وہ ان کے ساتھ منتقل ہو جائیں لیکن امی کسی طور راضی نہ ہوئیں۔ اس معاملے میں شہلا چچی نے امی کا بھرپور ساتھ دیا۔ جب وہ دفتر چلی جاتیں تو شہلا چچی مجھے سنبھالتیں، مجھے دینی باتیں بتاتیں۔ امی کو شرع کے نکات سمجھاتیں۔

جب میں پانچ سال کا تھا کہ پاکستان سے ابو کا خط آگیا۔ خط لانے والے نے ہی ابو کو تلاش کیا تھا۔ اسے یہ کام امجد چچا نے سونپا تھا اور اس شخص نے کسی نہ کسی طرح ابو کو ڈھونڈ لیا تھا۔ واپسی کے وقت وہ ان کا خط لے کر آئے تھے۔ خط میں ابو نے لکھا تھا کہ "لندن سے آنے کے تیسرے ہی دن شہر میں ہندو مسلم فساد شروع ہو گیا۔ ایک طرف نہتے مسلمان تھے دوسری طرف ہتھیار بند غنڈے اور مسلح پولیس والے۔ ان سب نے مل کر مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا تھا۔ ہماری حویلی پر بھی بلوائیوں نے حملہ کر دیا۔ گھر کے ایک ایک فرد کو قتل کر دیا گیا۔ میری قسمت میں ٹھوکریں کھانا تھا کہ میں اپنی دو چھوٹی بہنوں کے ساتھ ان کی ایک ہندو

سہیلی کے گھر گیا ہوا تھا۔ وہیں یہ خبر ملی تھی۔ جن کے گھر گیا ہوا تھا۔ ان صاحب میں انسانیت باقی تھی۔ انھوں نے اپنے یہاں چار دن تک ہم تینوں کو چھپائے رکھا۔ پورا شہر بلوائیوں کے گھیرے میں تھا۔ ان کا گھیرا توڑ کر نکل جانے میں کیسے کامیاب ہوا۔ یہ ناممکن کام کیسے ممکن ہوا یہ ایک الگ کہانی ہے۔ جس شخص نے ہمیں اس گھیرے سے نکالا تھا اسی نے ہمیں امدادی کیمپ تک پہنچایا پھر ہم وہاں سے پاکستان آگئے۔ اس دور پرآشوب میں مجھے خود اپنی خبر نہ تھی، تمھیں کیسے یاد رکھتا۔ مگر آج امجد کے ایک دوست نے میرے زخموں کو پھر سے تازہ کر دیا ہے۔ اس کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ میرا ایک بیٹا بھی ہے۔ اس بیٹے کو دیکھنے کی بڑی آرزو ہے مگر کیا کروں کہ میں یہاں پیسے پیسے کو محتاج ہوں۔ دو بہنوں کا ساتھ ہے اس لیے لندن جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم آزاد ہو۔ اگر چاہو تو کسی کا ساتھ پکڑ لینا مگر میری، ایک غریب باپ کی التجا ہے کہ میرے بیٹے کا خیال رکھنا۔ کہیں وہ بھی لندن کے رنگ میں نہ رنگ جائے۔ اگر زندگی رہی تو ملاقات ہو ہی جائے گی۔"

اس خط کے بعد ابو کا کوئی خط نہیں آیا۔ امی اور امجد چچا نے بہت کوشش کی کہ ان کو رقم بھیج کر لندن بلا لیں مگر وہ کراچی کے اس محلے سے کہیں اور منتقل ہو گئے تھے۔ پھر امی نے بھی امجد چچا کو منع کر دیا کہ وہ ابو کو پریشان نہ کریں۔ حالات سازگار ہوں گے تو وہ خود رابطہ کر لیں گے۔

سال پہ سال گزرتے رہے۔ ہمارے حالات بھی کچھ حد تک سنبھل گئے۔ امی نے کچھ پیسے جمع کر کے ساؤتھ ہال میں ایک گھر لے لیا۔ گو کہ وہاں سے ان کا آفس بہت دور تھا مگر اپنا گھر تو تھا۔ اس دوران بھی مجھے ابو کا انتظار رہا مگر ابو نے مڑ کر خبر نہ لی۔

امی پر وقت سے پہلے بڑھاپا آگیا تھا۔ انھیں کھانسی بھی رہنے لگی تھی۔ ڈاکٹروں نے تشخیص کیا کہ انھیں ٹی بی ہے۔ علاج چلتا رہا۔ ڈاکٹر جو پرہیز بتاتے امی اس کا الٹ کرتیں شائد وہ خود کو سزا دے رہی تھیں۔ یا پھر انجانے میں ایسا ہو جاتا تھا۔ ابو کی یادوں کا بخشا ہوا یہ روگ بالآخر اس اسٹیج پر آگیا کہ ڈاکٹر بھی مایوس ہو گئے۔

لوگ کہتے ہیں وفا مشرق کی میراث ہے۔ یہ بات سراسر غلط ہے۔ وفا عورت کی سرشت میں داخل ہے خواہ عورت مشرق کی ہو یا مغرب کی۔ یہی وجہ تھی کہ امی نے ابو کی بے وفائی کے باوجود مجھے کبھی ان سے متنفر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہمیشہ کہتیں کہ تمہارے ابو کسی

پریشانی میں ہوں گے اسی لیے وہ آنہیں پا رہے ہیں مگر وہ ہم سب سے بہت محبت کرتے ہیں۔ان کی بات غلط ہے یا صحیح یہ جاننے کے لیے میں ایک بار ابو سے ملنا چاہتا تھا۔امی کو پاکستان چلنے کی ترغیب بھی دیتا تھا مگر ان کا ایک ہی جواب تھا کہ ''نہیں اگر میں وہاں گئی تو وہ اور پریشان ہو جائیں گے۔''

ایسے وقت میں مجھے ایک اور کمی بری طرح ستاتی تھی۔اکیلے پن کا درد بری طرح کچوکے لگاتا تھا۔دل درد سے بھر اٹھتا تھا۔اور میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ کاش میری ایک بہن بھی ہوتی۔اس کی شرارتیں، چہلیں اس گھر کے سونے پن کو دور کر دیتیں، امی ہمہ وقت تھکی تھکی سی نظر آتیں۔ایسے وقت میں اگر ایک بہن ہوتی تو امی کا ہاتھ ضرور بٹاتی۔

میں یہی کچھ سوچتا رہتا اور وقت گزرتا جا رہا تھا۔گزرتے وقت کے ساتھ امی کے چہرے پر مرجھاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ایسا لگتا کہ ان کو کسی روگ نے گھیر لیا ہے۔

روگ تو آخر روگ ہوتا ہے آہستہ آہستہ جڑ پکڑتا ہے اور پھر ایک دن اپنا بھیانک جبڑا کھول کر نگل لیتا ہے۔وہی ہوا بالآخر اس نے امی کو قبر تک پہنچا ہی دیا۔

امی کو مسلم کمیونٹی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ان کے انتقال کا سب نے اثر لیا۔امجد صدیقی چچا، شہلا چچی کے علاوہ بھی بہت سارے مسلم کمیونٹی والوں نے اثر لیا تھا۔امی پابندی سے نماز پڑھتی تھیں۔اسلامک کمیونٹی سنٹر جاتی تھیں اس لیے بہت سے مسلمان ان کی قربانی سے واقف تھے۔سب نے مجھ سے تعزیت کی تھی۔

تعزیت دکھ کم نہیں کرتا۔میں بھی اندر سے ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں۔کہاں جاؤں۔دن رات اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔

اس دن بھی میں کمرے میں لیٹا ایک کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا کہ چچا جان کمرے میں داخل ہوئے۔پہلے تو انہوں نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دیکھا پھر بولے۔''بیٹا تمہاری امی کے انتقال کو پورے تین ماہ ہو گئے ہیں مگر تم اب تک سوگ میں پڑے ہو۔ایسے کیسے چلے گا۔زندگی کو انجوائے کرو،غم کی دھوپ سے خوشیوں کے سائے میں آنے کی کوشش کرو۔''

''کیا کروں مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔''

''دیکھو بیٹا۔اب تم ہوشمند ہو۔اب تمہاری امی بھی نہیں رہیں۔اس لیے میرا مشورہ ہے کہ تم شادی کر لو۔''

''نہیں چچا جان! میں ابھی شادی نہیں کروں گا۔'' میں نے اردو بولنے کی کوشش کی۔میں اپنی تہذیب کو اب اور زیادہ اپنانا چاہتا تھا' اس لیے میری کوشش ہوتی تھی کہ میں خود کو اس طرح کا بنا لوں کہ لوگ مجھے دیکھتے ہی سمجھ جائیں کہ یہ مسلمان ہے۔اس کا تعلق پاکستان سے ہے۔ابو نہیں بلاتے ہیں تو نہ بلائیں مگر میں اپنی شناخت نہیں بھولوں گا۔'' میری اس جسارت پر وہ حیران رہ گئے اور گلوگیر لہجے میں کہنے لگے۔

''واؤد! میں نے تمہیں سگے بیٹوں کی طرح پالا ہے۔تمہاری ہر خوشی کو مقدم سمجھا ہے۔اگر تمہیں شادی نہیں کرنا ہے تو نرمی سے بات کرو! مجھے احساس مت دلاؤ کہ تمہاری پرورش میں کوئی کھوٹ ہے۔'' امجد صدیقی چچا کے لہجے میں چھپا درد آرے کی طرح میرے دل کو چیر گیا۔کچھ رک کر انہوں نے کہا'' آخر کیوں؟ اگر شادی نہیں کرو گے تو پھر کیسے یہ زندگی گزرے گی؟''

''نہیں چچا جان! آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔دراصل میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا ہوں۔'' اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی میں نے لہجے میں نرمی پیدا کر لی تھی۔

''کیوں؟ بغیر کسی شریکِ غم کے زندگی کیسے گزرے گی؟ میرا کیا ہے' کسی بھی وقت میری آنکھیں بند ہو سکتی ہیں۔ساٹھ سال کی عمر کم نہیں ہوتی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی میں تمہارے سر پر سہرا سجا دوں۔ایک مرد کے لیے سب سے ہمدرد اور مضبوط سہارا بیوی ہی کا ہوتا ہے۔''

''نہیں چچا جان!'' میں نے مسکرا کر ان کی بات کی تردید کرتے ہوئے کہا تھا۔

''سب سے ہمدرد و مضبوط سہارا بھائی بہنوں کا ہوتا ہے۔''

''یہ تمہاری کم عقلی ہے بیٹے؟ تم ابھی نادان ہو۔میری بھی دو بہنیں ہیں۔بچپن میں ہم ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔جدا ہونے کا تصور بھی محال تھا لیکن شادی ہونے کے بعد وہ دونوں ہی دور چلی گئیں۔اپنے شوہروں کے ساتھ۔ایک بہن کینیڈا میں ہے۔اس کا شوہر وہاں پروفیسر ہے' وہ خود بھی پروفیسر ہے۔دوسری امریکا میں بس گئی ہے دونوں اپنے اپنے شوہروں میں مگن ہیں۔ دونوں بہنوں کا یہ حال ہے کہ سال دو سال میں کبھی یاد آگیا تو کسی نے دو سطریں مجھے لکھ دیں۔وہ بھی جب انھیں کوئی کام پڑے تب۔امریکا والی بہن کا پرسوں خط آیا ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کو بھیج رہی ہے۔''

"کب؟ وہ کب آرہی ہیں؟" "میں انہیں اپنی بہن بنالوں گا' میرے دل میں بس ایک ارمان ہے' میری بھی ایک بہن ہو۔" میں نے بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

سرپٹ گھوڑے کی طرح دوڑتی میری زبان پر انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پہلے وہ یہاں نہیں آرہی ہیں' اپنے ددھیال' بریڈفورڈ میں رہیں گی' اور ان کے ددھیال والوں سے تو میری کبھی بنی نہیں۔ بہت ہی گھٹیا لوگ ہیں"۔

ان کے جواب سے مجھ پر اوس پڑ گئی اور خوشی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ بجھے ہوئے چہرے کے ساتھ میں بیزار ہو کر اٹھ گیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "میں تو سونے چلا"۔

اس دن کے بعد چچا نے پھر مجھ سے شادی کے بارے میں نہیں کہا......

وقت گزرتا چلا گیا۔ قد کاٹھ کی وجہ سے ہی مجھے جم جانے کا شوق چرایا اور میں نے کراٹے کی کلاس جوائن کر لی۔ بلیک بیلٹ بھی حاصل کر لیا۔ مگر دل کو سکون نہ ملا۔ اکیلے پن کا درد بے چین کیے رکھتا۔ اگر ابو کا پتا ہوتا تو میں انہی کے پاس چلا جاتا مگر وہ بھی مفقود الخبر تھے۔ کوئی رابطہ نہ تھا۔

میرے اکیلے پن کا سن کر نانا لارڈ ڈلفی نے بھی اپنے پاس بلانا چاہا مگر میں نے جانے سے انکار کر دیا۔ یوں بھی ان کی حویلی تو ویرانی کی مثال تھی۔ دو نوکروں کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ وہاں جا کر ذہن اور بھٹکتا۔ جب میری امی نے وہاں جانا پسند نہ کیا تو میں کیوں جاؤں؟ انہوں نے پہاڑ جیسی زندگی مفلسی میں گزار دی۔ آسائش کو ٹھکراتی رہیں پھر میں کیوں احسان لوں؟ پھر وہ لارڈ ہوں گے اپنے گھر کے۔ جب مسلمان نہ ہوئے تو پھر رشتہ داری کیسی؟

نانا بھی ضد کے پکے تھے متواتر کوشش کیے جا رہے تھے۔ کبھی ان کا نوکر آ جاتا تو کبھی ان کا وکیل۔ میں تو تنگ آ گیا تھا۔

وقت تھا کہ گزرتا ہی چلا جا رہا تھا۔ پھر ان کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے وصیت میں مجھے سب کچھ سونپ دیا تھا۔ اس دن میں اسی سلسلے میں وکیل کے پاس گیا تھا کہ دوست سے ملاقات ہو گئی اور اس نے مجھے ایک نئی فکر میں مبتلا کر دیا۔ اور میں نے اگلے ہی دن وکیل کے پاس پہنچ کر کاغذات جمع کروائے اور عدالت میں خود کو وارث ثابت کر کے قبضہ لے لیا اور گھر آ کر اس بارے میں غور کرنے لگا کہ میں نے آئندہ کیا کرنا ہے۔ کافی دیر تک سوچ کے ساگر میں ڈوبتا

ابھرتا رہا۔ پھر پتا نہیں رات کے کس پہر نیند یا دیوی مہربان ہو گئی اور میں بے خبر ہو گیا۔

میں گہری نیند میں تھا کہ یکا یک آنکھ کھل گئی۔ یہ نیند یوں ہی نہیں ٹوٹی تھی بلکہ ضرب شدید سے آنکھ کھلی تھی۔ ایسا لگا تھا جیسے کسی نے میرے چہرے پر گرز سے وار کیا ہو۔ دماغ تک جھنجنا اٹھا تھا، ابھی میں آنکھیں کھول کر وار کرنے والے کو دیکھتا کہ دوبارہ ضرب پڑی۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میں سنبھلنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ پھر سے وار ہوا۔ مجھے احساس ہو چکا تھا کہ مجھے بیڈ سے باندھ دیا گیا ہے یا پھر کچھ لوگوں نے جکڑ رکھا ہے اور مار رہے ہیں۔ یہ کون ہیں۔ کس لیے میرے گھر میں گھس آئے ہیں' یہ سب سوچنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ میں بس خود کو آزاد کرانے کی کوشش کیے جا رہا تھا کہ کسی نے حکم دیا "بہت ہو گیا۔ اتنا ہی آج کے لیے کافی ہے۔ اگر یہ اب بھی نہ سدھرا تو پھر دیکھا جائے گا"۔

پھر ایسا لگا جیسے میری گدی سے سورج طلوع ہوا ہو۔ رنگ برنگے شرارے سے آنکھوں کے آگے رقص کرنے لگے اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

صبح جب آنکھ کھلی تو جسم درد سے ٹوٹ رہا تھا۔ مجھے رات کا منظر یاد آنے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ ایسا کیوں ہوا؟ اس شہر دوستاں میں دشمنوں کی یورش کہاں سے ہو گئی؟ کون میرا دشمن در آیا ہے؟ کیوں مجھے نشانہ بنایا گیا؟ تبھی مجھے دوست کی بات یاد آ گئی کہ یہودی تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں؟ اگر یہ سچ ہے تو میری جان بھی خطرے میں ہے۔ اس کا ایک ہی علاج سمجھ میں آیا کہ میں شہر چھوڑ دوں۔ اس لیے کہ دوبارہ بھی حملہ ہو سکتا تھا اور یہ حملہ قاتلانہ ہی نہیں جان لیوا بھی ہو سکتا تھا۔ اس لیے میں نے نہایت خاموشی سے نہ صرف گھر چھوڑا بلکہ شہر بھی چھوڑ دیا اور قسمت آزمانے بریڈفورڈ چلا آیا۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے اشرف کو فون کر دیا تھا۔ اشرف میرے بچپن کا دوست تھا۔ مجھے پوری امید تھی کہ وہ اس پر آشوب وقت میں میری مدد کرے گا۔ اسی امید کی ڈور سے بندھا میں چلا آیا تھا۔

اس صنعتی شہر میں پہنچ کر مجھے احساس ہوا کہ جہاں چراغ جلتے ہیں وہاں اندھیرا بھی ہوتا ہے۔ میری زندگی میں جو اندھیرا پھیلا ہوا تھا اسے دور کرنے کے لیے مناسب نوکری کی ضرورت تھی۔ قابلیت میرے پاس تھی لیکن قابلیت کے مطابق نوکری نہیں تھی۔ میں نوکری کی تلاش میں ٹھوکریں کھا رہا تھا کہ امجد نے سہارا پیش کر دیا۔ وہ اشرف کی منگیتر کا بھائی تھا۔ اس نے مجھے ایک پرائیویٹ فرم میں نوکری دلا دی۔ اشرف کے احسانوں تلے تو میں پہلے ہی دبا ہوا

تھا' اب امجد کے احسان کا بوجھ بھی بڑھ گیا۔

جس دن مجھے جوائننگ لیٹر ملا اسی شام میں شکریہ ادا کرنے اس کے گھر پہنچ گیا۔ وہ گھر پر ہی تھا۔ مجھے ڈرائینگ روم میں بٹھا کر اس نے آواز دی۔ ''ثمینہ' دیکھو بھئی تمھارے مہمان آئے ہیں''۔

آواز کے ساتھ ہی ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔

بوائے کٹ بال اور دوپٹے سے محروم سر کو دیکھ کر میری نظریں جھک گئیں۔ میں جس شہر سے آیا تھا وہاں بھی مسلمانوں میں بے حجابی کی ایسی تصویر نظر نہیں آئی تھی اس لیے ناگواری کی تیز لہر دماغ میں دوڑ گئی۔

''مائی ناٹی اینڈ سوئٹ سسٹر ثمینہ۔'' اس نے مسکرا کر تعارف کرایا۔

میں سمجھ گیا کہ یہ اشرف کی منگیتر ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی سلام کے لیے میرے ہاتھ اٹھ گئے۔

''تم دونوں باتیں کرو' میں ذرا فریش ہو لوں''۔ پھر اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ڈونٹ مائنڈ میں ابھی حاضر ہوا۔'' یہ کہہ کر وہ دروازے کے دوسری جانب چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی ثمینہ نے بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تو آپ میرے دیور ہیں؟ آپ کے پاکستان میں یہی کہتے ہیں نا؟ سنا ہے آپ لارڈ ڈلفی کے نواسے ہو کر بھی خود کو پاکستانی کہتے ہیں''۔

اس کے اس جملے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے میرے بارے میں علم ہے کہ میں پاکستان سے بے انتہا محبت کرتا ہوں۔

اس کی بے حجابی پر' پاکستان کے بارے میں اس کے ریمارکس پر میں چونک گیا تھا۔ ایک عجیب سی کڑواہٹ کا احساس ہوا تھا لیکن میں نے ظاہر نہیں کیا اور لہجے میں مٹھاس پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے بھائی سمجھو''۔

''اچھا۔'' اس نے اس طرح جواب دیا جیسے کونین کی کڑوی گولی نگل رہی ہو۔

''ہاں مجھے ایک بہن کی ضرورت ہے۔ بچپن سے ایک ننھی منی گڑیا جیسی بہن کا خواب دیکھتا رہا ہوں' کیا تم اس کی تعبیر نہیں بنو گی؟''

''او گاڈ! آپ لوگ خواب بہت دیکھتے ہیں۔ ہمارے اسٹیٹس میں ایسا نہیں ہوتا' پھر بھی

میں آپ کی خواہش کو نہیں ٹھکراؤں گی یوں تو میرے تین بھائی ہیں' چوتھا آپ کو مان لیتی ہوں۔''

اس کے اندازِ گفتگو نے مجھے مایوس کیا تھا پھر بھی میں مطمئن ہو گیا۔ میں جانتا تھا جب لڑکی جوانی کی د ڈ پر قدم رکھتی ہے تو اس کے دل میں ارمان جاگتے ہیں کہ وہ نئے رشتوں سے پہچانی جائے۔ اسے بھابی' چچی' ممانی کے القاب سے نوازا جائے۔ وہ بھی میری جانب اسی امید سے بڑھی تھی' لیکن میں نے اسے مایوس کر دیا تھا۔ بچپن سے جن رشتوں کی ڈور سے وہ بندھی تھی' میں نے بھی اپنے آپ کو اسی شکل میں پیش کیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ مایوس نظر آئی تھی۔ مگر میں نے اسے بہن کے طور پر قبول کرا لیا تھا۔

یہی کشش مجھے ہر روز کھینچ کر اس کے گھر لے جانے لگی۔ وقت کے ساتھ اس کا برتاؤ بھی بدل گیا اور اس نے مجھے دل سے بھائی کا مقام دے دیا۔ میں جب بھی اس کے گھر جاتا وہ مجھے بھیا کہہ کر مخاطب کرتی۔ لیکن چاہتے ہوئے بھی میں اس کے اندر سے مغرب کی بے حجابی دور نہ کر سکا۔ پاکستان کے بارے میں اس کے خیالات تبدیل نہ کر سکا۔ پھر بھی مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں ستارے سے جگمگانے لگتے اور وہ کسی ننھی منی بچی کی طرح ضد کرنے لگتی۔ یہ سب مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ ضدیں کرتی رہتی اور میں مانتا رہتا۔

''بھائی جان' ہری اپ' پلیز آج ایک فنکشن میں جانا ہے۔''

''اوہ' آج دن بہت بور گزرا' چلیے لانگ ڈرائیو پر چلتے ہیں''۔

''میں کب سے راہ دیکھ رہی تھی' فٹافٹ تیار ہو جاؤ۔ شاپنگ کے لیے چلنا ہے۔''

اور میں اپنی تھکن بھول کر اس کے حکم پر دوڑ پڑتا۔

اس مقدس بندھن میں بندھ کر میں بھول گیا تھا کہ لوگ دل میں جھانک کر نہیں دیکھتے۔ رشتے کے تقدس کو نہیں مانتے۔ انھیں تو چرکے لگانے میں مزہ آتا ہے۔ چھوٹے ذہنوں کے لوگ باتیں بنانے لگے۔

اور تو اور اشرف بھی مجھ پر چڑھ دوڑا کہ میں اس کی منگیتر کو ورغلا رہا ہوں۔ میں نے لاکھ صفائی پیش کی لیکن اس نے ایک نہ سنی اور مجھے بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا۔

اپنا سامان لے کر میں ایک ہوٹل میں چلا آیا اور ایک ہفتے کی جدوجہد کے بعد دس پاؤنڈ ماہوار پر فلیٹ حاصل کر لیا۔ میرے سامنے والا فلیٹ بھی خالی تھا اس لیے وہ فلور سنسان ہی رہتا تھا۔

اس فلیٹ میں آئے ہوئے مجھے ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ سامنے والے فلیٹ میں نئے کرائے دار آ گئے۔

وہ بھی پاکستانی تھے۔ اس گھرانے میں لڑکیاں بھی تھیں۔ میں نے ایک ڈیڑھ گھنٹے ہی میں اپنے کمرے کی کھلی کھڑکی سے ان دونوں کے مزاج کا بھی مطالعہ کر ڈالا تھا۔

بڑی بہن جتنی سنجیدہ اور کم گو تھی، چھوٹی اتنی ہی شوخ اور باتونی تھی۔ جب سے وہ آئی تھی کام کم کر رہی تھی اور باتیں زیادہ، مسلسل بولے جا رہی تھی۔

اس کی تیز آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ شوخی بھری باتیں، میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ لا رہی تھیں۔ میں چائے کا کپ تھامے اس کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ آواز تھم گئی۔ میں اس کی باتوں میں اس طرح کھو گیا تھا کہ اس کی خاموشی گراں گزرنے لگی اور میں جھنجلا کر کچن میں چلا گیا، پیالی رکھ کر لوٹ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں چونک اٹھا۔ جب سے میں اس فلیٹ میں آیا تھا، پہلی بار دستک ہوئی تھی۔

میں نے پوچھا...... ''کون؟''

''ملک مین۔'' باہر سے آواز آئی۔ اسے بل ادا کرنا تھا اس لیے میں باہر آ گیا۔ بل اور دودھ کی بوتل لے کر میں نے اسے رقم دی اور واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

اب میرا ایک ہی کام تھا کہ میں اپارٹمنٹ میں آنے کے بعد ان لوگوں کی باتیں سننے کی کوشش میں لگ جاتا۔ اگر وہ لوگ کچن میں ہوتیں تو ان کی آوازیں صاف سنائی دیتیں۔ میں خوب لطف لیتا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا کہ ایک دن شام کے وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

''کون؟'' میں نے پوچھا۔

''دروازہ کھولیں......'' وہی پڑوس کی شوخ آواز سنائی دی۔

میں نے دروازہ کھول دیا۔ ادھیڑ عمر کی ایک عورت کے ساتھ وہ دونوں بہنیں تھی۔

مجھے سوالیہ نظروں سے گھورتے دیکھ کر اسی شوخ لڑکی نے کہا۔ ''ہم لوگ سامنے والے فلیٹ میں شفٹ ہوئے ہیں۔ آپ پاکستانی ہیں نا اسی لیے سوچا پڑوسیوں سے بھی مل لیا جائے۔''

''آیئے اندر آ جایئے۔'' میں نے انھیں راستہ دیتے ہوئے کہا۔

وہ تینوں اندر آ گئیں۔

''ذرا بھابی کو بلا دیجئے تا کہ تعارف ہو جائے۔'' شوخ لڑکی نے کہا۔

میں جواب میں مسکرایا اور پھر ان دونوں بہنوں کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ''تمھارا بھیا ابھی تک کنوارا ہے۔''

''امی وغیرہ تو ہوں گی؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، اس دنیا میں اکیلا ہوں، بالکل اکیلا۔'' میرے اس جملے پر دوسری لڑکی نے چونک کر مجھے دیکھا۔

اسے چونکتے دیکھ کر میں نے کہا۔ ''بچپن سے میں اکیلا ہوں۔

نو عمری سے میرے دل میں بس ایک خواہش رہی ہے کہ کاش میری بھی کوئی بہن ہوتی، ننھی منی گڑیا جیسی! اب لگتا ہے میری یہ تمنا پوری ہو جائے گی۔ اللہ نے دو دو بہنیں بھیج دی ہیں۔''

''شکریہ بھائی جان! خاموش طبع لڑکی نے پہلی بات گفتگو میں حصہ لیا۔ اس کی آواز میں عجیب قسم کا سوز تھا۔ لہجہ روہانسا تھا۔ شاید اسے آج تک کسی نے بہن نہیں کہا تھا نہ سمجھا تھا۔ وہ اس مقدس رشتے سے محروم رہی ہو گی یا پھر بھائی ہوتے ہوئے بھی اس کی محبت کو ترستی ہو گی۔ جبھی اس کی آنکھوں میں چاہتوں کے سورج چمک اٹھے تھے۔ کچھ توقف کے بعد اس نے پھر کہا۔ ''تو کیوں نہ ہم اپنے غم بانٹ لیں! میرا بھی کوئی بھائی نہیں ہے۔''

''تو یقین کرو میں تم دونوں کو سگے بھائی سے بھی زیادہ چاہت دوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے میری آواز بھی رندھ گئی۔

میرے لہجے کی یاسیت نے شاید ان کی امی کو بھی موم کر دیا تھا وہ بول اٹھیں۔ ''بیٹا! میں بھی تمھیں سگے بیٹے کی طرح چاہوں گی۔ تم چہرے سے کسی شریف اور مہذب خاندان کے لگتے ہو۔''

''امی!'' میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور میرے آنسو بہہ نکلے۔

''بیٹے، خدا کے ہر کام میں کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ سیک ٹاؤن کا اتنا عمدہ مکان چھوڑ کر ہم لوگوں کے یہاں آنے میں بھی کوئی نہ کوئی مصلحت ہی ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ اب

تم اکیلے نہیں ہو۔ نبیلہ کے ابو بھی تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔'' پھر انھوں نے شوخ لڑکی
کی طرف مڑ کر کہا۔ ''راحیلہ' جا کر اپنے ابو کو بلا لا''۔

اس کے جانے کے بعد میں نے نبیلہ سے کہا۔ ''میری گڑیا بہن! اب اس گھر پر تیرا
بھی حق ہے۔ وہ سامنے کچن ہے' جا فٹافٹ دو تین کپ چائے بنا لا تا کہ میں پہلی بار اپنی بہن
کے ہاتھوں کی چائے پی سکوں۔''

وہ کچن میں چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی راحیلہ ایک ادھیڑ مگر بارعب شخص کے ساتھ
اندر داخل ہوئی۔ انھوں نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے راحیلہ نے سب کچھ بتا دیا
ہے۔ بھئی میں تو بہت خوش ہوں کہ نبیلہ کی دیرینہ خواہش پوری ہوئی۔ وہ تو ہر ایک کو بھائی
بنانے پر تلی رہتی ہے اور اس چکر میں اپنے جیب خرچ کا سارا پیسہ جھونک دیتی ہے۔ لیکن آج
پہلی بار سنا کہ کسی نے اسے بہن بنانے کی پیشکش کی۔ وہ تو خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی ہوگی۔''

''آپ کا احسان ہے کہ آپ مجھے......''

''احسان کیسا بیٹے!'' انھوں نے میری بات کاٹ دی۔ میں کچھ اور بھی کہتا کہ نبیلہ
چائے کی ٹرے اٹھاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ سے چائے لیتے ہوئے
اس کے ابو نے کہا ''نبیلہ' تمھاری خواہش تو پوری ہوگئی۔ تمھیں ماشاءاللہ ایک جوان بھائی مل
گیا۔'' وہ مسکرا دی۔

چائے ختم کر کے انھوں نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی پھر میں انھیں رخصت
کرنے دروازے تک گیا۔

اس دن کے بعد سے میں ان لوگوں کے بہت قریب ہوگیا' بالکل گھر کے فرد کی
طرح! ناشتہ ان کے یہاں کرتا اور رات کا کھانا بھی وہیں کھاتا۔ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو تنخواہ
کی رقم لا کر امی کے ہاتھ میں دے دیتا اور وہ اس رقم میں سے بیشتر کسی نہ کسی بہانے مجھ پر خرچ
کر دیتیں' باقی میرے نام سے جمع کر دیتیں۔ میں چاہتے ہوئے بھی ان کی کسی بات سے انکار
نہیں کر سکتا تھا۔

خالص گھریلو ماحول ملا تو میری عادت اور میرے اطوار میں نمایاں تبدیلی آ گئی۔
پہلے میں رات کو دس بجے تک سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا تھا' ہفتے میں چار پانچ فلمیں بھی دیکھتا
تھا لیکن نبیلہ کی باز پرس کے خوف سے میں نے زیادہ دیر باہر رہنا چھوڑ دیا تھا۔ آفس سے سیدھا

گھر آ جاتا اور دونوں بہنوں کے ساتھ ہنسی مذاق میں وقت گزر جاتا۔

نبیلہ تو مجھ سے اتنی ٹوٹ کر محبت کرنے لگی تھی کہ اگر میری سگی بہن ہوتی تو شاید وہ
بھی نہ کرتی۔ اس بات میں ذرہ برابر بھی مبالغہ نہیں ہے کہ اگر میں اس کی جان مانگتا تو وہ
آنکھیں بند کر کے مجھ پر جان قربان کر دیتی۔ اس معصوم لڑکی کی دیوانگی نے مجھے بھی اپنا اسیر
کر لیا تھا۔ اس کی بے پناہ چاہت نے میرے ترسے ہوئے وجود کو قرار بخش دیا تھا۔ میں سمجھنے لگا
تھا کہ منزل مقصود یہی ہے۔ میں نے تو بس تھوڑی سی چاہت' تھوڑا سا پیار مانگا تھا' بہن کی
چاہت میں اپنی برسوں کی پیاس بجھانے کو دریائے محبت کے چند قطرے مانگے تھے اور مجھے
بساط سے بڑھ کر پیار مل گیا تھا۔

میں تو خوشی سے پاگل ہوا جا رہا تھا کہ پہلی ٹھوکر لگی قطرۂ امرت زہرِ ہلاہل میں بدل گیا
اور بپھرے ہوئے سیلاب کی مانند اپنی زد میں مجھے خس و خاشاک کی طرح بہالے گیا۔ نفرت کے
اس تیز دھارے کا راستہ مجھ سے نہ رک سکا۔ شاید اس میں بھی میری غلطی تھی۔ میں بھول گیا تھا
کہ ہر زاویہ' دل کی آنکھوں سے نہیں ناپا جاتا' دماغ کے پرکار سے بھی کام لیا جاتا ہے۔

میں ان دنوں راحیلہ کو امتحان کی تیاری کرا رہا تھا۔ اس دوران میں' میں نے محسوس
کیا کہ وہ کتابوں میں دلچسپی نہیں لے رہی۔ اس کی آنکھیں کچھ کہتی ہوئی نظر آتیں۔ ایک ایسا
پیغام تھا ان آنکھوں میں جسے سننے کی مجھ میں تاب نہیں تھی۔ اس کا پیغام غیر صوتی تھا۔ آواز تو
زبان کی دین ہے لیکن صرف زبان نہیں بولتی' انسان کی آنکھیں اور چہرے بھی بولتے ہیں۔ وہ
بھی غیر صوتی اشاروں میں مفہوم ادا کر رہی تھی۔ اور میں سمجھ کر بھی انجان بنا ہوا خون کے
گھونٹ پی رہا تھا۔

ایک روز تو اس نے حد کر دی۔ میں اسے گرائمر کے نکتے سمجھا رہا تھا کہ اس نے کہا۔

''داؤد بھائی! آپ نے کبھی محبت کی ہے؟''

''ہاں''۔ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''لیکن یہ بات پوچھنے کا کون سا وقت
ہے؟''

''کس سے؟'' اس نے میرے سرد لہجے کو نظر انداز کر کے کہا۔

''تم سے' نبیلہ سے' امی اور ابو سے!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''اونہہ!'' اس نے برا سا منہ بنایا۔ ''فارگاڈ سیک! میں کسی اور محبت کے بارے

میں پوچھ رہی ہوں۔ جیسی فلموں یا ٹی وی ڈراموں میں محبوب اور......''

''راحیلہ!'' میں نے ڈانٹا۔ ''تمھیں شرم نہیں آتی؟ میں تمھارا بڑا بھائی ہوں۔''

''منہ بولے بڑے بھائی!'' اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''اور سگے بھائی کے علاوہ کسی سے بھی......''

وہ کچھ اور کہتی کہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ کہیں غصے میں صبر کا پیمانہ چھلک نہ جائے' اسی ڈر سے میں فوراً باہر نکل گیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ مسلمان ہو کر بھی' پاکستانی ہوتے ہوئے بھی یہاں کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یہاں اگر پاکستانی اپنے معاشرے کی حفاظت نہ کریں تو ان کے بچے بھی لگام سے باہر ہو جائیں۔ جس طرح یہاں باپ کی عمر والے کو چھوٹی عمر کی بچیاں بوائے فرینڈ بنا کر باپ سے ملواتی ہیں اور باپ خوش ہوتا کہ یہ اس کا نجی معاملہ ہے۔ بارہ بارہ سال کی کنواری ماں گھر گھر میں نظر آتی ہے۔ مگر کچھ پاکستانیوں کی کوشش سے جو معاشرہ سنبھل رہا ہے۔ پاکستانی خود کو گندگی سے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں اس کی تعریف انگریز بھی کرنے لگے ہیں۔ اب یہ کچھ اور بات ہے کہ شیطان پھر بھی گھیرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ بھی شیطانی فکر پر توجہ دیتی ہے۔ اسے سنبھالنا ضروری تھا اسی لیے میں نے ڈانٹ دیا تھا۔

دو چار دن تو وہ سہمی رہی لیکن پھر اس پر فلمی محبت کا بھوت سوار ہو گیا۔ وہ کسی طرح مانتی ہی نہیں تھی۔

ایک دن پھر اس نے بکواس شروع کر دی اس نے لکھتے لکھتے قلم روک کر کہا۔

''داؤد بھائی!''

''کیا ہے؟''

''جانتے ہیں' میں آپ سے کتنا پیار کرتی ہوں؟'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں عجیب سے چمک تھی۔

''جتنا ہر بہن اپنے بھائی سے کرتی ہے' جتنا پیار مجھ سے نبیلہ کرتی ہے۔''

''داؤد بھائی!'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ''کیا واقعی آپ اتنے بدھو ہیں یا پھر میرے علاوہ کوئی اور آپ کے دل میں بسی ہوئی ہے۔ میرے دل کی ہر دھڑکن تو بس آپ ہی کا نام لیتی ہے۔''

میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا' ایسی واہیات بات کیسے سن لیتا؟ میرا داہنا ہاتھ زناٹے

سے گھوم گیا اور چٹاخ کی آواز دور تک پھیل گئی۔ ''بے شرم! میں تیری زبان کھینچ لوں گا۔ ابھی جا کر امی کو بتاتا ہوں۔'' میں بری طرح پھٹ پڑا۔ میری ڈانٹ اور مار کو نظر انداز کر کے اس نے اپنا گال سہلاتے ہوئے کہا۔ ''داؤد صاحب! آپ نے ابھی عورت کا ایک رخ دیکھا ہے' وہ اگر پھول ہے تو ناگن بھی ہے' لیجیے دوسرا رخ بھی دیکھ لیجیے......'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے کرتے کا گریبان پھاڑ لیا اور زور زور سے چیخنے لگی ''بچاؤ! بچاؤ!''

اس کی آواز کافی بلند تھی' میرے فلیٹ سے اس کے فلیٹ تک پہنچ گئی۔ اس کی چیخ سن کر اس کے امی ابو دوڑتے ہوئے آئے۔

انھیں دیکھتے ہی وہ اپنی امی سے لپٹ گئی اور سسکتے ہوئے کہنے لگی ''یہ......انسان کے روپ میں بھیڑیا ہے امی! ابھی یہ میری عزت لوٹنے کی کوشش کر رہا تھا!''

راحیلہ کے روپ میں میرے سامنے گویا ایک پھنکارتی ہوئی ناگن تھی جو اپنا پھن پھیلائے کھڑی تھی بلکہ اس نے اپنے زہریلے الزامات سے مجھے ڈس لیا تھا۔ میں گنگ ہو گیا تھا۔ غم و غصے نے میری زبان پر قفل لگا دیا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے چاروں طرف دھماکے ہو رہے ہوں اور کانوں میں صرف انہی دھماکوں کی گونج تھی۔ سماعت شکن دھماکے' جو میرے دماغ کی شریانوں کو بری طرح توڑ پھوڑ رہے تھے۔

انہی دھماکوں کے درمیان راحیلہ کے ابو کی آواز سنائی دی۔ انھوں نے امی سے کہا تھا۔ ''راحیلہ کو لے جاؤ''۔

امی اسے فوراً لے کر چلی گئیں۔ ان دونوں کے پیچھے پیچھے وہ بھی نکل گئے۔ شاید عزت کے خوف سے انھوں نے معاملے کو طول نہیں دیا تھا۔ پاکستانی کمیونٹی میں بات پھیل جاتی اسی لیے وہ خاموشی سے چلے گئے تھے۔

وہ لوگ تو چلے گئے لیکن میں نظر نہ آنے والی آگ میں جھلنے لگا۔ اندر ہی اندر بھڑکتی ہوئی آگ نے مجھے راکھ کر دیا۔

میں بالکل ٹوٹ چکا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک نے مجھے بھنور سے کھینچ لیا اور میں نے چونک کر گھڑی دیکھی۔ ریڈیم ڈائل کی گھڑی میں آٹھ بج رہے تھے۔ اندھیرے کی پھیلتی ہوئی چادر کا مجھے مطلق احساس نہیں ہوا تھا۔ اس سانحے کو چار گھنٹے گزر گئے تھے اور میں ایک ہی پہلو پر بیٹھا تھا۔ لائٹ تک نہیں جلائی تھی۔ ذہنی دھچکے نے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا

تھا۔ اسی وجہ سے دستک کی آواز بھی مجھے نقارے کی چوٹ محسوس ہوئی اور میں بری طرح چونک گیا۔

دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی تو میں کسی روبوٹ کی طرح دروازے کی جانب چل دیا' بولٹ گرا کر دروازہ کھولا تو سامنے راحیلہ کے ابو کھڑے نظر آئے۔

ان کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا۔ وہ بغیر مصافحہ کیے اندر آ گئے اور بلاتمہید کہنے لگے۔

''داؤد! میں ایک شریف آدمی ہوں اور شریف آدمی کی سب سے بڑی دولت اس کی عزت ہوتی عزت وحرمت کے علاوہ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ بخدا کسی شریف کی حرمت سے کھیلنے کی کوشش نہ کرنا۔ تم نے جو کیا' برا کیا۔ پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ میری عزت نیلام نہ ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ بات یہیں دب جائے۔ پاکستانی کمیونٹی میں پھیلی تو میرے گھر پاکستان تک پہنچ جائے گی۔ وہاں لوگ اس قسم کی باتوں کو برسوں یاد رکھتے ہیں۔ لوگ طعنہ دیں گے کہ ہم تو پہلے ہی کہتے تھے۔ وہاں مت جاؤ۔ بیٹی کی عزت گنوا دی نا۔ غلطی تم نے کی سزا میری معصوم بچی کو ملے گی۔ اسی لیے نبیلہ کی امی اور میں نے کافی غوروخوص کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ پندرہ بیس دن میں راحیلہ کی شادی تم سے کر دی جائے۔ اس دوران میں اگر تم کوئی تیاری کرنا چاہتے ہو تو کر لو۔'' یہ کہہ کر وہ واپس چلے گئے۔ مجھے بولنے کا موقع تک نہیں دیا۔

اس نئی صورت حال نے مجھے مزید پریشان کر دیا۔ جسے بہن کی طرح چاہتا تھا اسے بیوی کے روپ میں قبول کرنے پر میرا دل تیار نہیں تھا۔ ساری رات میں اسی الجھن میں گرفتار رہا۔

صبح کی اذان کے وقت مجھے ہلکی سی جھپکی آ گئی تھی کہ دروازہ پیٹنے کی آواز سے آنکھ کھل گئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے نبیلہ قہر کی دیوی بنی کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں سے نفرت و حقارت کے شعلے نکل رہے تھے۔ میرے سامنے تن کر کھڑے ہوتے ہوئے وہ بولی۔ ''ذلیل' کمینے' بے شرم! جسے بہن کہتا تھا اس کی آبرو پر ہاتھ ڈالتے ہوئے تجھے شرم نہیں آئی۔''

''میری پیاری بہن! پہلے حقیقت تو سن لو۔'' میں گڑگڑایا۔

''مت کہو مجھے بہن! تم...... تم اس قابل نہیں ہو کہ کوئی لڑکی تمھیں بھائی بنائے۔ ابھی اور اسی وقت اپنی منحوس صورت لے کر دفع ہو جاؤ' اور اگر تم نے راحیلہ سے شادی کی تو قسم خدا کی میں خودکشی کر لوں گی' ہم نے تمھیں سگا بھائی سمجھا تھا' دل کی گہرائی سے تمھیں بھائی کہا

تھا ذلیل! اس کا تم نے یہ بدلہ دیا!''

''میری بات تو سنو......'' میں نے پھر اسے سمجھانا چاہا۔

''میں کچھ سننا نہیں چاہتی اور نہ تجھے راحیلہ سے شادی کرنے دوں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ زندگی بھر تیری منحوس صورت میری نظروں کے سامنے رہے اور میں زندگی بھر کڑھتی رہوں' نہیں...... تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہاں سے دور چلا جا' کمینے! ہم لوگوں کی زندگی سے دور' بہت دور چلا جا۔''

میں اسے حقیقت بتانا چاہتا تھا لیکن وہ سننے پر تیار نہیں تھی۔ اس نے مجھے صفائی پیش کرنے کا موقع ہی نہیں دیا اور جس طرح آندھی طوفان بن کر آئی تھی اسی طرح چلی گئی۔ اس کے دہکتے ہوئے جملوں نے میرے اندر آگ بھڑکا دی تھی۔ جس طرح اسٹیم انجن میں آگ دہکتی ہے اور جب آگ پوری طرح شدت سے بھڑکتی ہے تو انجن متحرک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح نفرت کی آگ نے مجھے بھی متحرک کر دیا اور میں اتنی پریشانیوں سے حاصل کردہ نوکری' ارمانوں سے سجایا ہوا اپنا گھر اور وہ شہر' سب کچھ چھوڑ کر وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔

اب کہاں جاؤں یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بہت سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ واپس صدیقی چچا کے پاس چلا جاؤں۔ اور میں لندن واپس آ گیا۔

لندن پہنچتے ہی صدیقی چچا نے والہانہ استقبال کیا۔ چچی واری صدقے جا رہی تھیں۔

اس دن مجھے احساس ہوا کہ میں نے یہاں سے جا کر غلطی کی تھی۔ میرا اصل مرکز یہی ہے۔

کھانے کی میز پر صدیقی چچا نے کہا ''بیٹے تمہارے لیے خوش خبری ہے۔ یہ خوشخبری سنانے کے لیے میں نے کئی لوگوں سے رابطہ کیا تھا کہ تمہارا پتا مل جائے اور میں تمہیں وہ اہم بات بتا سکوں۔''

''کون سی خوشخبری؟'' میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

''خوشخبری یہ ہے کہ تمہارے ابو سے رابطہ ہو گیا۔ ان کا دو بار فون آ چکا ہے۔''

''ابو کا فون آیا تھا؟'' میں اس خبر کو سنتے ہی سارے مصائب بھول گیا۔

''ہاں اس نے کہا ہے کہ اگر تم چاہو تو پاکستان جا سکتے ہو۔'' یہ خبر میرے لیے امید جاں فزا تھی۔ میں تو دل وجان سے یہی چاہتا تھا۔

"اگر ابو نے بلایا ہے تو مجھے جانا ہی پڑے گا۔ آپ ویزے کے لیے اپلائی کر دیں۔"

"تم برٹش سٹیزن ہو تمہیں ویزے میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ میں آج ہی ارشد سے کہہ دیتا ہوں۔ وہ اس کام کا ماہر ہے۔"

واقعی ارشد اپنے کام کا ماہر تھا۔ اس نے ایک ہفتہ میں ویزا دلوا دیا۔ مگر اس سے پہلے میں نے کورٹ میں جا کر لارڈ ڈلفی کی جائداد اپنے نام منتقل کرالی۔ مگر اس کو دیکھنے کی پھر بھی ضرورت نہیں سمجھی اور پاکستان جانے کی تیاری کرنے لگا۔

صدیقی چچا اور شہلا چچی مجھے الوداع کہنے ایئر پورٹ تک آئے۔

میں نے ضد کر کے پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائن کا ٹکٹ لیا تھا۔ جہاز میں بیٹھتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے میں امی کی آغوش میں آ گیا ہوں۔ اس جہاز کے ساتھ پاکستان کا نام جڑا تھا۔ اس کی ہر چیز پر مجھے پیار آ رہا تھا۔ ائر ہوسٹس نے انگلش میں مجھ سے مشروب کے بارے میں پوچھا۔ میں نے مسکرا کر اردو میں جواب دیا کہ روایتی شربت لے آئیں۔

میری زبان سے اردو سن کر ائر ہوسٹس حیران رہ گئی کیوں کہ میری شکل امی پر گئی تھی۔ وہ مجھے انگریز سمجھ رہی تھی۔ میرے برابر میں جو خاتون بیٹھی تھیں وہ خاموش نہ رہ سکیں فوراً بولیں "واؤ... کین یو اسپیک اردو؟ مزہ آ گیا۔"

ان کی انگلش زدہ اردو سن کر مجھے تعجب نہیں ہوا کیوں کہ میں ساؤتھ ہال کے ایسے کئی خاندان کو جانتا تھا جو پاکستانی ہو کر بھی اردو بولنا کسر شان سمجھتے تھے۔ اتنا لمبا سفر تھا۔ وقت گزاری کے لیے باتیں کرنا ضروری تھا، اس لیے میں نے مسکراتے ہوئے جواباً کہا "میں نہ صرف اردو بول سکتا ہوں بلکہ عربی بھی پڑھ لیتا ہوں۔ قران پاک عربی میں ہے ناں!"

"آر یو اے مسلم؟"

"جی ہاں الحمدللہ میں مسلمان ہوں' میرا نام ڈیوڈ ہے۔۔۔ داؤد۔"

"نائس ٹو میٹ یو.... تمھارا نام ڈیوڈ ہے اور میں فے ٹی ما ہے۔" انھوں نے اردو پر دست درازی کرتے ہوئے منہ ٹیڑھا کر کے جواب دیا۔

میں اگر لندن کا پروردہ نہ ہوتا تو سمجھ نہ پاتا کہ اس کا نام فاطمہ ہے جسے وہ انگریزوں کی تقلید میں 'ایک مقدس ہستی کے نام کو بگاڑ رہی ہے۔ میرا حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔ میں نے صرف وقت گزاری کے لیے پوچھا۔ "کیا آپ پاکستان میں رہتی ہیں۔"

"نو رہتی تھی.... ناؤ آئی ایم برٹش... میرے ہسبنڈ بائی برتھ برٹش ہیں۔ پانچ سال پہلے شادی کیا۔ اب میں ساؤتھ ہال میں رہتی۔ اب صرف ملنے ملانے کو پاکستان آتی۔"

"پاکستان تو اسلام کا قلعہ ہے۔ آپ زیادہ وقت وہاں کیوں نہیں دیتیں۔"

"او نو پاکستان بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ ڈرٹی' ان سویلائزڈ' ان کلچرڈ لوگ' ٹوٹی سڑکیں' اسٹریٹ کرائم کیا نہیں ہوتا وہاں۔"

مجھے اس کی بات مطلق پسند نہ آئی مگر میں نے اسے ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا۔ تبھی میری نظر ائر ہوسٹس پر پڑی۔ میں نے اسے اشارے سے بلایا۔ "میم میرا نام ڈیوڈ ہے۔ میں پہلی بار پاکستان جا رہا ہوں۔ ائر پورٹ پر میرے والد ہوں گے' میں پھر بھی پاکستان کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں' کیا مجھے پاکستان پر کوئی کتاب' کوئی لٹریچر مل سکتا ہے۔"

"یس میرے پاس ٹورسٹ گائیڈ ہے۔ اگر کہیں تو وہ میں لا دوں؟"

"جی لے آئیں۔" ائر ہوسٹس چلی گئی۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھ لیا تھا کہ فاطمہ صاحبہ کے چہرے پر تمسخرانہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"بھئی تم کو پاکستان سے اسی لیے اتنی دلچسپی ہے کہ تم نے ابھی تک اس ملک کو دیکھا نہیں ہے۔ جب دیکھ لوگے تو ساری دلچسپی ہوا ہو جائے گی۔ وہاں ٹارگٹ کلنگ ہے۔ دہشت گردی ہے۔ بھتہ خوری ہے۔" اس بار وہ آدمیت کے جامہ میں آ گئی تھی اور اردو کو صحیح تلفظ کے ساتھ بولی تھی۔

میں انھیں کیسے سمجھاتا کہ جن کو نعمت نصیب ہو وہ نعمت کی قدر نہیں کرتے۔ یہ انسان کی فطرت ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج یہودی ٹھکرائی ہوئی قوم نہ کہلاتی اور گھر بیٹھے من وسلویٰ کھا رہی ہوتی۔

یہی حال فاطمہ کا ہے کہ اسے ہندوؤں کے تعصب کا شکار نہیں ہونا پڑا ہے۔ اسی لیے وہ سمجھ نہیں رہی کہ اسے کتنی بڑی نعمت ملی ہوئی ہے۔

ائر ہوسٹس کتابچہ لے آئی تھی اس لیے میں اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

ابھی میں کتاب دیکھ ہی رہا تھا کہ پچھلے حصے سے چیخ بلند ہوئی۔ ادھر بیٹھے ہوئے لوگ اٹھ اٹھ کر اگلے حصے کی طرف دوڑ رہے تھے۔ اس بھگدڑ نے عجیب افراتفری مچا دی تھی۔ شور شرابہ شروع ہو گیا تھا۔ میں بھی چونک کر ادھر دیکھنے لگا تھا۔ جدھر سے آوازیں آ رہی

تھیں۔ بھاگتے ہوئے ایک شخص کو میں نے روکنے کی کوشش کی تاکہ اس سے سوال کرسکوں۔ پوچھ سکوں کہ آخر ہوا کیا ہے۔ ایسی کون سی قیامت آگئی ہے۔ مگر اس نے رکنے کی بجائے مجھے دھکا دیا اور کاک پیٹ کی طرف بھاگتا چلا گیا۔ کئی ایئر ہوسٹس اور اسٹیورڈ بھی ادھر بھاگتے ہوئے گئے تھے مگر لوٹا کوئی نہیں تھا۔ سب وہیں جمگھٹا بنائے جمع تھے۔

وہاں ہو کیا رہا ہے۔ سب کر کیا رہے ہیں یہ جاننے کے لیے وہاں جانا ضروری تھا۔ اس لیے آگے بڑھا تھا کہ فاطمہ نے کہا۔ "ادھر نہ جائیں۔ کسی کو دورہ پڑا ہوگا۔ ہارٹ اٹیک ہوا ہوگا۔"

"معلوم تو کرلوں آخر ہوا کیا ہے۔"

"کیا تم ڈاکٹر ہو۔ بیٹھو اپنی جگہ..... کوئی ضرورت نہیں دوسروں کے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی۔" فاطمہ غصے میں مصنوعی بولی بھول کر صحیح انداز میں بولنے لگی تھی۔

میں نے اسے مسکرا کر دیکھا اور اس شخص کی طرف بڑھ گیا جو ادھر سے آرہا تھا۔ میں نے اسے روک کر پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

لب و لہجہ سے وہ جرمن لگا۔ اس نے کانپتی آواز میں کہا۔ "ہائی۔۔۔ جیکر" اور اگلی سیٹوں کی طرف بڑھ گیا۔

ہائی جیکر کا سن کر وہ لوگ جو آس پاس کی سیٹوں پر بیٹھے تھے اور پریشانی بھری نظروں سے مڑ مڑ کر پیچھے کی طرف جمع بھیڑ کو دیکھ رہے تھے ان کے چہرے کی رنگت اڑ گئی۔ فاطمہ بھی گھبرا کر رونے لگی اس نے کہا۔ "اب کیا ہوگا۔ ہم اغوا ہو رہے ہیں؟"

"میں ابھی پتا کر کے آتا ہوں۔" کہہ کر میں ادھر بڑھا۔

یہ جاننا ضروری تھا کہ اغوا کرنے والے کون ہیں۔ کتنے لوگ ہیں۔؟ ان کا مطالبہ کیا ہے۔

میں بھیڑ کو چیرتا ہوا' لوگوں کو ہٹاتا ہوا اس شخص کے پاس پہنچا جو کھڑکی سے پیٹھ ٹکائے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھی۔ اس کی ٹھوڑی پر چھوٹی سی داڑھی تھی۔ وہ دیکھنے سے ہی بنگالی لگ رہا تھا۔ وہ کیا کہہ رہا ہے وہاں کھڑے کسی شخص کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیوں کہ ایک تو اس کی اردو خراب تھی دوسرے سب ایک ساتھ بول رہے تھے۔ اس کی کوئی سن ہی نہیں رہا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ "او بھائی ہوا کیا ہے؟" مگر میری آواز شور میں دب گئی۔ تب میں نے چیخ کر انگلش میں کہا۔ "خاموش...... مجھے بات کرنے دو۔"

میرے چیخنے کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ سب خاموش ہوگئے۔ میں نے پوچھا۔ "کوئی ایک آدمی بتائے کہ ہوا کیا ہے؟"

"اس ہائی جیکر نے بیگ سے کچھ نکالا تھا کہ برابر میں بیٹھی خاتون نے دیکھ لیا۔ یہ پلین ہائی جیک کرنے والا تھا۔"

"پلین ہائی جیک کرنا چاہتا تھا؟......... کیا اس نے کوئی مطالبہ کیا تھا؟"

"نہیں یہ بم نکال رہا تھا کہ خاتون نے دیکھ لیا۔" اسی شخص نے بتایا۔

"تم نے بم دیکھا؟"

"نہیں اسی خاتون نے دیکھا تھا۔"

میں نے ایک اسٹیورڈ سے پوچھا۔ "وہ بم کہاں ہے؟"

"اس کے بیگ میں' جو وہ دے نہیں رہا۔"

"تمہیں کیسے پتا کہ بیگ میں بم ہے؟"

"خاتون نے بتایا۔"

"ٹھہرو میں معلوم کرتا ہوں کہ اس کا مطالبہ کیا ہے۔" کہہ کر میں اس خوف زدہ شخص کے اور قریب پہنچا اور بولا۔ "بھائی یہ بتاؤ کیا واقعی تمہارے پاس بم ہے؟"

"نہیں تو......"

"پھر یہ لوگ کیوں کہہ رہے ہیں کہ تمہارے پاس بم ہے۔؟"

"ہوم نائی زانتا...... ہوم سے اس عورت نے پوچھا کہاں زانا ہائے..... ہم کو بھوک لگا تھا۔ ہم اپنا بیگ سے پیٹھا نکالتے نکالتے بولا بومبائی۔۔۔۔۔ اب ہم اوہاں زائے گا.... ادھر نوکری ملا.... ہمارا شاب لندن سے اودھر میں بومبئی میں شفٹ ہوا۔"

"اچھا تم بوم بائی بولا وہ بم سمجھی۔"

"ہمارا سو موجھ میں کوش نہیں آتا وہ ہم کو پیٹھا کھانے بھی نا ہی دیا اور بوم بوم چیختا ہوا بھاگ گیا۔"

میری شکل انگریزوں جیسی تھی اسی لیے وہاں جمع ہوئے لوگ میری باتیں غور سے سن

رہے تھے۔انہیں حیرت بھی ہو رہی ہو گی کہ ایک انگریز اتنی صاف اردو کیسے بول رہا ہے۔ میں نے اس بنگالی بابو سے کہا۔''تم آرام سے پیٹھا کھاؤ اور یہ بیگ مجھے دے دو میں ان لوگوں کو سمجھا دوں کہ اس میں کوئی بم وغیرہ نہیں ہے۔''

''اچھا بولا.....ہم بیگ دیتا ہے پہلے پیٹھا تو نکال لوں۔''

جیسے ہی اس کا ہاتھ باہر آیا لوگ چیختے ہوئے پیچھے ہٹے۔ میں خود بھی ڈر گیا تھا۔وہ ایک گول سی کالی چیز تھی۔گرنیڈ کے برابر۔اس نے اس چیز کو داہنے ہاتھ سے نکالا تھا پھر اسے منہ تک لے گیا اور بائٹ لیا۔اس کا کچھ حصہ دانتوں سے کٹ کر منہ میں رہ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی کھانے کی چیز ہے۔ میں نے بیگ لے کر اس کی تلاشی لی اندر کچھ بھی نہیں تھا۔

''یہ کیا چیز ہے۔''میں نے اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پیٹھا کے بارے میں پوچھا۔

''پیٹھا.....بھوت پیٹھا۔''اس نے منہ چلاتے ہوئے کہا۔

میری ہنسی چھوٹ گئی۔ میں نے مڑ کر دور ہٹ گئے لوگوں سے کہا۔''بھائی بم وم کچھ نہیں ہے۔یہ فوڈ اسٹف ہے' کھانے کی چیز۔''

میرے کہتے ہی کئی لوگ آگے آ کر اس بھوت پیٹھا کو بغور دیکھنے لگے۔ میں نے ان سے مانگ کر وہ پیٹھا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔شاید آٹے کے پیڑے کو آگ پر پکایا گیا تھا کیوں کہ وہ باہر سے جلنے کی وجہ سے کالا ہو رہا تھا۔اندر دال جیسی کوئی چیز بھری ہوئی تھی۔

پیٹھا واپس دے کر میں اپنی سیٹ پر واپس آ گیا۔فاطمہ نے پوچھا۔''کیا واقعی اس کے پاس بم تھا۔''

میں نے اسے ساری کہانی سنا دی۔وہ بھی ہنسنے لگی۔''اس وقت مسلمان اگر چاقو بھی نکال لے تو لوگ اسے تلوار سمجھتے ہیں۔کچھ بے عقل مسلمانوں کی وجہ سے پوری دنیا میں مسلمان دہشت گرد کے طور پر مشہور کرا دیئے گئے ہیں۔''

مسلمانوں کو کوئی برا کہے یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ میں نے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے مطالعے میں خود کو غرق کر لیا۔

اس دوران فاطمہ نے کئی بار مجھ سے مخاطب ہونے کی کوشش کی مگر میں پاکستان کے بارے میں اپنی معلومات بڑھانے میں لگا رہا اس لیے اس جانب میں توجہ نہ دے سکا۔کافی دیر

بعد برابر سے گزرتی ہوئی ائر ہوسٹس کو روک کر میں نے کہا''میم میں ڈیوڈ ہوں پہلی بار پاکستان جا رہا ہوں۔ائرپورٹ پر میرے والد ہوں گے پھر بھی میں پاکستان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں' کیا اور بھی کتابیں مل جائیں گی۔''

ائر ہوسٹس نے مسکرا کر کہا۔''فی الحال تو بس یہی ایک کتابچہ ہے۔ائرپورٹ پر میں ٹورسٹ بوتھ سے آپ کے لیے ڈھیر ساری کتابیں لے دوں گی۔'

''اچھا۔''کہہ کر میری نظر مڑی تھی کہ میں چونک گیا۔سیدھے ہاتھ کی قطار میں کئی سیٹ کے بعد وہ شخص بیٹھا تھا جس پر مجھے شک ہوا تھا کہ مجھ پر اسی نے حملہ کرایا ہے۔وہی شخص جو مجھے وکیل کے دفتر میں ملا تھا۔جسے میں نے یہودی سمجھا تھا۔وہ سیٹ سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔اس کی نگاہوں کی چبھن نے ہی مجھے ادھر دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔میری توجہ ادھر تھی کہ فاطمہ نے ائر ہوسٹس کی بات پر کہا۔

''پاکستان کے بارے میں معلومات حاصل کر کے کیا کرو گے'بس یوں سمجھ لو کہ یہ وہ گرم توا ہے جس پر سب اپنی اپنی روٹیاں سینک رہے ہیں۔اپنے اپنے مفاد کے لیے ملک کو تباہ کر رہے ہیں۔اتنے سال ہوئے پاکستان کو آزاد ہوئے مگر ابھی تک سب اسی جگہ کھڑے ہیں جہاں برٹش امپائر چھوڑ گئے تھے۔کاش یہ لوگ نہ جاتے تو آج پاکستان بھی ترقی میں کم سے کم کنیڈا کا مقابلہ تو کر ہی رہا ہوتا۔''

اس کی یہ بات مجھ سے برداشت نہیں ہوئی اور میں نے کہا''مجھے علم نہیں کہ اس وقت پاکستان کی حالت کیا ہے مگر میں اتنا جانتا ہوں وہ میرے والد کا ملک ہے۔جب میرے والد اتنے شریف اور کھرے انسان ہیں تو وہ ملک بھی جنت نظیر ہو گا ورنہ میرے والد وہاں نہیں رہتے ایک اور ہجرت کر جاتے۔''

وہ بھی میرا نظریہ سمجھ گئی تھی اسی لیے خاموش رہی۔وقت گزرتا رہا۔ میں بھی آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔مگر ذہن میں وہی شخص چکراتا رہا کہ یہ اتفاق ہے کہ وہ اسی فلائٹ پر آ گیا یا پھر دانستہ اس نے یہ فلائٹ پکڑی ہے؟

کافی دیر بعد آنکھیں کھولی۔سامنے سے گزرتی ہوسٹس نظر آئی تو میں نے اشارے سے اسے بلایا۔وہ قریب آئی اور جھک گئی پھر دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولی۔''مسٹر ڈیوڈ، آپ پاکستان جا رہے ہیں اور یہ آپ کا پہلا سفر ہے۔ایئرپورٹ پر آپ کے ڈیڈ ریسیو کرنے

آئے ہوں گے۔ ہم ابھی پاکستان سے سوا گھنٹے کی دوری پر ہیں اور میرے پاس پاکستان سے متعلق کوئی کتاب نہیں ہے۔''

ایئر ہوسٹس کے انداز پر میں خجل ہو گیا اور سمجھ گیا کہ میرے بار بار کے سوال پر وہ اُکتا گئی ہے۔ مگر میں کیا کرتا کہ مجھ سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ اگر میرے پنکھ ہوتے تو میں اڑ کر پاکستان جا پہنچتا۔

''برا نہ مانیں' میں نے مذاق کیا تھا۔'' ائر ہوسٹس بولی۔

''دراصل مجھے اتنی خوشی ہے کہ میں خود کو سنبھالے نہیں سنبھال پا رہا ہوں۔ اسی لیے بار بار آپ کو تنگ کر رہا ہوں۔''

''کوئی بات نہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں نے بھی تو بدلہ لے لیا۔'' اور آگے بڑھتی چلی گئی۔

''دیکھا' یہ ہے پاکستان کی پہچان۔'' فاطمہ نے منہ بنا کر کہا۔

میں تلملا کر رہ گیا۔ سوچنے لگا کہ ماجد چچا کی ایک رشتے کی بہن بھی تو پاکستان سے برابر آتی رہتی ہیں' انھوں نے تو کبھی ایسا راگ نہیں الاپا۔ خبروں میں سنی کوئی بات' ڈاکا زنی یا قتل وغیرہ کی کوئی بات میں اٹھاتا تو وہ جواب دینے سے پہلے تاویل دیتیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اور ایک یہ محترمہ ہیں مسلسل پاکستان کے خلاف بولے جا رہی ہیں۔ اپنی مٹی کی برائی کیے جا رہی ہیں۔ میرے چہرے پر پھیلی کبیدگی کو انھوں نے محسوس کر لیا اسی لیے بولیں۔ ''شاید آپ کو میری باتیں بری لگ رہی ہیں' مگر کیا کروں کہ پاکستانی ہیں ہی ایسے۔''

''اور لندن کے لوگوں میں سرخاب کے پر لگے ہیں۔'' میں نے جل کر کہا۔ اور منہ پھیر کر کھڑکی سے باہر اڑتے بادلوں کو دیکھنے لگا۔

دماغ میں اب ایک نئی بات گونجنے لگی تھی کہ ابو کا رویہ کیسا ہوگا۔ نئی امی کا برتاؤ کیسا ہوگا۔ ایک ہی بہن ہے وہ کیسے پیش آئے گی؟ پاکستان سے دور رہتے ہوئے بھی میں یہاں کی ثقافت' معاشرت کو سمجھنے کے لیے ساؤتھ ہال سے پاکستانی رسالے خرید کر لایا کرتا تھا۔ اردو کے رسالے خاص طور سے لاتا تھا اور انھیں ہجے لگا لگا کر پڑھا کرتا تھا۔ روانی نہ سہی مگر پڑھ لیتا تھا۔ انھی رسالوں کی بدولت میں نے جانا تھا کہ وہاں کی اسٹیپ مدر' سوتیلی ماں ظلم کرتی ہے سوتیلے بچے کو پسند نہیں کرتی ہے۔ کیا مجھ سے بھی سوتیلا سلوک ہوگا؟ ایسی ہی کئی باتیں میرے

خدشے کو بڑھا رہی تھیں پھر وہ یہودی بھی کھٹک رہا تھا کہ اس نے اسی فلائٹ کو کیوں منتخب کیا؟ تبھی کاک پٹ کا دروازہ کھلا اور ائر ہوسٹس باہر آئی۔ وہ مسکراتی ہوئی میری ہی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی' ٹرے میں چاکلیٹ کے پیکٹ تھے۔ اس نے نزدیک آ کر کہا ''ڈیوڈ! آپ کی منزل بہت قریب ہے۔ آپ نے یہ چاکلیٹ ختم کیا اور ہم پاکستان کی فضائی حدود میں داخل ہوئے۔''

میں نے جلدی سے ایک بائٹ لیا تھا کہ وہ مسکرا کر بولی ''آرام آرام سے' ہم ہوائی سفر پر ہیں راکٹ میں نہیں۔ آہستہ آہستہ کھائیں۔''

میں نے مزہ لے لے کر کھانا شروع کر دیا

☆ ☆ ☆

امیگریشن میں مجھے ذرا بھی دیر نہ لگی اس لیے کہ میرا پاسپورٹ برطانوی تھا اور میں شکل سے انگریز لگتا تھا۔ انگریز اس ملک سے آدھی صدی قبل بھاگ چکے ہیں مگر یہاں والوں کی ذہنیت ابھی تک نہیں بدلی۔ غلامی کی ذہنیت ہنوز باقی ہے۔ اسی لیے انھوں نے سب سے پہلے میرا پاسپورٹ واپس کیا تھا۔ میرے ساتھ زیادہ سامان تو تھا نہیں اس لیے کسٹم میں بھی دیر نہ لگی اور فوراً ہی باہر نکل آیا۔ چین پٹی سے اپنا لگیج اٹھا کر گیٹ پر آ گیا۔

باہر آ کر میں متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تبھی انکوائری آفس کے سامنے کھڑے تین افراد کے گروپ پر میری نظر پڑی اور وہیں ٹھہر کر رہ گئی۔ ایک سرخ و سفید سوبر مگر عمر کے اعتبار سے درمیانی عمر کے شخص تھے۔ ان کے برابر میں پینتالیس چھیالس سال کی ایک عورت تھیں جن کے چہرے سے شفقت ٹپک رہی تھی۔ ان کے برابر میں ایک نوعمری لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیلے کارڈ تھا جس پر لکھا تھا۔ ''ڈیوڈ فرام یوکے''۔

میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے ہی تلاش کر رہے ہیں اور میں ان کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ تبھی فاطمہ بڑے کروفر سے میرے برابر سے گزری اور لمحہ بھر کو رک کر بولی ''اگر کبھی دل کرے تو میرے گھر کی طرف آ جانا۔ میں نے اس کارڈ پر اپنے ڈیڈ کا فون نمبر لکھ دیا ہے۔''

وہ کارڈ تھما کر آگے بڑھ گئی۔ میں نے ایک نظر کارڈ پر ڈالی۔ کارڈ یو کے کا تھا مگر جس قلم سے نمبر لکھا تھا جو یقیناً مقامی ہوگا۔ میں نے اسے ہپ پاکٹ میں رکھا اور پھر قدم تیز کر دیے۔ ان تینوں کے قریب پہنچ کر اردو میں بولا ''آپ یقیناً میرا انتظار کر رہے ہیں' میں ہی

ڈیوڈ ہوں۔"

سو بر شخصیت نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس وقت مجھے ایسا لگا جیسے میرا روم روم گنگنا اٹھا ہو۔ پورے جسم میں محبت کی تراوٹ سی اتر گئی۔ عورت نے آگے بڑھ کر میرے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھ دیا۔ تبھی اس معصوم صورت لڑکی نے کہا" اور مجھ سے کون ملے گا۔ میں آپ کی اکلوتی بہن ہوں۔"

میرے اندر جو خوف تھا۔ سوتیلے رشتوں کا خوف وہ پل بھر میں دور ہو گیا۔ اس لیے کہ مجھے پہچان نہیں تھی کہ یہ دنیا ہے' یہاں ہر شخص چہرے پر چہرہ سجائے رکھتا ہے۔ انسان گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیتا ہے۔ میں نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا" میں ... میں تو تمہیں دیکھ کر ہی خوشی سے نہال ہو گیا۔ میری گڑیا بہن! میں تو کب سے تمہیں مس کر رہا تھا۔"

میری بات نے سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔

ہم سب ائرپورٹ سے باہر آئے۔ باہر چھوٹی سی مگر پرانی کار کھڑی تھی۔ ہم سب اس میں بیٹھ گئے۔ کار آگے بڑھی تو میں حیرت و دلچسپی سے باہر دیکھنے لگا۔ مجھے کہیں کوئی اتنی زیادہ ٹوٹی پھوٹی سڑکیں نظر نہ آئیں اور نہ گندگی کا بہت زیادہ ڈھیر نظر آیا۔ بے قابو ٹریفک ضرور نظر آئی۔ میری بلبل جیسی چہکتی بہنا راستے بھر مجھے ڈکٹیشن دیتی رہی۔ مشہور عمارتوں' سڑکوں کے بارے میں بتاتی رہی۔

لندن میں لوگ اتنا نہیں بولتے۔ کم کم بولتے ہیں مگر مجھے یہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں اس کی باتوں میں خوب دلچسپی لے رہا تھا۔ ماں نے ایک دو بار جھڑکا بھی کہ اتنا نہ بولو بے چارہ تھکا ہوا ہے اس کے ذہن کو تم اور تھکا رہی ہو۔

"تو موم اسے بولنے دیجیے۔ میں کب سے ایسی آواز سننے کے لیے تڑپ رہا ہوں" میں نے کہا تو موم نے جواب دیا۔

"ایک تو اس کے ابو نے اس کا دماغ خراب کر رکھا ہے اب تو یہ اور بھی شیر ہو جائے گی۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ میں جس طرح اپنوں کی ناز برداری اٹھانے کے لیے ترستا رہا وہ دکھ اسے نہ پہنچے۔"

میری بات پر ابو نے گہری سانس لی۔ جیسے انہیں میرے دکھ کا احساس ہے۔

"یہ لو' بڑے میاں تو بڑے میاں' چھوٹے میاں سبحان اللہ اب تو اس بدمعاش کی چاندی ہو گئی اب تو یہ زمین پر پاؤں ہی نہیں رکھے گی۔" موم نے ہنس کر کہا۔

"موم میں آپ کو کیسے بتاؤں' ایک بہن کے لیے۔ اپنوں کے لیے میں کیسے تڑپتا رہا ہوں۔ جسے یہ نعمت حاصل ہے وہ اس کی قدر نہیں جانتا۔ اس کی قدر اس سے پوچھیے جو اس نعمت سے محروم ہے۔" میری آواز بھرا گئی تھی۔

موم نے میرے سر کو تھپکتے ہوئے کہا" اب وہ تمام محرومیاں دور ہو جائیں گی۔"

مجھے ایسا لگا جیسے میرے اندر ایک زم زم سا اترنے لگا ہے۔ میں نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور باہر دیکھنے لگا۔ سڑک پر ٹریفک کا زور تھا۔ ہارن کی آوازیں تھیں۔ انجن کی غراہٹ تھی اور اندر بلبل کی طرح چہکتی ہوئی میری بہن تھی۔ وہ بلا تکان بولے جا رہی تھی۔ تبھی ایک عجیب بات ہوئی۔ ابو کو بریک دبانا پڑ گیا۔ ان کی کار کے سامنے دو بائیک سوار آ گئے تھے۔ انہی نے کار روکنے کی ہدایت کی تھی۔ ابو نے کار روک دی تھی۔ اور کھڑکی سے سر باہر نکال کر بائیک والوں کی طرف دیکھ رہے تھے جو اپنی بائیک سے اتر کر کار کے قریب آ چکے تھے۔ انہیں دیکھ کر میں چونک گیا تھا۔ بات تھی ہی چونکنے والی۔ پُر رونق سڑک تھی۔ یعنی وقفہ وقفہ سے گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ان کو کسی کی پروا نہیں ہے۔ یا پھر یہاں قانون نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں پستول تھا۔ ان کا مقصد کیا ہے؟ میں ابھی اسی پر غور کر رہا تھا اور ان کے اگلے اقدام کا منتظر تھا کہ وہ میری کھڑکی پر آ گیا۔ ابو نے بغیر کچھ بولے اپنا پرس نکال کر اس کے سامنے کر دیا۔ اتنی دیر میں میں دروازے کا لاک کھول چکا تھا۔ اس نے پرس لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میں نے پوری قوت سے دروازے کو کھول دیا۔ دروازے کی ضرب سے وہ پیچھے ہٹا ہی تھا کہ میں پھرتی سے نیچے اترا اور لمحہ ضائع کیے بغیر اس پر کھڑی لات آزمائی۔ وہ اچھل کر اپنے ساتھی سے ٹکرایا جو بائیک اسٹارٹ کیے تیار تھا۔ دونوں ساتھ گرے اور ان کے ہاتھ سے پستول چھٹک کر دور جا گرا۔ میں نے انہیں سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا اور تابڑ توڑ گھونسے مارتا چلا گیا۔ میرے ہاتھ اور پیر دونوں ایک ساتھ چل رہے تھے۔ بلیک بیلٹ ہونے کا فائدہ آج نظر آیا تھا۔ ایک کے بعد ایک کئی بائیک والے آ کر رک گئے تھے اور تماشہ دیکھنے میں محو تھے۔ میری پھرتی دیکھ کر کوئی بھی قریب آنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ گرے ہوئے پستول کو دیکھ کر سب ہی اندازہ کر چکے تھے کہ کیا ہوا ہے۔ کئی ایک جوشیلے نوجوانوں نے

توہاتھ بٹانے کی بھی کوشش کی مگر میں نے مداخلت سے روک دیا۔ ابھی میں انہیں اور مارتا کہ ایک نوجوان نے کہا ”بھائی صاحب آپ کے ساتھ عورتیں ہیں آپ اب نکل لیں یہی بہتر ہے کیوں کہ اگر ان کے مائی باپ پولیس آگئی تو گلے میں آجائے گی۔ اس کی بات سنتے ہی ابو نے آواز دی۔ ”بس بیٹے بہت ہوگیا۔ اب آجاؤ۔“

ان کا حکم سنتے ہی میں کار میں آگیا۔ دونوں لہولہان پڑے کراہ رہے تھے مگر کوئی بھی ان کی مدد کو آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ ابو نے کار آگے بڑھالی۔

مجھے حیرت تھی کہ یہاں کی پولیس کیسی ہے کہ اتنی دیر تک میں پٹائی کرتا رہا اور وہ پہنچی نہیں۔ میں انہی خیالوں ڈوبا ہوا تھا۔ تبھی مجھے احساس ہوا کہ میری بلبل جیسی چہکنے والی بہنا کی بولتی بند ہوگئی ہے۔ میں نے مڑ کر اس کے چہرے پر نظر ڈالی پھر مما کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر بھی خوف تھا۔ وہ سب اس حادثہ کی وجہ سے ٹینس میں تھیں۔ میں نے کہا ”ارے تم کیوں خاموش ہوگئیں۔ غنڈوں بدمعاشوں کا تو میں ازلی دشمن ہوں۔“

”مگر یہ خطرناک بات ہے اگر خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو جاتا تو؟“

”تمہارا بھائی موم کا نہیں بنا ہے۔ بلیک بیلٹ ہے‘ بلیک بیلٹ۔“ میں نے ہنس کر اسے تسلی دی۔

”اس کے ہاتھ میں پستول تھا اگر وہ چلا دیتا تو کیا ہوتا؟“

”ایسے ہی چلا دیتا؟ میں اسے موقع ہی نہیں دیتا۔ اتنی ٹریننگ تو مجھے دی ہی گئی ہے کہ کیسے ہتھیار کا مقابلہ کیا جائے۔“

ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ کار رک گئی۔

”لو بھئی ہمارا گھر آگیا۔“ پہلی بار ابو کی زبان سے کوئی جملہ ہنس کر ادا ہوا۔

میں نے باہر کی سمت دیکھا۔ چھوٹا سا مگر نفیس سا گھر سامنے تھا۔ ہمارا لندن والا گھر اس سے بہت بڑا تھا مگر اس گھر میں اپنوں کا ساتھ تھا اس لیے مجھے بہت پیارا لگا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ یہاں میری ننھی منی بہن بھی تھی۔ اب تک میں بہن کے لیے ترستا رہا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی مجھے ایک بہن دے رکھی ہے۔ اتنی پیاری بہن۔ اپنی بہن کے ساتھ میں کار سے نکل کر باہر آیا اور آس پاس کے مناظر پر نظر ڈالی۔

یہ گلی نما آبادی تھی ایک قطار میں گھر بنے ہوئے تھے۔ قطار در قطار بنے گھروں کے

آگے ایک چھوٹا سا پارک تھا۔ اس طرف سے نظریں موڑ کر میں نے اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اندر بھی لندن کے مقابلے میں اس گھر کی سجاوٹ معمولی تھی۔ مجھے تھام کر فہمیدہ ایک کمرے کی طرف لے گئی اور بولی ”یہ کمرا میں نے آپ کے لیے اپنے ہاتھوں سے سجایا ہے۔“

”واہ بہت خوب یہ تو میری امید سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔“ میں نے کہا۔ اور اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگا دی۔

”ہنہ..... اب زیادہ نہ بنائیں۔ میں جانتی ہوں۔ آپ کا لندن میں گھر اس بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ ابو بتاتے ہیں کہ آپ کے نانا بہت امیر آدمی ہیں۔ ان کی بہت بڑی حویلی بھی ہے۔ کروڑوں کی ملکیت ہے۔“ فہمیدہ نے ہنس کر کہا۔

”میری امی بہت غیور تھیں۔ زندگی بھر نانا سے کوئی مدد نہیں لی اور نہ مجھے کبھی ان کے یہاں جانے دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ہمارے مذہب کے نہیں ہیں اس لیے ان کا پیسہ ہم پر حرام ہے۔ اگر وہ کلمہ پڑھ لیں تو ضرور ان سے جا کر ملو۔“ میں نے نظریں جھکا کر کہا جیسے ان کا جرم میرا اپنا ہے۔ جب کہ اصولاً مجھے امی پر فخر کرنا چاہیے تھا کہ انہوں نے اسلام کے لیے دکھ جھیلنا گوارا کرلیا مگر عیش کی طرف نہیں گئیں، اگر وہ چاہتیں تو بہ آسانی اپنے ڈیڈ کے پاس جا سکتی تھیں۔

”ابو بتا رہے ہیں کہ نانا نے اپنی وصیت میں اپنی پوری جائیداد آپ کے نام کر دی ہے۔“

”ہاں کیوں کہ ان کا اور کوئی ہے بھی تو نہیں۔ اگر وہ میرے نام نہیں کرتے تو سب حکومت لے لیتی۔ سمجھی میری ننھی بہن!“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”نانا نے کوئی احسان نہیں کیا۔ اپنی جائیداد بچائی ہے۔“

”بات ایک ہی ہوئی نا کہ آپ اب ارب پتی ہیں۔“ اس نے حسرت بھری آواز میں کہا۔

”میں نے اب تک اس حویلی کو جا کر دیکھا بھی نہیں ہے کیوں کہ امی نے جب اسے نہیں دیکھا تو میں اسے اپنے تصرف میں کیوں لوں؟“

”مگر اسے اپنے نام تو کرا لیا ہے۔“

”وہ بھی اس لیے کہ اس حویلی کے پیچھے کچھ یہودی پڑ گئے تھے۔ اگر میں اسے اپنے

نام نہیں کراتا تو وہ ہاتھ سے نکل جاتی۔''

ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ باہر سے موم کی آواز آئی۔ ''داؤد کھانا لگ گیا ہے آجاؤ۔''

میں فہمیدہ کے ساتھ باہر آگیا۔ چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل پر ابو اور موم بیٹھے تھے۔ میں اور فہمیدہ بھی جا کر بیٹھ گئے۔ کھانے سے فارغ ہو کر ابو نے دو چار باتیں کیں اور اپنے کمرے میں چلے گئے مگر فہمیدہ اور موم وہیں بیٹھی رہیں۔ ہم سب رات دیر گئے تک باتیں کرتے رہے۔ ایسا ہی ماحول میرے خوابوں کی تعبیر تھا۔ بھرا پڑا گھر اور شفقت بھرے لوگ۔ موم نے گھڑی میں دو بجنے کا الارم سن کہا۔ ''ارے بیٹا تم سوئے نہیں۔ کافی رات ہو گئی ہے۔ اب جا کر آرام کرو۔''

ان کی زبردستی پر میں سونے کے لیے چلا گیا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ موم ایک شفیق خاتون ہیں۔ سوتیلے پن کی جتنی کہانیاں سنی تھیں وہ سب ہوا ہو گئیں۔

☆ ☆ ☆

میں بے خبر سو رہا تھا کہ مجھے ایسا لگا کہ بارش شروع ہو گئی ہے۔

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

تب احساس ہوا کہ یہ فہمیدہ کی شرارت ہے۔

اس نے چلو میں پانی لے کر مجھ پر چھینٹا مارا تھا۔ انہی قطروں سے مجھے بارش کا مغالطہ ہوا تھا۔

مجھے اٹھتے دیکھ وہ بولی۔ ''اتنا دن چڑھ آیا آپ ابھی تک سو رہے ہیں۔ جائیے تیار ہو جائیے۔''

''خیریت.....اتنی غصے میں کیوں ہو؟'' میں نے چہرہ پونچھتے ہوئے پوچھا۔

''محترم بھائی جان آج ہم تحسین خالہ کے یہاں چل رہے ہیں۔ وہاں رضیہ خالہ جیسی شخصیت بھی ہو گی۔''

''بھئی رضیہ خالہ کا حدود اربعہ تو بتا دو تا کہ مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہ پڑے۔''

''امی کے رشتے کے ایک بھائی تھے جانی میاں۔ ان کا تو انتقال ہو چکا ہے۔ یہ انہی کی بیوہ ہیں۔ بڑے مزے کی عورت ہیں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ اس دور میں رہتے ہوئے

بھی سن سینتالیس میں جی رہی ہیں۔ باتیں سنیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔ انہیں منجھلی خالہ نے اپنے یہاں رکھ لیا ہے۔ ہم سب انہیں بھی خالہ کہتے ہیں۔''

''چلو میں بھی اس بہانے ان سے مل لوں گا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''پھر دیر نہ کیجئے' فٹافٹ تیار ہو جائیے۔ امی بھی تیار ہو رہی ہیں۔ ابو تو تیار ہو بھی چکے۔'' فہمیدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے ہنسی کے دورے پڑتے ہیں۔ بات بات پر وہ ہنستی تو ہنستی چلی جاتی۔

''ابھی لو'' کہہ کر میں اپنے واش روم میں کپڑے بدلنے کے لیے چلا گیا۔

جب سے یہاں آیا تھا تب سے ہر دوسرے دن کسی نہ کسی کے یہاں مجھے لے جایا جا رہا تھا، اس بہانے میری ملاقات سب سے ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ منفی ذہنیت والوں سے زیادہ واسطہ پڑ رہا تھا اور میرا نظریہ ڈانواں ڈول ہوتا جا رہا تھا۔ بچپن سے اس ملک کی جو تصویر میرے ذہن میں تھی وہ بدلتی جا رہی تھی۔ لیکن مجھے یہ نہیں خبر تھی کہ میں کن پریشانیوں کا شکار بننے جا رہا ہوں۔ یوں بھی میرا ایمان ہے کہ غیب کا علم صرف خدا کو ہے۔

میں کپڑے بدل کر آیا تو سب میرے ہی انتظار میں تیار کھڑے تھے۔ ابو نے آج شلوار قمیص پہنی تھی اور موم نے ساڑھی۔ یہ دونوں پہناوے لنڈن میں کم کم نظر آتے تھے اس لیے مجھے اچھا لگا تھا۔ جب سے میں یہاں آیا تھا میں بھی شلوار قمیص پہننے لگا تھا۔ مجھے ان کپڑوں میں دیکھ کر فہمیدہ کہتی کہ آپ بالکل یورپی نہیں لگتے۔

''اے میں سر توڑ دوں گا۔ مجھے یورپی کہہ کر گالی دیتی ہے؟'' میں مصنوعی غصے سے کہتا۔

ہم سب باہر آئے اور کار میں سوار ہو کر چل پڑے۔ راستے میں فہمیدہ نے بتایا ہم ڈیفنس جا رہے ہیں یہ یہاں کی پوش آبادی ہے۔

میں فہمیدہ کی باتوں کو بھی سن رہا تھا اور باہر کے مناظر کو بھی دیکھ رہا تھا۔ یہ ہمارے اپنے ہیں۔ اس لیے مجھے کچھ زیادہ ہی پیارے لگتے تھے۔ میں آتے جاتے لوگوں کو بغور دیکھتا ہوا اس کی باتوں میں دلچسپی لے رہا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد میں اس علاقے میں پہنچا تھا۔ وہاں پہنچ کر احساس ہوا کہ زندگی یہاں کی مصنوعی ہے۔ پہناوا وہ ہے جسے لنڈن میں بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اس لیے

کہ وہ پہناوا امریکا کے شہدوں کا ہے۔ وہاں کے کالے پہنتے ہیں۔ وہی کانوں میں بالیاں، وہی ہاتھوں میں رنگ برنگی بیلٹ، وہی کسی ہوئی جینز، وہی اتنگی شرٹ۔ بے حجاب لڑکیاں، کمر مٹکا کر چلتے لڑکے۔ وہاں کی صرف ایک چیز اچھی لگی وہ تھی سڑکیں..... کھلے کھلے، کشادہ بنگلوں والے اس علاقے میں جا کر مجھے اچھا لگا تھا۔ ایک بنگلے کے سامنے کار روک کر ابو اترے اور بیل بجائی۔ چوکی دار نے باہر جھانکا اور ابو کو دیکھ کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ ابو کار کو اندر لے گئے۔ پورچ میں روک کر انھوں نے سب سے کہا۔ "دیکھو آپا کا کوئی بھی مذاق نہیں اڑائے گا۔"

"جی اچھا، عنبر کے چٹکی لینے پر بھی میں کچھ نہیں بولوں گی۔" فہمیدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

ہم سب اندر پہنچے۔ ہال کو پار کر کے ایک کمرے میں داخل ہوئے تو وہاں کی شان ہی کچھ اور تھی۔ جیسا میں نے کتابوں میں پڑھا تھا بالکل ویسا ہی منظر تھا۔ کمرے میں ایک طرف بیڈ تھا۔ اس کی دوسری جانب ایک چھوٹی سی چوکی بچھی تھی جس پر جانماز رکھی ہوئی تھی۔ ایک طرف ایک چھوٹی سی میز تھی اس پر مٹی کا ایک مٹکا رکھا تھا جس پر لال کپڑا پھیلا تھا۔ بیڈ پر ایک ستر بہتر سالہ بڑی بی بیٹھی تھیں۔

ابو نے انھیں "آپا آداب" کہہ کر مخاطب کیا اور ان کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے ابو کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں کہ سلامت رہو۔ پھر میری طرف مڑ کر بولیں۔ "ارے یہ کون ہے؟"

"یہ میرا بیٹا ہے باجی، وہی جو لندن میں رہ رہا تھا۔" ابو نے کہا۔ اس وقت ان کے چہرے سے شفقت پھوٹی جا رہی تھی۔ وہ پیار بھری نظروں سے مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔

"ارے یہ اتنا بڑا ہو گیا...... آ میرے پاس آ، مجھے بھی تو پتا چلے تو ہمارے پاس آ چکا ہے۔" انھوں نے دونوں بانہیں پھیلا کر کہا۔ میں شفقت کے ساگر میں پور پور ڈوب جانے کے لیے ان کے سینے سے جا لگا۔ میں اسی محبت، خلوص کے لیے تو ترپتا رہا تھا۔ یہ خلوص، یہ پیار کی گرم جوشی یورپ میں کہاں ملنے والی۔ مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"بیٹا اب اپنے ابو کو چھوڑ کر کبھی نہیں جانا۔ تیرے لیے یہ کتنا روتا تھا۔ ہر وقت یہی کہتا تھا کہ پتا نہیں وہ وہاں کیسے رہ رہا ہوگا۔ میں کتنا کہتی ایک بار جا کر دیکھ آ، مگر یہ بھی ہٹ کا پکا جانے پر کسی طور راضی نہیں ہوتا۔ اب تو اسے مت چھوڑنا۔ واپس لندن مت جانا۔"

"نہیں خالہ اب میں یہیں رہوں گا۔"

"یہ تو بہت اچھا ہے کہ اب فرنگیوں کے دیس میں تو لوٹ کر نہیں جائے گا..... ہاں یہ بہت اچھی بات ہے۔ اپنا دیس اپنا ہوتا ہے۔ یہاں کم سے کم ایمان تو سلامت ہے۔ وہاں کا کیا بھروسا کب انسان کیا کھا لے۔ اور ایمان ختم ہو جائے۔"

"جی خالہ اب میں یہیں رہوں گا۔ اپنے ابو کے پاس۔" میں نے پیار بھری نظروں سے ابو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں اب کہیں مت جائیو.... اپنا ملک پھر اپنا ہوتا ہے۔" خالہ کے برابر بیٹھی لڑکی نے کہا۔

"تم چپ مت رہیو۔ پٹر پٹر بولنے کی عادت جو ہے۔" خالہ نے پیار سے اسے دو ہتڑ جماتے ہوئے کہا۔ "ارے بیٹا تم نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔ کیا نام ہے؟"

"جی میرا نام عنبر ہے۔" برابر بیٹھی لڑکی نے منہ دوسری طرف پھیر کر کہا اور مسکرانے لگی۔ میں بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ تعارف کا یہ انداز مجھے پسند آیا تھا کہ اس طرح مجھے اس نام معلوم ہو گیا۔

"اللہ کی مار، کلموہی تجھ سے کس نے پوچھا ہے۔" خالہ کو پھر غصہ آ گیا۔ "میں اپنے بچے سے پوچھ رہی تھی۔"

"یہ لو، میں کیا آپ کی بچہ نہیں ہوں، آپ ہی تو کہتی نہیں تھکتی ہیں، میرا بچہ میرا بچہ۔ میں نے خود کو آپ کا بچہ سمجھ کر ہی تو اپنا نام بتایا۔"

ابو بھی مسکرا رہے تھے۔ فہمیدہ اپنی ہنسی دباتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

"ہاں بیٹے، کیا نام ہے تمہارا؟" خالہ نے میرے سر کو سہلاتے ہوئے پوچھا۔

"جی داؤد.... ویسے لندن والے اپنی زبان میں ڈیوڈ پکارتے ہیں۔" میں نے اپنے دل میں امنڈ آئے غمناک احساس کو دباتے ہوئے کہا کیوں کہ ان کی شفقت نے مجھے امی کی یاد دلا دی تھی۔

"ارے بھائی صاحب آپ تو یہیں جم گئے۔" آواز پر میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک سو برسی خاتون کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ "یہ داؤد ہے ناں۔ کتنا پیارا بچہ ہے..... آؤ بیٹا میرے پاس آؤ۔ میں بھی تمہاری خالہ ہوں۔"

''جاؤ بیٹا۔'' ابو نے اشارہ کیا تو میں ان کے پاس چلا گیا۔

انہوں نے بھی میرے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی پھر ابو سے بولیں۔'' بھائی صاحب' آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔ اگر چاہیں تو ابھی میرے کمرے کی طرف آجایئے گا۔ میں وہاں باجی کے ساتھ باتیں کر رہی ہوں۔'' کہہ کر وہ واپس مڑ گئیں۔

مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ امی ان کے کمرے میں ہیں۔ میں بھی وہاں جانے پر غور کر رہا تھا کہ ابو نے کہا'' تم باجی سے باتیں کرو۔ یہ بور نہیں ہونے دیں گی۔ میں ذرا تحسین کے کمرے میں ہو آؤں۔''

ابو کے جانے کے بعد میں نے خالہ سے پوچھا'' آپ نے لندن دیکھا ہے؟''

''اللہ نہ کرے' میں کیوں جاؤں فرنگیوں کے دیس میں۔ اگر مجھے موقع ملا تو میں اپنے باپ دادا کی قبر پر جاؤں گی۔ وہاں جاؤں گی جہاں میرا بچپن گزرا۔ ہائے وہ بھی کیا دن تھے۔'' کہہ کر خالہ آنکھوں پر ہتھیلی پھیرنے لگیں۔

''بس.... گاڑی چل پڑی....'' برابر میں بیٹھی عنبر نے کہا۔

''اے میں تیرا سر پھوڑ دوں گی۔'' خالہ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اے خالہ کچھ تو اللہ کا خوف کرو' میں نے کیا کہہ دیا جو اتنا لال پیلی ہو رہی ہو۔'' عنبر نے ہاتھ نچا کر ایسے انداز میں کہا کہ مجھے بھی ہنسی آگئی۔

''داؤد بھائی آپ یقین کریں' اگر کوئی بھولے سے بھی ان کے بچپن کا پوچھ لے تو یہ داستان امیر حمزہ چھیڑ دیتی ہیں۔'' عنبر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اے ہئے تجھ پر خدا کی مار... ناس پٹی کیسے الزام پر الزام دھرے جا رہی ہے۔ ایسا میں نے کب کہا' کب داستان امیر حمزہ سنائی۔'' خالہ پھر دو ہتڑ مارتے ہوئے بولیں۔

''اے خالہ خدا سے ڈریں..... یہ میری پیٹھ ہے کوئی آپ کے وقت کا دھوبی گھاٹ نہیں جو دھڑا دھڑ مارے جا رہی ہیں۔''

''یہ لو میں نے کب مارا..... اے یہ تو پیار کی مار ہے۔ اس سے بھی کبھی چوٹ لگتی ہے۔'' خالہ نے ایک انگلی اپنی تھوڑی پر رکھ کر ایک انداز سے کہا۔

''آپ کی زبان میں دھمو کے..... ہاں دھمو کے.... اتنے دھمو کے جڑ چکی ہیں پھر

جب داستان امیر حمزہ سنائیں گی تو مزید کی امید واثق ہے۔''

''پھر وہی داستان امیر حمزہ..... ارے میں کب داستان سناتی ہوں؟''

''اگر نہیں سنائی ہے تو اب سنا دیں گی.... ابھی جو اپنے بچپن کا قصہ چھیڑیں گی وہ بھی کیا داستان امیر حمزہ سے کم ہوگا۔ اتنی دیر میں میں کلفٹن کے چار چکر لگا لوں گی۔''

میرے لیے ایسا ہنستا مسکراتا ماحول بالکل نیا تھا۔ لندن میں تو لوگ مشین بن کر زندگی گزارتے ہیں، خاص کر انگریز تو بس' ہنسنے پر بھی سوچتے ہیں کہ ہنسا جائے یا نہیں۔ گفتگو میں اتنی کنجوسی کریں گے جیسے باتیں کرنے پر بھی ٹیکس لگتا ہے۔ اس لیے بھی لطف آرہا تھا۔ جوائنٹ فیملی کا یہی تو فائدہ ہے۔ سب ایک دوسرے سے گھلے ملے ہوتے ہیں۔

''اے عنبر کی بچی میرے منہ مت لگیو' میں مار بیٹھوں گی۔'' خالہ نے ڈانٹ پلائی۔ ان دونوں کی جھڑپ سے میں ہی نہیں فہمیدہ بھی لطف لے رہی تھی جو ابھی کچھ دیر پہلے واپس آکر عنبر کے برابر میں بیٹھ گئی تھی۔

''اے خالہ میں آپ کے منہ کیوں لگوں گی۔ ایسا الزام تو نہ لگائیں کہ میں آپ کے منہ لگ رہی ہوں۔ ابھی فوراً کہیں گی یہ میرے گلے لگ رہی ہے۔''

''اے اے کیا بولی؟ ارے تیرے دیدے کا پانی مر گیا ہے کیا جو ایسا کہہ رہی ہے۔ اتنی بھی شرم نہیں کہ سامنے ایک لڑکا ہے اور گلے لگنے کی باتیں کیے جا رہی ہے۔''

''لڑکا؟ کہاں ہے لڑکا..... یہ تو فہمیدہ ہے یا پھر داؤد بھائی ہیں۔ یہ لڑکا کہاں سے آگیا۔ لگتا ہے آپ کے چشمے کا نمبر پھر بڑھ گیا ہے۔''

تبھی باہر سے بیل بجنے کی آواز آئی۔

''لگتا ہے رابیل بھائی آئے ہیں۔'' عنبر نے خیال ظاہر کیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک نوجوان اندر آیا۔ اسے دیکھتے ہی عنبر نے کہا'' میں نے کل آپ سے کیا کہا تھا؟ بھابی کو بھی لانا ہے۔''

''اس کے موڈ کا کب بھروسا ہے' پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ تیار ہو کر باہر نکلی کہ اس کی ایک سہیلی آگئی اور اس نے آنے سے انکار کر دیا۔'' رابیل نے جواب دیا۔

''داؤد بھائی میں نے ان کا تعارف تو کرایا ہی نہیں' یہ میرے فرسٹ کزن ہیں رابیل

اختر۔ ابو کے بڑے بھائی کے فرزند ارجمند۔ ایک مہان ہستی۔ بڑے پرلطف نوجوان ہیں بلکہ اب نوجوانی کو خیر باد کہنے والوں میں سے ہیں۔'' عنبر نے اپنے مخصوص انداز میں تعارف کرایا۔

میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

''داؤد صاحب میں آپ کا نام سن کر آیا ہوں۔ اتنی بار آپ کا تذکرہ سنا ہے کہ بتا نہیں سکتا۔ خالو جان کے حوالے سے جب بھی کوئی بات یہاں ہوتی تو اس میں آپ کا تذکرہ ضرور ہوتا۔'' رائیل نے کہا۔

''یہ خوش نصیبی ہے میری۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''داؤد بھائی' ان کی ایک اور خوبی ہے' یہ چرسی بھی ہیں۔ دبا کر چرس پیتے تھے۔'' عنبر نے ایک نیا انکشاف کیا۔ مجھے لگا اب وہ ابل پڑے گا۔ کچھ کھری کھری سنا دے گا۔ مگر وہ تو مسکراتا ہی رہا۔

''یہ جیل بھی آتے جاتے رہے ہیں۔'' یہ بات اس سے بھی کڑی تھی لیکن وہ اسی طرح مسکراتا رہا۔

اب مجھے اس کی ہنسی پر شبہ ہونے لگا کہ وہ مسکرا بھی رہا ہے یا صرف غصے کو دبانے کے لیے ہنسے جا رہا ہے؟

تبھی اس نے کہا ''شیطان کی خالہ ساری شکائتیں لگا دیں' اب کچھ مجھے بھی بولنے دو گی؟''

''آپ کو کون روک سکتا ہے' بولیں جتنا چاہیں بولیں۔'' عنبر بولی۔

''داؤد صاحب یہ سچ کہہ رہی ہے' ایک وقت تھا کہ میں پولیس آفیسر تھا۔ انتہائی سخت آفیسر پھر وہ وقت بھی آیا جب میں ڈرگس کا عادی بن گیا۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے جو کبھی پھر سناؤں گا۔'' رائیل بولا۔

''ضرور ضرور!'' میں نے جواب دیا۔

''داؤد بھائی میں نے ہوشیار کر دیا' بعد میں مجھے دوش نہیں دیجئے گا۔ یہ دل کے بہت اچھے ہیں مگر محکمہ پولیس میں بھی رہ چکے ہیں۔ اس لیے......'' عنبر کھل کر مذاق اڑا رہی تھی اور وہ ہنسے جا رہا تھا۔ اب مجھے شک ہونے لگا تھا کہ وہ دماغی طور پر کمزور ہے۔

''میں نے بہت بڑی غلطی کر دی' تیری بھابی کے بغیر مجھے آنا نہیں چاہیے تھا۔ ابھی اگر وہ ہوتی تو تیری زبان قینچی کی طرح نہیں چل رہی ہوتی۔''

''داؤد بھائی اب تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ انہوں نے بھی اقرار کر لیا ہے کہ ان کی بیگم صاحبہ کیسی جابر ہستی ہیں۔'' عنبر نے پھر چوٹ کی۔

''ابھی میں گھر جا کر یہ بات بتاتا ہوں پھر سوچ لو بچو وہ تمہارا کیا حشر کرے گی۔ مجھے تو بڑا مزہ آئے گا۔'' وہ تالی بجا کر بولا ''میں تو ایسے تالی بجاؤں گا۔''

''بس بس میں صرف آپ کی وجہ سے طرح دے دیتی ہوں ورنہ.....ورنہ مجھے تو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔''

رائیل جواب میں کچھ کہتا کہ تحسین خالہ کمرے میں آئیں۔ ''بیٹا داؤد' چلو کچھ کھا پی لو پھر آرام سے باتیں کرتے رہنا۔''

''ہاں ہاں داؤد بھائی جلدی چلیے' امی نے آپ کے اعزاز میں میری پسند کی تمام چیزیں بنائی ہیں۔ خاص الخاص پاکستانی ڈشز جو آپ کو لندن میں صرف خواب میں ہی مل سکتی ہیں۔'' عنبر نے خوشی سے چہکتی آواز میں کہا۔

وہ پیاری سی من موہنی صورت والی گڑیا جیسی لڑکی مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ تصنوع اس میں نام کو نہ تھی۔ جو دماغ میں آتا فوراً زبان سے پھینک مارتی خواہ سننے والے کو خجل ہونا کیوں نہ پڑے۔

میں جس ماحول سے آیا تھا۔ وہاں یہ سب تصنوع کے پردے میں جا چھپا ہے۔ اسی لیے اس کی خوشی کا ساتھ دینے کے لیے مجھے بھی اٹھنا پڑا۔ فہمیدہ کے ساتھ میں بھی کمرے سے باہر آیا اور چھوٹے سے گلیارے سے ہوتا ایک دوسرے کمرے میں پہنچا۔ اس کمرے کے آدھے حصے کو کچن کی شکل دے دی گئی تھی۔ آدھے حصہ میں ایک درمیانے سائز کی ڈائننگ ٹیبل بچھی ہوئی تھی۔ اس ٹیبل پر بہت ساری چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ امی ابو بھی منتظر بیٹھے تھے۔ ابو کے برابر میں ایک اور شخص براجمان تھے۔ ان کے سر پہ بال صرف جھالر کی شکل میں تھے۔ رنگت کھلتی ہوئی تھی۔ ٹھوڑی پر فرنچ کٹ داڑھی تھی۔ انھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا ''بس بھائی اب اور انتظار نہیں ہوتا۔ فوراً شروع ہو جاؤ تاکہ میں بھی کچھ چکھ لوں۔''

''یہ کیوں نہیں کہتے کہ داؤد کے طفیل آج بد پرہیزی کا موقع مل رہا ہے تو خوب

انجوائے کرلوں۔'' تحسین خالہ نے ہنس کر کہا۔

میں ان صاحب کے برابر میں جا بیٹھا۔ میرے برابر میں فہمیدہ تھی اور اس کے برابر میں عنبر۔ رابیل کی طرف دیکھ کر وہ صاحب بولے ''رابیل میاں یہ تم نے اچھا نہیں کیا' اکیلے اکیلے چلے آئے۔ بیوی کو کیوں نہیں لائے؟''

''بس وہ تو اپنے ذہن کی غلام ہے جو اس کے دل میں آتا ہے وہی کرتی ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' پھر انہوں نے پلیٹ میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''بھئی میں ایک اچھا شوہر ہوں اس لیے تمہاری تحسین خالہ کی ڈانٹ سر جھکا کر سن لیتا ہوں۔ عادی ہو گیا ہوں نا۔''

''خوب جھوٹ کا طومار باندھیے۔ نیا آیا ہے اس لیے آپ سے واقف نہیں ہے۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ ''یہ جو تمہارے خالو ہیں نا' ان کی باتوں میں کبھی مت آنا۔ اگر میری بات کا یقین نا ہو تو اپنی امی سے پوچھ لو۔''

''نہیں نہیں آپ لوگ اپنے جھگڑے میں مجھے مت گھسیٹیں۔'' امی نے گھبرا کر کہا تو سب کا ملا جلا قہقہہ گونج اٹھا۔

ابو بھی لطف لے رہے تھے اور دھیرے دھیرے مسکرا رہے تھے۔

''میاں داؤد! یقین کرو' یہ جو تمہاری خالہ ہیں نا اگر یہ جنگ عظیم دوم کے وقت ہوتیں تو ہٹلر بھی کانوں کو ہاتھ لگا کر ہتھیار پھینک دیتا۔ پرل ہاربر پر بمباری کی نوبت ہی نہیں آتی۔ ان کے جبر و تشدد کی وجہ سے ہی مجھ جیسا شریف آدمی ان کے گھر پیغام دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔'' خالو نے پھر چٹکی لی۔

''دیکھئے دیکھئے' آپ فاؤل کر رہے ہیں۔ کب تک بدلہ لیتے رہیں گے۔'' تحسین خالہ نے روہانسی آواز میں کہا تو میں بھی سنجیدہ ہو گیا مگر امی ابو کے چہروں پر مسکراہٹ دیکھ کر اطمنان ہوا کہ کوئی سنجیدہ بات نہیں ہے۔

''ارے بھائی خاندان کے سب لوگوں کو یہ کہانی معلوم ہے۔ داؤد بھی خاندان کا فرد ہے۔ ابھی آیا ہے اسے بھی معلوم ہونا چاہیے نا۔'' خالو نے مسکراتے ہوئے کہا تو عنبر بولی۔

''جی ابو ضرور بتائیں۔ ہر بار نیا مزہ آتا ہے۔''

''چپ رہ ابو کی چمچی۔'' خالہ نے ڈانٹا مگر خالو شروع ہو چکے تھے۔

''بھئی داؤد یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب میں بھی نوعمر ہوا کرتا تھا۔ اور سر پر بال بھی ہوتے تھے۔ اور ہم یہاں نہیں انڈیا میں پائے جاتے تھے۔ اسی انڈیا میں جو یہاں والوں کو بہت پیارا ہے جب تک کرکٹ میچ میں مدمقابل نہ ہو۔ اسی انڈیا میں کبھی ہم بھی رہا کرتے تھے اور تمہاری خالہ بھی۔ ان کے ابا مرحوم نے گھر میں آم کا پیڑ لگا رکھا تھا۔ اس پیڑ کی بدقسمتی کے اس میں آم بھی خوب آتے تھے۔ بازار کے آم میں وہ مزہ کہاں جو چوری کے آم میں ہے۔ بس جناب ایک دن ہم چپکے سے ان کے آنگن میں کودے اور پیڑ پر چڑھ گئے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ان کی نظر پڑ گئی اور انہوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ میں پیڑ سے کودا اور دیوار پر چڑھ ہی رہا تھا کہ انہوں نے سٹاسٹ دو بینت کمر پر جما دیئے۔ بس وہ چوٹ مجھے ایسی بھا گئی کہ میں نے زندگی بھر کے لیے انہیں اپنے گھر لانے کا فیصلہ کر لیا اور آج تک اس چوٹ کو یاد کر رہا ہوں۔''

میں بھی مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔ ایک میں ہی کیا سب کے چہرے پر شگفتگی نظر آئی تھی۔ اس لیے کہ آنے والے وقت سے سب بے خبر جو تھے۔

''ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق' وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔ میاں انہیں دیکھ دیکھ کر تو میں اس چوٹ کو یاد کر رہا ہوں۔''

''بس اور نہیں اب آپ بھی خاموشی سے کھائیں اور اسے بھی کھانے دیں۔'' موم نے مسکراتے ہوئے مداخلت کی۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم پھر سے بڑی خالہ کے کمرے میں آ گئے۔ ہمیں عنبر لے کر آئی تھی کہ داؤد بھائی وقت اچھا گزارنا ہے تو خالہ کے پاس چلیں اور ہم خالہ کے کمرے میں آ گئے تھے۔

''اے بیٹا تم پاکستان تو آ گئے اب یہ بتاؤ تم کرو گے کیا؟'' خالہ نے پوچھا۔

''ان کے نانا کے تین باغات ہیں اس میں یہ آم کی فصل لگائیں گے۔'' عنبر پٹ سے بولی۔ ''انہوں نے انگلینڈ کے ایک سائنسداں سے ایک فارمولہ خریدا ہے۔ ادھر آم کے بیج لگاؤ ادھر لہلہاتی فصل تیار۔ لوگ درنتی لے کر آم کی کٹائی کریں گے۔''

''اے ہئے آم کے باغ' اے ہٹو... یہاں کے آم... اللہ توبہ۔ آم تو ہمارے یہاں ہوتے تھے۔ کیا میٹھے... آہا...'' زبان چٹخا کر خالہ نے کہا۔ ''ایسے رسیلے کہ مت پوچھو... ایک

بار کھالو تو کئی روز تک زبان سے ذائقہ نہ جائے۔"

"جی ہاں جنت سے سیدھے اترتے تھے۔" عنبر نے نیچی آواز میں کہا۔

"کیا بولیں۔" خالہ نے چونک کر پوچھا۔

"بالکل جنت کے پھل کا مزہ ہوتا تھا۔" عنبر نے جلدی سے کہا۔

"ہاں بیٹا خوب کہا' بالکل جنت کے پھل جیسا ذائقہ ہوتا تھا۔"

"اچھا خالہ یہ تو بتایئے آپ وہاں سے کب آئیں؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔ کیوں کہ میں تو یہ جانتا تھا کہ سب سے پیارا وطن پاکستان ہے۔ اسی کی محبت میں لوگوں نے اپنے گھر بار کو چھوڑا' بے شمار قربانیاں دیں تب جا کر یہ ملک بنا ہے۔ اس پر تو مسلمانوں کی جان بھی قربان ہے۔ یہ کیسی ہیں جو ایک دوسرے ملک سے' اپنے دشمن ملک سے محبت کا اظہار کر رہی ہیں۔ لگتا ہے یہ ابھی نئی نئی وہاں سے آئی ہیں، مگر میری بات سن کر انھوں نے کہا:

"ہم آئے تو سینتالیس میں تھے۔ تمہارے خالو کا گھر میں کافی زور تھا۔ وہ زبردستی ہمیں لے آئے تھے۔ یہاں آئے تو نہ جائیداد تھی اور نہ نوکری' کھانے کے بھی لالے پڑ گئے تھے۔ تمہارے خالو کو نوکری ملی بھی تو بہت معمولی۔ چاہ کر بھی وہ جا نہیں پاتے تھے۔ صرف اس سرزمین کو خیالوں میں یاد کر لیتے تھے۔"

"کافروں کے ملک میں سے بھگائے گئے تھے اسی لیے یہاں آئے تھے۔" عنبر نے منہ بنا کر دھیرے سے کہا۔ بعد میں پتا چلا کہ اسے تو انڈیا سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اگر گھر میں کوئی وہاں کی فلم لگا لیتا تو یہ گھر کو سر پر اٹھا لیتی تھی۔ صرف خالہ کے آگے مجبور تھی۔ مجھے بھی اس کے خیالات پسند آئے تھے۔ وہ کہتی تھی۔ یہ لوگ فلم کے ذریعہ اپنا مذہب پھیلا رہے ہیں۔ ان کے ہر ڈرامے میں پوجا پاٹ ضرور ہوتا ہے۔ تاکہ کفر یہاں بھی پھیل جائے۔ صحیح کہا گیا ہے کہ فرعون کے گھر میں ہی موسیٰ کا جنم ہوتا ہے۔ یہ پوری پوری پاکستانی تھی۔

"دیکھ عنبر زیادہ بیچ میں مت بولیو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

"اچھا آپ سے بھی کوئی برا ہے؟ مجھے نہیں پتا۔ اللہ قسم نہیں پتا۔" عنبر نے معصومیت بھرے لہجے میں کہا۔

"دیکھ دیکھ میں مار بیٹھوں گی۔" خالہ نے دھپ جما کر کہا۔

"ہاں خالہ آپ کسی علاقے کا بتا رہی تھیں۔" فہمیدہ نے باتوں کا رخ بدلنے کے

لیے ان کی باتوں کا ٹوٹا ہوا جملہ دوبارہ سے جوڑ دیا۔

"ہاں بھئی علاقہ تو ہمارا تھا۔ کیا علاقہ تھا۔" خالہ نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔

"کراچی سے زیادہ خوبصورت تھا؟ اے چلیں بھی۔ بکواس۔"

"اے ہئے.. بکواس تو تُو کر رہی ہے.... یہ بھی کوئی علاقہ ہے' کیسے لوگ ہیں' کسی میں تمیز نہیں۔ نہ بڑے کا ادب نہ چھوٹے کا لحاظ۔ کیا کہوں کتنا دل جلتا ہے۔" خالہ نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"وہاں کے لوگ تو آسمان سے اترے ہوئے ہیں ناں۔" عنبر نے جل کر کہا۔

"چپ نحوست پیٹی' ہنہ آسمان سے اترے ہیں...ارے وہاں کے لوگ اخلاق کا مرقع ہوتے ہیں۔ ایک یہاں کے لوگ ہیں۔ آنکھوں کا پانی تک مر گیا ہے۔ ارے وہاں کے لوگ' محلے کا بھی کوئی بڑا دِکھ جائے تو ایسے ادب سے پیش آئیں گے جیسے اپنا کوئی بزرگ آ گیا ہو۔ مجھے اب بھی یاد ہے سیتا رام بنیا گھر آتا تھا تو باہر دیوڑھی پر بیٹھتا۔ لاکھ کہو کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ بزرگ ہو مگر کبھی نہ بیٹھتا۔ ہمیشہ کہتا' نہیں میں نے اس گھر کا نمک کھایا ہے۔ آج اگر کاروبار پھل پھول رہا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم نوابوں کی برابری کرنے لگیں۔"

"تب تو آپ کی دیوڑھی پر صبح سے ہی قطار لگ جاتی ہوگی۔ لوگ دست بستہ کھڑے رہتے ہوں گے۔" عنبر نے پھر چوٹ کی۔

"چپ کلموہی.... اک یہاں کے لوگ ہیں کہ دو پیسا ہوتے ہی سر پر چڑھ کر ناچنا شروع کر دیتے ہیں۔ ارے علاقے بھر کے لوگ۔ کیا ہندو کیا مسلم سب عزت کرتے تھے۔ جس پھل کا موسم ہو اس کے ڈھیر لگا دیتے تھے۔ آم.... آم کے کیا کہنے ایسا ذائقہ ...."

"خالہ آپ سے اتنی تعریف سن کر میرا بھی دل کرنے لگا ہے کہ میں بھی ایک نظر اس ملک کو دیکھ آؤں جہاں سے ہمارے والد نکالے گئے ہیں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

ان کی باتیں مجھے زہر لگ رہی تھیں مگر کیا کرتا کہ میں نے وہ ملک دیکھا نہیں تھا اس لیے بتا نہیں سکتا تھا کہ وہ صحیح کہہ رہی ہیں یا غلط۔ اسی وجہ سے بھی میرے دل میں اس ملک کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا تھا۔

باتیں ابھی اور چلتیں کہ امی نے آ کر کہا کہ اب شام بھی ڈھل رہی ہے چلو اب گھر چلتے ہیں۔

مجھے یہاں کا ماحول اچھا لگا تھا۔ دل لگ گیا تھا۔ مگر واپس تو آنا تھا۔ ہم سب واپس گھر آ گئے۔ گھر آ کر بھی مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں اب بھی وہیں ہوں۔ میری فطرت ایسی نہیں تھی اور نہ میں ایسی گری ہوئی ذہنیت کا تھا مگر یہ حقیقت تھی کہ وہ لڑکی مجھے اچھی لگی تھی۔ بہت بھولی بھولی اور معصوم مگر شوخی کا پیکر۔ ایسی لڑکیاں لندن میں کیا پورے انگلینڈ میں ڈھونڈے سے نہ ملیں۔ جو چیز عنقا ہو اس کی طلب زیادہ ہوتی ہے۔ ہر کمیاب شے ہی دل طلب کرتا ہے۔ اس کی معصومیت نے ہی مجھے اسیر کر لیا تھا مگر میری چاہت کا انداز وہ نہیں تھا جس میں کہیں بھی چھچھورپن کا شائبہ ہو۔ بس وہ مجھے اچھی لگی تھی۔ بالکل ویسے جیسے بہت سی کتابیں' بہت سی تاریخی عمارتیں یا اپنے وطن کی کوئی اہم چیز۔ بس وہ مجھے اچھی لگی تھی اور میں اس کے لیے اپنے دل میں جگہ پا رہا تھا۔

گھر آ کر بھی اس کا چہرہ نظروں سے محو نہ ہوا۔ میں لندن سے آیا تھا جہاں جذبات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی' مفاد ہی مد نظر رہتا ہے مگر میں خود کو اس کے خیالوں سے بچا نہیں پا رہا تھا۔ بالکل بے بس ہو چکا تھا۔ اس کے تصور سے خود کو آزاد نہیں کر سکا تھا۔ آنکھیں بند کرتا تو وہ چھم سے آ جاتی۔ جھلک دکھاتی' خیالوں میں لہراتی اور لہرا کر چلی جاتی۔ میں خیالوں میں اسے دلہن بناتا۔ دلہن بنا کر سامنے بٹھاتا' بڑے ارمانوں سے آہستہ آہستہ اس کا گھونگھٹ اٹھاتا۔ لیکن وہ گھونگھٹ کے پیچھے دکھائی نہیں دیتی۔ اس کا چہرہ اتنا روشن ہو جاتا کہ آنکھیں چندھیا جاتیں۔ میں جی بھر کر اسے دیکھ بھی نہ پاتا۔ دیکھنے کی حسرت دل میں رہ جاتی اور وہ غائب ہو جاتی۔

رات گئے تک یہی کھیل ہوتا رہا۔ بار بار نیند کے جھونکے آتے' سلانے کی کوشش کرتے اور وہ نیند اڑا کر چلی جاتی۔ بڑی مشکلوں سے نیند آئی تھی۔

صبح اُٹھا تو کسلمندی کی یلغار تھی۔ جسم ٹوٹ رہا تھا مگر ایک آس تھی۔ ایک اُمید تھی کہ میں اس سے پھر ایک بار مل سکتا ہوں' اور میں اس سے ملنے کو بے چین ہو گیا۔ میں اس کے یہاں جاؤں' ابھی اسی بات پر غور کر رہا تھا کہ فہمیدہ نے دروازے پر دستک دے کر کہا' ''اب اٹھ بھی جائیں۔ پاکستان میں لوگ صبح سویرے اٹھنے کے عادی ہیں۔ ابو آفس جانے کی تیاری کر چکے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ جب سے آیا ہے آج پہلی بار ناشتے کے ٹیبل پر نظر نہیں آ رہا۔ جا کر پتا کرو کہ طبعیت تو ٹھیک ہے۔ میں وہی دیکھنے آئی ہوں۔''

وہ عادت کے مطابق ریل گاڑی کی طرح چھک چھک بولتی چلی جا رہی تھی۔ میں اچھل کر بیڈ سے اترا اور بلند آواز میں بولا ''اے ہے یہ راشن پانی لے کر کیوں چڑھی آ رہی ہو، لو اٹھ گیا۔''

''اب فٹافٹ تیار ہو لیں۔ ابو انتظار کر رہے ہیں انہیں آفس بھی جانا ہے۔'' کہہ کر وہ مڑ گئی۔ آندھی کی طرح آئی تھی اور طوفان کی طرح چلی گئی۔ میں سیدھے باتھ روم میں گھس گیا اور برش کر کے سیدھا ڈائننگ ٹیبل پر پہنچ گیا۔

ابو منتظر بیٹھے تھے۔ ناشتہ سامنے دھرا تھا۔ میں نے السلام وعلیکم کہا اور ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

''بیٹے طبیعت تو ٹھیک ہے؟ آج اتنی دیر تک سوتے رہے؟'' موم نے سلائس پر مکھن لگاتے ہوئے پوچھا۔

''بس موم! رات کچھ زیادہ دیر تک جاگتا رہا، نیند نہ آنے کی وجہ سے اٹھنے میں دیر ہوئی۔ سوسوری موم!'' میں نے شرمندہ لہجے میں کہا۔

''بیٹے جلدی اٹھنا صحت کے لیے اچھا ہے۔ اس طرح فجر کی نماز بھی مل جاتی ہے۔ تم ظہر عصر مغرب عشا تو با جماعت پڑھتے ہو مگر فجر چھوڑ دیتے ہو' تاکید فجر کی زیادہ ہے۔'' ابو نے مشفق لہجے میں سمجھایا۔

''ابو ایک بات کہوں؟'' میں نے باتوں کا رخ بدلنے کے لیے کہا۔

''بولو!''

''اگر آپ اجازت دیں تو میں کار لے لوں' اس طرح آنے جانے میں بھی آسانی رہے گی۔''

''ایک کار تو گھر میں ہے' اگر تمہیں ضرورت ہے تو اس سے ہی کام چلا لیا کرو۔''

''ابو یہ بہت پرانی ہو چکی ہے۔ میں چاہ رہا تھا بالکل نئی لے لیں۔''

''مگر اس وقت میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں۔''

''آپ صرف اجازت دے دیں۔ میں موم اور فہمیدہ کو لے کر شوروم چلا جاتا ہوں۔ یہ جیسی پسند کریں گی میں لے لوں گا۔'' میں نے سر جھکا کر کہا۔

''ارے واہ! داؤد بھائی آپ زیرو میٹر کار لیں گے؟ مزہ آ جائے گا۔ کب لے

رہے ہیں۔" فہمیدہ نے چہکتی ہوئی آواز میں کہا۔

"جب میری من موہنی بہن کہے گی۔" میں نے ہنس کر جواب دیا۔

"بس آپ جلدی سے لے لیں۔ مجھے خود اس کھٹارا کار سے وحشت ہوتی ہے۔ میری سہیلیاں مذاق اڑاتی ہیں۔"

"میں ابھی وکیل کو فون کرتا ہوں وہ ایک لاکھ پاؤنڈ میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دے گا۔ بس ابو میرا اکاؤنٹ کھلوا دیں۔"

"تمہارے نام پر فی الحال اکاؤنٹ کھلنا مشکل ہے۔ خصوصی اجازت لینی پڑے گی۔ ایسا کرو میرے اکاؤنٹ کو یوز کر لو۔"

"ہاں یہ بھی صحیح ہے۔ آپ اپنا اکاؤنٹ نمبر دے دیجئے گا۔"

"اپنی موم سے مانگ لینا چیک بک انہی کے پاس ہوتی ہے۔" کہہ کر ابو دفتر چلے گئے۔

ان کے جاتے ہی میں نے فہمیدہ سے پوچھا "اب بتاؤ تمہیں کیسی کار اچھی لگتی ہے۔ میں تمہاری پسند پر ہی لوں گا جو تمہارے استعمال میں رہے گی۔"

"میری ایک سہیلی ہے۔ اس کے پاپا نے جاپان سے ایک نئے ماڈل کی کار منگوائی ہے۔ ٹویٹا اٹنگرا.... مجھے تو بہت پسند آئی ہے۔ اگر لے سکتے ہیں تو وہی لیجئے گا۔" اس نے بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا۔

"اچھا.... ایک کام کرو۔ اندر سے فون اٹھا لاؤ... میں لندن بات کر لوں۔"

وہ تیزی سے اندر گئی اور فون اٹھا لائی۔ اس دور میں آج کی طرح فوراً نمبر نہیں ملتے تھے۔ گھنٹوں کے بعد رابطہ ہوتا تھا۔ میں نے کوشش شروع کر دی۔ قسمت نے یاوری کی اور پہلی ہی کوشش کامیاب ٹھہری اور لائن مل گئی۔ فون اٹھایا تھا مسٹر جوین الفارڈ کی سیکریٹری نے۔ میں نے اپنا تعارف کرانے کے بعد کہا کہ مجھے وکیل صاحب سے بات کرنی ہے۔ فوراً بات کراؤ۔"

اس نے لائین ملا دی۔ دوسری طرف میرا وکیل تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "سر! مجھے ایک لاکھ پاؤنڈ کی ضرورت ہے۔ کیا لارڈ کے اکاؤنٹ میں ہے؟"

"جی ہاں ہے۔ کتنا نکلوانا ہے؟"

"مجھے آج ہی بھیج دیں۔ میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دیں۔ اس وقت میں

پاکستان میں ہوں۔ اکاؤنٹ نمبر بتا رہا ہوں اسی اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرنا ہے۔"

"ہو جائے گا مگر بینک کے ذریعہ بھیجا تو کئی دن لگ جائیں گے۔ میں منی چینجر کے ذریعہ بھیج دوں گا آپ وہاں کے بینک کا نمبر اور آئی ڈی کارڈ کا نمبر بتا دیں۔"

میں نے ماؤتھ پیس پر ہتھیلی رکھ کر موم سے کہا کہ وہ ابو کا شناختی کارڈ اور چیک بک لے آئیں۔ موم سے پہلے فہمیدہ دوڑ گئی اور لمحوں میں شناختی کارڈ اور چیک بک لے آئی۔ میں نے شناختی کارڈ کا نمبر اور ابو کا اکاؤنٹ نمبر اسے لکھا دیا۔ نمبر لکھنے کے بعد وکیل نے کہا "مسٹر ڈیوڈ! اگر بینک سے ٹرانسفر کروں گا تو کافی دیر ہو جائے گی۔ کم سے کم ایک ہفتہ، ایسا کرتا ہوں کہ کسی منی چینجر سے بات کرتا ہوں پھر میں آپ کو اسی نمبر پر خبر کر دوں گا۔"

فہمیدہ کے چہرے پر جوش تھا۔ وہ بہت زیادہ خوش نظر آ رہی تھی۔ اس نے کہا:

"داؤد بھائی اب میں کالج اسی کار میں جایا کروں گی۔ میری سہیلیاں دیکھ دیکھ کر جلا کریں گی۔"

"میری گڑیا! یہ کار میں تمہارے لیے ہی لے رہا ہوں۔ ابو کے پاس اپنی کار ہے، مجھے کبھی کبھی ہی ضرورت پڑے گی۔ اس کے لیے بھی میں تمہارا ہی محتاج رہوں گا۔ کیوں کہ مجھے ابھی تک یہاں کے علاقوں کی پہچان نہیں ہے۔ اگر یاد ہے تو صرف ایک ہی راستہ، یہاں سے ڈیفنس جانے والی سڑک۔" میں نے ہنس کر کہا۔

موم اندر چلی گئی تھیں۔ فہمیدہ کچھ قریب آ کر بولی "داؤد بھائی.... خیریت تو ہے؟ صرف ایک ہی راستہ کیوں یاد ہے؟..... کہیں وہ شیطان کی خالہ عنبر تو یاد نہیں رہ گئی۔" پھر بڑے زور کا اسنے قہقہہ لگایا تھا۔

میں نے اس کے سر پر چپت لگا کر کہا "میں تو اسے تمہاری خالہ زاد سمجھ رہا تھا اور تم کہہ رہی ہو کہ وہ خالہ ہے؟ رشتہ الٹا کیسے؟"

میری بات سن کر اس نے قہقہہ لگایا پھر بولی "ارے ارے آپ نے مجھے شیطان قرار دے دیا۔"

"اور کیا.. تم نے شیطانوں والی بات ہی کی ہے..... ویسے بڑے بھائی سے ایسی باتیں نہیں کرتے۔"

"یہ لو.... میں تو جلد سے جلد اس گھر میں بھابی لانے کا سوچ رہی ہوں اور آپ

رخنہ ڈال رہے ہیں۔ اگر وہ اچھی لگی تو میں اسے بھی بھابی بنا سکتی ہوں۔''

اس کی اس بات نے میرے اندر میٹھی سی چبھن پیدا کر دی تھی۔ بھلے ہی میں نے انگریزوں کے ماحول میں پرورش پائی ہے لیکن خدا کے فضل سے اپنے اندر کے مشرقی لڑکے کو مار نہیں سکا ہوں۔ امی نے جو تربیت دی ہے اس کے مطابق ہی زندگی گزار رہا ہوں۔ خود کو اسی ماحول کا فرد سمجھتا ہوں اور خود کو مشرقی ثابت کرنے کی کوشش بھی کرتا ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ عنبر مجھے اچھی لگی تھی۔ اب تک میں لڑکیوں سے دور بھاگتا رہا تھا جب کہ اب میرا بھی دل کرنے لگا تھا کہ میں بھی میٹھی میٹھی محبت میں پور پور ڈوب جاؤں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کار لینے کے بعد ایک بار اسے سیر کرانے ضرور لے جاؤں گا۔

''اچھا یہ بتائیں کب تک رقم آجائے گی؟ یعنی کب تک آپ کار لے لیں گے؟''

فہمیدہ کی بات پر میں نے مسکرا کر کہا ''ابھی کچھ ہی دیر پہلے تو اس نے کہا ہے کہ وہ جلدی کے لیے منی چینجر کے ذریعہ رقم بھیجے گا۔''

''یعنی اسی ہفتے میں رقم آجائے گی؟''

''اس ہفتے نہیں کل تک رقم پہنچ جائے گی۔''

''اچھا یہ تو بہت اچھی بات ہے یعنی پرسوں کار ہمارے دروازے پر ہوگی۔''

''بالکل...اب ایسا کرو کہ تیار ہو جاؤ ہم مارکیٹ چلیں گے تاکہ تم کار پسند کر لو۔''

''سچ...امی سن رہی ہیں۔ ہم کار پسند کرنے چل رہے ہیں۔ آپ چلیں گی؟'' اس نے آواز لگائی۔

اس کے جوش و خروش کو دیکھ کر میں خوشی سے نہال ہو رہا تھا۔ اس کی آواز پر موم بھی آ گئیں۔ میں نے ان کو بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ کچھ ہی دیر میں وہ دونوں تیار ہو کر آ گئیں۔ ان کے ساتھ میں بھی باہر نکل آیا۔ سڑک پر پہنچ کر میں نے پوچھا ''یہ کاریں ملتی کہاں ہیں؟''

''طارق روڈ۔'' فہمیدہ نے جواب دیا۔ میں نے ٹیکسی روک کر اس سے طارق روڈ جانے کا پوچھا۔ ابتدا میں حیرت ہوئی تھی کہ یہاں ٹیکسی ڈرائیور کی مرضی سے چلتی ہے۔ انگلینڈ میں پسنجر کی خواہش پر۔ خیر، وہ راضی ہو گیا تو ہم بیٹھ گئے۔ راستے میں موم نے پوچھا ''جا تو رہے ہو مگر رقم تو ابھی تک آئی نہیں ہے۔''

''کل تک آجائے گی۔ پھر ابھی تو پے کرنا نہیں ہے۔ جب ڈلیوری لیں گے تب

پوری پیمنٹ کریں گے۔ اس وقت تو صرف ٹوکن منی دینا ہے جو میں بہ آسانی دے سکتا ہوں۔''

''میں نے مسکرا کر بتایا ''ایک لاکھ کے تو ٹریولرز چیک پڑے ہیں۔ کچھ کیش بھی ہے۔''

''بس بس یہیں روک دو۔'' فہمیدہ بولی تو ڈرائیور نے ٹیکسی روک دی۔

ہم نیچے اترے۔ میں نے کرایہ دے کر فہمیدہ سے پوچھا ''شوروم کدھر ہے؟''

''یہ جو سامنے گاڑیاں کھڑی ہیں۔'' اس نے اشارے سے بتایا۔

مجھے حیرت ہو رہی تھی کیونکہ دکانیں بہت چھوٹی چھوٹی تھیں۔ مگر ان کے سامنے روڈ پر بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میں نے ایک کے بعد ایک کئی شوروم کو دیکھ لیا مگر اسنگرا کہیں دکھائی نہیں دی۔ مجھے مایوسی ہو رہی تھی۔ فہمیدہ کا بھی یہی کہنا تھا کہ کسی دوسرے ماڈل پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ موم کا بھی یہی خیال تھا کہ ایک دکان میں وائٹ کلر کی اسنگرا نظر آ گئی۔ فہمیدہ بھی اسی کلر کا کہہ رہی تھی۔ صرف دو دن قبل وہ پاکستان لائی گئی تھی۔ شوروم کے مالک نے کہا کہ وہ ایک دن میں کاغذات تیار کرا دے گا۔ میں نے معاملات طے کر کے ایڈوانس میں بیس ہزار روپے دے دیئے۔

اس وقت فہمیدہ کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ کھلی پڑ رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا ''یہاں شاپنگ کے لیے نزدیکی جگہ کون سی ہے؟''

''کچھ لیں گے کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''یہی سمجھ لو۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''برابر میں ہی شاپنگ ایریا ہے۔'' کہہ کر اس نے قدم آگے بڑھا دیئے۔

میں اس کے ساتھ گلیوں گلیوں ہوتا ہوا جس سڑک پر پہنچا وہ دکانوں سے بھری ہوئی تھی۔ یہاں کی دوکانیں مجھے بھی پسند آئیں۔ میں نے فہمیدہ سے کہا کہ وہ اپنی مرضی سے جتنا چاہے خریداری کر سکتی ہے۔

اسے تو گویا اجازت کی ضرورت تھی اس نے اتنی خریداری کر لی جیسے اسے پھر موقعہ نہیں ملے گا۔ ایک کے بعد ایک چیزیں پسند کرتی گئی اور میں بل دیتا گیا۔ جلد ہی وہ وقت آ گیا کہ شاپر تھامنے کے لیے ہاتھوں میں جگہ نہیں رہی مگر اس کی خواہش ختم نہ ہو کر دی۔ بالآخر موم کو مداخلت کرنا پڑی۔ وہ بول اٹھیں ''کیا آج کے بعد بازار نہیں آنا ہے جو اس طرح باؤلی ہو رہی ہو۔''

ماں کی جھڑکی پر وہ واپسی کے لیے راضی ہوئی۔ ہم سب لدے پھندے گھر پہنچے۔
گھر میں داخل ہوتے ہی موم نے کہا ’’اُف اس لڑکی نے تو آج حد ہی کر دی۔ اتنی خریداری۔‘‘

’’نہیں موم آج میں اتنا خوش ہوں کہ بتا نہیں سکتا۔ میری برسوں کی آرزو پوری ہوئی ہے۔‘‘ میں جلدی سے بولا۔

’’روپے لٹانے کی آرزو؟‘‘ فہمیدہ جو شاپرز چیک کر رہی تھی ہنستے ہوئے بولی۔

’’نہیں میری گڑیا‘ لندن میں جب کسی بھائی کو اپنی بہن کے ساتھ خریداری کرتے دیکھتا تھا تو میرا دل کچوٹ کر رہ جاتا تھا کہ کاش میری بھی بہن ہوتی۔ وہ خواہش آج پوری ہوئی ہے۔‘‘ میرے لہجے میں چھپے درد کو وہ بھی بھانپ گئیں اور خاموش ہو گئیں۔

فہمیدہ کو خوش دیکھ کر میں خوش تھا۔ حالانکہ جتنے کی اس نے خریداری کی تھی وہ بہت زیادہ تھی۔ اس زمانے میں بیس ہزار روپے کم نہیں تھے۔ اس نے اتنے کی خریداری کی تھی۔

شام میں جب ابو آئے تو وہ خوشی سے سرشار ایک ایک چیز انہیں دکھاتی جاتی اور قیمت بتاتی جاتی۔ ابو بھی مسکرا رہے تھے۔ میں نے اسے رطب اللسان دیکھ کر باتوں کا رخ موڑ دیا۔ ابو کو مخاطب کر کے کہا ’’ابو! کل آپ تیار رہیے گا۔ بینک جا کر رقم لانی ہے۔‘‘

’’مجھے دفتر میں فون کر دینا میں آدھے دن کی چھوٹی کر لوں گا۔‘‘ کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔

اگلے دن میں ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھا فہمیدہ اور موم سے باتیں کر رہا تھا۔ ابو ناشتے سے فارغ ہو کر جا چکے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ فہمیدہ نے ریسیور اٹھایا پھر میری طرف بڑھا کر بولی ’’آپ کا فون ہے۔‘‘

میں نے ریسیور لے کر پوچھا ’’جی فرمائیں۔‘‘

دوسری جانب سے بتایا گیا کہ میں منی چینجر سے بول رہا ہوں۔ آپ اپنا شناختی کارڈ لے کر دفتر آ جائیں۔‘‘

’’جی اچھا۔‘‘ کہہ کر میں نے لائین ڈسکنکٹ کی پھر ابو کو فون کیا کہ وہ تیار رہیں ہم ان کے آفس آ رہے ہیں۔

فہمیدہ تو گویا انتظار میں تھی اس نے شور مچا دیا کہ امی آپ بھی تیار ہو جائیں۔ ہم

سب مل کر ابو کے آفس چلیں گے۔

موم اور فہمیدہ کو لے کر میں باہر آیا اور ٹیکسی لے کر پہلے ابو کے آفس پہنچا وہاں سے ان کو ساتھ لے کر منی چینجر۔ ان لوگوں نے شناختی کارڈ چیک کرنے کے بعد کہا ’’اتنی بڑی رقم آپ لے کیسے جائیں گے؟‘‘

’’آپ ایسا کریں کے پانچ لاکھ تو نقد دے دیں باقی اس اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دیں۔‘‘ کہہ کر میں نے ابو کا اکاؤنٹ نمبر دوبارہ بتا دیا۔ اس نے لندن سے آئے فیکس نمبر میں درج اکاؤنٹ نمبر سے‘ نمبر ملایا اور پھر اس نے اپنے آدمی کو بھیج کر اسی وقت ڈرافٹ بنوا دیا۔

رقم لے کر ہم باہر آئے اور ابو کی کار میں سوار ہو کر طارق روڈ پہنچے۔ شوروم والا کاغذات وغیرہ تیار کرا کر انتظار کر رہا تھا۔ باقی کی پیمنٹ لے کر اس نے ضروری کاغذات اور چابی دے دی۔

اس بار میں نے ڈرائیونگ خود سنبھال لی۔ میرے برابر میں فہمیدہ آ گئی اور پیچھے موم بیٹھ گئیں۔ ابو اپنی کار میں جا بیٹھے۔ ہم سب وہاں سے کلفٹن پہنچے۔ کافی دیر وہاں کی سیر کی۔ پہلی بار کیمل کی سواری کی۔ گیلی ریت پر فہمیدہ کے ساتھ دوڑ لگائی۔ کافی سارا وقت گزارا پھر واپس گھر آ گئے۔ کھانا ہم نے باہر ہی کھایا تھا۔ وہ دن فہمیدہ کی خوشی کا دن تھا۔ گھر آ کر اس نے کم سے کم دس سہیلیوں کو فون کر کے بتایا کہ اس نے اٹھگرالی ہے۔

اگلے دن جب فہمیدہ کے کالج جانے کا وقت ہوا تو اس نے کہا ’’بس اب اٹھ جائیے‘ مجھے کالج پہنچانا آپ کا کام ہے۔

اسے ساتھ لے کر جب میں نکل رہا تھا تو موم سے کہا ’’موم آپ فکر نہیں کریں گی۔ مجھے کچھ کام ہے۔ اس شیطان کی خالہ کو کالج چھوڑنے کے بعد میں ایک دو جگہ جاؤں گا۔ واپسی میں تین چار بجے اسے کالج سے لیتا ہوا آؤں گا۔

فہمیدہ کو کالج چھوڑنے کے میں نے سوچا کہ فاطمہ کی طرف جاؤں‘ اس کا کارڈ اب تک جیب میں پڑا تھا مگر ارادہ بدل دیا اور کار کا رخ ڈیفنس کی طرف موڑ دیا۔

جس وقت میں خالہ کے گیٹ پر پہنچا اتفاق کی بات ہے کہ عنبر گھر سے باہر آ رہی تھی۔ میں نے اس کے نزدیک جا کر کار روک دی۔ اس نے چونک کر دیکھا اور مجھے دیکھ کر اس نے ہنستے ہوئے کہا ’’یہ آج راستہ کیسے بھول پڑے۔‘‘

وہ حسین تھی۔ مہ جبین تھی۔ اس کی ہر ادا میں ایک وقار تھا۔ میں نے لندن کی سڑکوں

پر، ہوٹلوں میں، ریستورانوں میں، محفلوں میں، پارٹیز میں، لڑکیوں کو نیم برہنہ ہی دیکھا۔ ایسے
نظاروں کا عادی تھا مگر یہ گوہر نایاب جو سیپ میں بند ہوتے ہوئے بھی آنکھوں کو خیرہ کر رہی
تھی۔ سرتاپا ڈھکی ہوئی تھی۔ صرف ہاتھ اور چہرہ کھلا ہوا تھا۔ لوگ کہتے ہیں، انگلی پکڑو تو پہنچی تک
پہنچ جاتے ہیں۔ اسکارف سے ڈھکے ہوئے سر اور بڑے سے دوپٹے میں چھپا جسم میرے دل
میں ہلچل مچا رہا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا ”بس ادھر سے گزر رہا تھا کہ تم نظر آ گئیں۔ کہاں کا
ارادہ ہے؟“

”ایک دوست کے یہاں جانا ہے، گزری تک۔“ اس کی نظریں اٹھیں، میری
نظروں سے ٹکرائیں اور جھک گئیں۔ ان شرگیں آنکھوں میں میرے لیے ناپسندگی نہیں تھی۔
اس لیے میں نے اپنا رخ ادھر سے موڑا نہیں۔ اپنایت سے بولا ”اگر کہو تو چھوڑ دوں۔“

”مجھے تو اعتراض نہیں ہے مگر دروازے تک آ کر گھر میں نہ جانا کیا اچھی بات ہو
گی؟“

”پھر کسی دن آج یوں بھی کچھ کام ہے۔“ میں نے بہانا بنایا اور اس کے لیے
دروازہ کھول دیا۔

وہ پسنجر سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ مجھے کھلے ہوئے پھول کی طرح لگی تھی۔ اور میں بھونرا بن
جانے کو بے تاب ہوا اٹھا تھا۔ اسے ہمیشہ کے لیے اپنا بنا لینے کو دل کہنے لگا تھا۔ اسی وقت میں
نے سوچ لیا کہ ابو سے کہوں گا۔ یقیناً انہیں بھی میرا خیال پسند آئے گا۔ اس طرح میرا رشتہ
پاکستان سے مزید مضبوط ہو جائے گا۔ بلکہ پختہ ہو جائے گا۔ ابھی میں اسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا
کہ وہ بولی ”کار کس کی لے آئے؟“

”آج ہی لی ہے، ابو کی کار لینا مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ انہیں بھی تو ضرورت پڑتی
رہتی ہے اس لیے یہ خرید لی۔ جب تک پاکستان میں رہوں گا استعمال کروں گا پھر یہ فہمیدہ کے
کام آئے گی۔“ میں نے کہا۔ وہ عنبر جو اس دن پٹر پٹر بول رہی تھی وہ نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔
اسے چپ چپ دیکھ کر مجھے اچھا بھی لگ رہا تھا اور کھل بھی رہا تھا کہ میں اسے اسی روپ میں
دیکھنا چاہتا تھا بولتی ہوئی مینا کی طرح۔ اس لیے میں بول اٹھا ”اس طرح خاموش رہو گی
تو.......“

”تو کیا میں یہاں بھی خالہ کو کھینچ لاؤں، وہ سامنے رہتی ہیں تو انہیں چھیڑنے کو دل

آپ ہی آپ کرتا ہے۔“ کہہ کر وہ کھلکھلا اٹھی۔

”مجھے یہاں کے علاقوں کی پہچان نہیں ہے اس لیے راستہ بتاتی رہیں گی ورنہ کہیں
کا کہیں پہنچ جاؤں گا۔“

”بس سیدھے چلتے رہیں۔“ اس نے اتنا کہہ کر پوچھا ”تو کیا واقعی آپ واپس
چلے جائیں گے؟“

”میری نیشنلٹی برٹش ہے۔ میں یہاں زیادہ دن رک بھی تو نہیں سکتا۔“ میرے لہجے
میں مایوسی کا عنصر در آیا تھا۔

”کوئی روکے تو بھی نہیں؟“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”تب سوچنا پڑے گا۔ یہ دیکھنا پڑے گا کہ روکنے والی شخصیت کس وجہ سے روک
رہی ہے۔ اور اس کا ارادہ کیا ہے؟“ میں نے اس کے چہرے پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور ہنستے
ہوئے بولا۔

”ارے ارے! سامنے دیکھیں ورنہ روکنے کا ابھی انتظام خود ہو جائے گا۔ کسی کی
کار آپ کی کار سے آ ٹکرائے گی یا آپ کی کار اس کے ساتھ اٹکھیلیاں کرنے کے لیے بڑھ
جائے گی.... رہا سوال روکنے کا تو میں بس اتنا کہوں گی کہ روکنے والے کا ارادہ نیک ہی ہو گا
تبھی تو وہ روکنا چاہے گا۔“

میں نے دیکھ لیا تھا کہ یہ جملہ ادا کرتے ہوئے عجیب سا حجاب اس کے چہرے سے
چھلک اٹھا تھا۔ یہ انداز مجھے کچھ زیادہ ہی پسند آیا تھا۔ لندن کی لڑکیوں میں خصوصاً برصغیر کی
لڑکیوں میں بھی اب یہ انداز حیا ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ بلکہ ہو چکا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اب
تک میں نے کسی لڑکی میں دلچسپی نہیں لی۔ یا پھر اس لیے دلچسپی نہیں لی کہ اب تک لڑکی کا ایک
ہی تصور میرے ذہن میں تھا۔ ایک ہی چاہت تھی کہ میری بھی کوئی بہن ہو۔ اور یہ آرزو اب
مٹ گئی تھی۔ پھر پہلے جیب خالی ہوا کرتی تھی مگر اب نہیں۔ پیٹ میں روٹی ہو تب عشق کی
سوجھتی ہے۔ اور وہ وقت آ گیا تھا اسی لیے میرے دل میں بھی عشق کا دیپ جگمگانے لگا تھا۔
میں نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے پوچھا ”اگر میں کہوں کہ میرے ساتھ کچھ دیر کے لیے کسی
ریسٹورنٹ میں بیٹھ جاؤ تو کیا تم میری پیشکش پر غور کرو گی۔“

”آپ بھی کیا یاد کریں گے کسی سخی دل سے پالا پڑا تھا۔ اگر آپ کی یہی خواہش ہے

تو میں تیار ہوں۔''اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

سامنے ہی ایک اچھے ریسٹورنٹ کا بورڈ نظر آرہا تھا۔ میں نے اس کے سامنے کار روک دی اور پھر نیچے اتر گیا۔ اس کی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا''زہے نصیب آپ نے میری دعوت قبول کی۔''

وہ نیچے اتری اور مسکراتے ہوئے بولی''آپ باتیں بھی بہت خوبصورت کرتے ہیں

''مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ آپ یہاں آنے سے قبل صداکاری کرتے رہے ہیں۔ ویسے شاعری وغیرہ سے بھی شغف ہے کیا؟''

''ابھی تو اردو بھی صحیح نہیں۔ شاعری کیا خاک سمجھوں گا۔''میں نے ہنس کر کہا اور اندر داخل ہونے کے لیے ہوٹل کے دروازے کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

وہ بھی میرے ساتھ تھی۔ مجھے اس کا یوں ساتھ چلنا اچھا لگ رہا تھا۔ ہم دونوں ڈائننگ روم میں آئے اور ایک خالی ٹیبل پر بیٹھ گئے۔

بیرے کو آرڈر نوٹ کرانے کے بعد میں نے پوچھا۔''ایک بات بتاؤ گی؟''

''جی فرمائیں؟''اس نے سوالیہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھئی ہم ٹھہرے لندن والے۔ مغربی معاشرے کے پروردہ' اسی لیے یہ پوچھ رہا ہوں۔''میں نے رک کر اس کے چہرے کا جائزہ لیا پھر دھیمی آواز میں بولا''اگر میں یہ کہوں کہ آپ مجھے اچھی لگی ہیں تو؟''

اس کے ہونٹوں پر پیاری سی شرمیلی سی مسکراہٹ کھل گئی مگر فوراً ہی وہ اپنے پرانے انداز پر لوٹ آئی شوخ لہجے میں بولی۔''ملاقات کو ابھی دو چار دن ہوئے اور اظہار عشق بھی کر بیٹھے۔''

مجھے ایسا لگا جیسے میں چور ہوں۔ خود میں سکڑ گیا۔ عجیب سی پشیمانی ہوئی کہ خواہ مخواہ اظہار کر بیٹھا۔ شاید میرے چہرے پر دل کی کیفیت ابھر آئی تھی۔ اس کی نگاہوں نے بھانپ لیا کہ میں شرمندہ ہوں۔ وہ جلدی سے بولی''ارے آپ تو شرمانے لگے؟''پھر اس نے ہلکے سے قہقہہ لگایا اور بولی''میں تو آپ کو چھیڑ رہی تھی۔''

''تو.... تو گویا آپ کو برا نہیں لگا؟''

''ضرور برا لگا ہے۔''اس نے مسکرا کر کہا۔

''اچھا.... تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔''

''پہلے یہ تو پوچھئے کیا برا لگا ہے۔''

''برا یوں لگا ہے کہ آپ نے اظہار کرنے میں اتنی دیر لگا دی۔ لندن کے ہوتے ہوئے بھی پاکستان کو پیچھے چھوڑ گئے۔ میں نے تو آپ کو دیکھتے ہی پسند کر لیا تھا۔ یقین کریں' میں جیسے ساتھی کی تمنا کرتی ہوں' آپ بالکل ویسے ہی ہیں۔''کہہ کر اس نے نظریں جھکا لی۔

''واہ گویا دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔''

''جی ہاں اور اس کا اظہار میں نے فہمیدہ سے بھی کر دیا ہے۔''

''تبھی فہمیدہ بار بار مجھے آپ کا نام لے کر چھیڑ رہی تھی۔''

''ہاں اس سے میں کوئی بات نہیں چھپاتی' یہ بات بھی اسی وقت بتا دی تھی کہ آپ مجھے بہت پسند آئے ہیں۔''

''گویا کہ میرے راستے میں اب آسانیاں ہی آسانیاں ہیں۔''

''جی نہیں' یہ پاکستان ہے' یہاں پریشانیاں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ دعا ہے کہ کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو اور میں....... جائیے میں نہیں بتاتی.... آپ خود سمجھ لیں۔''کہہ کر اس نے سر جھکا لیا۔ اس کے چہرے پر پہلی بار حیا کی لالی اس قدر گھر آئی تھی۔ میں بھی مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔

بیرے کو بل لانے کا اشارہ کیا اور پلیٹ میں بچی چیزوں پر نظر دوڑاتا ہوا میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ مسئلہ اتنی آسانی سے حل ہو جائے گا۔ پاکستان کی لڑکیاں اتنا آگے بڑھ چکی ہیں۔

اسے گھر چھوڑ کر میں واپس کالج کی طرف چل پڑا' فہمیدہ کو بھی لینا تھا۔ ڈھیر سارا وقت تیزی سے گزر گیا تھا۔ کراچی کی بے ہنگم ٹریفک میں کار چلانا آسان نہیں ہے پھر بھی میں اندازے سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ اسے گھر چھوڑ کر میں فہمیدہ کے کالج کی طرف چل پڑا وہاں پہنچا تو ابھی چھٹی ہوئی نہیں تھی۔ دیگر لوگوں کی طرح میں بھی کار پارک کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد فہمیدہ ہنستی کھلکھلاتی اپنی سہیلیوں کے ساتھ باہر آئی۔ اس نے کار پہچان لی تھی۔ سیدھی ادھر ہی آئی۔ اس کے ساتھ جو لڑکیاں تھیں۔ وہ سب اس کار کی تعریف کرنے لگیں۔ تبھی فہمیدہ بولی''کار کی اتنی تعریف کر لی میرے بھیا کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا بھی

نہیں۔''

ایک لڑکی نے مجھے غور سے دیکھا پھر ایک انداز سے بولی ''واقعی تمہارے بھیا تو اپنا تعارف خود ہیں۔کیا پرسنالٹی ہے۔''

اس کے انداز پر میں دائیں بائیں دیکھنے لگا۔تبھی اس کے برابر کھڑی لڑکی نے کہا ''اے یاسمین! آہستہ بول اگر مجتبیٰ نے سن لیا نا تو اپنا سر اپنے ہاتھوں سے پھوڑ لے گا۔''

اس کی بات پر سب کا مشترکہ قہقہہ گونج اٹھا۔ مجھے ہر قدم پر احساس ہو رہا تھا کہ پاکستان کا ماحول وہ نہیں رہا جو میرے تصور میں تھا۔وہ کتابی باتیں کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ لڑکیاں بے لگام گھوڑے کی طرح ہو چکی ہیں۔وہ حیا آلود ماحول کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔کمنٹ تو ایسے کر رہی تھیں جیسے زبان پر رکھے جملے ہوں۔

یاسمین نامی اس لڑکی نے سہیلی کے جملے پر مڑ کر کہا ''کاش یہ پہلے ہی لندن سے آ جاتے تو مجتبیٰ کو لفٹ بھی نہ کراتی۔''

''اے ہے......'' فہمیدہ بولی ''میرا بھائی اتنا سستا نہیں ہے،اب چل بیٹھ تم سب کو ٹریٹ بھی دینا ہے۔'' کہہ کر وہ میرے برابر والی سیٹ پر آ گئی۔ایک اور لڑکی اس کے برابر بیٹھ گئی۔پچھلی سیٹ پر پانچ لڑکیاں ٹھس ٹھسا کر بیٹھنے میں کامیاب ہو گئیں۔ میں نے اگنیشن میں چابی گھماتے ہوئے پوچھا ''ہاں بھئی...کہاں لے چلوں۔''

''چاند کے پار چلو،ہم ہیں تیار چلو۔'' پچھلی سیٹ سے کسی نے دبی دبی آواز میں گنگنایا۔

''کے ایف سی کی بڑی تعریفیں ہو رہی ہیں۔اسی نئے ریسٹورنٹ میں چلتے ہیں۔'' فہمیدہ نے کہا۔

''مجھے راستہ بتاتی رہنا۔'' کہہ کر میں نے کار آگے بڑھا دی۔

کچھ ہی دیر میں احساس ہو گیا کہ یہ لڑکیاں نہیں،شیطان کی خالائیں ہیں۔ایسے ایسے جملے پھینکتی کہ میں سٹپٹا جاتا۔جواب نہ سوجھتا۔بالآخر کے ایف سی آ گیا۔میں نے نیچے اتر کر دروازہ کھولا اور ان سب کو ساتھ لے کر اندر پہنچا۔پھر کہا ''آپ سب اپنی پسند کے مطابق آرڈر دیں۔بل میری طرف سے ہے۔''

''آپ بے فکر رہیں،ہم بل دینے والے بھی نہیں ہیں۔'' ایک لڑکی نے جواب

دیا۔

میں مسکرا کر رہ گیا۔بیرے نے سب کا آرڈر نوٹ کیا۔تبھی فوزیہ نے کہا ''بھائی جان...فہمیدہ کے۔کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ لندن میں شغل کیا ہے؟''

''جی میں نے آرکیٹکٹ کا کورس کیا ہے۔کچھ دن آرام کا خیال تھا اس لیے پاکستان لوٹ آیا۔کچھ دن یہاں آرام کروں گا پھر واپس۔'' میں نے جواب دیا۔میری بات پر ایک ساتھ سب نے قہقہہ لگایا جیسے میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہو۔

''بھئی میرے پوچھنے کا مقصد یہ تھا۔'' فوزیہ نے مسکرا کر سہیلیوں کی طرف دیکھا پھر میری طرف چہرہ موڑ کر بولی ''یہ پاکستان ہے اور وہ انگلستان۔دونوں کے معاشرے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔وہاں زندگی کو زندگی کی طرح انجوائے کیا جاتا ہے۔اس لیے پوچھنا چاہتی تھی بلکہ گستاخی کر رہی تھی کہ......'' وہ بولتے بولتے رک گئی۔

اسے رُکتے دیکھ میں نے پوچھا ''جی آپ کچھ کہہ رہی تھیں؟''

''محترم بھائی جان،فہمیدہ کے......میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کیا آپ واقعی اتنے معصوم ہیں یا بن رہے ہیں؟لندن سے آنے والا اتنا سیدھا تو ہوتا نہیں؟''

اب میری سمجھ میں ساری بات آئی ''میری پرورش اسلامی ماحول میں ہوئی ہے،میں زندگی کو اسلامی قوانین کے تحت گزارنے والوں میں سے ہوں۔آپ سب میری بہن کی سہیلیاں ہیں اس لیے میرے لیے مقدم ہیں۔میں نہیں چاہتا کہ میرے کسی جواب سے میری گڑیا بہن کو دکھ پہنچے۔''

''ارے جناب زندگی زندہ دلی کا نام ہے مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں۔'' فوزیہ نے شعر پڑھنے کے انداز میں جواب دیا۔

''آپ کے نزدیک زندہ دلی کسے کہتے ہیں مجھے نہیں معلوم مگر میں زندگی کو حدود و قیود میں گزارنے کا قائل ہوں۔'' کہہ کر پوچھا ''اور کچھ منگواؤں؟''

''آپ کے لیکچر سے ہی پیٹ بھر گیا۔'' یاسمین نے سرگوشی کے انداز میں کہا پھر بھی میں نے سن لیا مگر کچھ بولا نہیں اس لیے کہ میں سمجھ چکا تھا کہ یہ لڑکیاں ہاتھ سے نکل رہی ہیں اور ان پر وقت ضائع کرنا فضول ہے۔ میں نے یاسمین سے ہی پوچھا ''آپ پڑھائی میں کتنی تیز ہیں؟''

''پڑھنا کیسا جب تک مجتبیٰ کو نوکری نہیں مل جاتی مجھے کالج آتے رہنا ہے۔اس لیے

پروفیسر کیا پڑھاتے ہیں مجھے نہیں پتا۔ سہیلیوں سے نوٹس لے کر کام چلا لیتی ہوں۔'' اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

وہاں بیٹھنا اب میرے لیے دشوار تھا اس لیے میں کھڑا ہو گیا۔ ''فہمیدہ ابو کے آنے کا وقت قریب ہے۔ کیوں نہ ان کے آنے سے پہلے ہم گھر پہنچ جائیں؟''

''چلیے!'' فہمیدہ بھی کھڑی ہو گئی اور میں اسے لے کر گھر روانہ ہو گیا اس کی سہیلیوں نے کہا تھا کہ وہ سب ٹیکسی میں گھر جائیں گی۔

☆☆☆

رات کا ایک بج رہا تھا۔ میں اپنے کمرے میں لیٹا سوچ رہا تھا کہ یہ ہماری نئی نسل کو ہو کیا گیا ہے؟ اسلام کا قلعہ کہے جانے والے ملک میں رہ کر بھی اتنی آزاد خیالی؟ مغرب کی بے حیائی کہاں لے جا رہی ہے؟۔ یقیناً انہیں بغاوت پر اکسا رہی ہے۔ غلط رسوم نے معاشرے پر منفی اثر ڈالا اور فائدہ اُٹھایا مغرب کی بے باک تہذیب نے۔ یہی وجہ ہے کہ آج میں نے ان لڑکیوں سے جو کل نئی پود کی ماں بنیں گی ان کی زبان سے ایسی باتیں سنیں۔ کیا یہی ہمارا مستقبل ہے؟ اس کو سنبھالنا ضروری ہے۔ مگر یہ کام جن کا ہے وہ کیا کر رہے ہیں؟

میں سوچ کے گرداب میں ڈوب رہا تھا ابھر رہا تھا۔ تبھی مجھے یاد آیا کہ یہ وقت اس کوئز پروگرام کا ہے جو مجھے بہت زیادہ پسند آ رہا ہے۔ اناؤنسر کے بولنے، چلنے اور پرجوش آواز میں نعرہ لگانے کا انداز بہت پسند آ رہا تھا اسی لیے میں پابندی سے شو دیکھتا تھا۔ ہر قسم کے خیالات کو جھٹک کر میں ٹی وی لاؤنج میں چلا آیا۔ فہمیدہ پہلے سے ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے مسکرا کر کہا ''میں سوچ رہی تھی کہ آج آپ نے اس شو کو مس کیسے کر دیا۔''

''کچھ تھکن سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے کچھ دیر کے لیے لیٹ گیا تھا۔'' میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

شو اتنے دلچسپ مرحلے میں داخل ہو چکا تھا کہ میں سب کچھ بھول گیا اور سوالات کو بغور سننے لگا۔ شو کے سحر میں اس طرح کھویا کہ یہ بھی بھول گیا کہ ابو سے ایک اہم بات بھی کرنی ہے۔ وہ بات میری زندگی کا حاصل ہے اس لیے ابو کی رائے لینا ضروری ہے۔

جب شو ختم ہوا تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ میری گڑیا بہن بھی سونے جا چکی تھی۔ مجھے گلا خشک ہوتا محسوس ہوا۔ میں پانی پینے کے خیال سے اٹھا۔ بوتل پر نظر ڈالی وہ خالی تھی۔ میں

کچن میں جانے کے لیے اٹھا تو سوچا کہ پانی پی کر ابو سے بھی دو باتیں کر لوں گا، بشرطیکہ ابو جاگ رہے ہوں۔

پانی پی کر لوٹا تو دیکھا کہ ابو کے کمرے کی لائٹ جل رہی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ جاگ رہے ہیں۔ ان سے بات کر لی جائے یہ سوچ کر ان کے کمرے کے دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ موم کی تیز آواز سنائی دی۔ انہوں نے میرا نام لیا تھا اس لیے میں ٹھٹھک گیا۔ اب آواز کچھ مدھم پڑ گئی تھی۔ میں نے سننے کے لیے اپنے کان دروازے سے لگا دیئے۔

رات کی خاموشی میں آواز گونجتی ہے۔ دور تک جاتی ہے۔ موم کی آواز بھی بند کمرے کے دروازے کو پار کر کے گلیارے تک آ گئی تھی۔ ان کی آواز نسبتاً تیز تھی۔ غصے میں بھری جھنجلائی ہوئی آواز صاف سنائی دے گئی تھی۔

بعض باتیں عجیب ہوتی ہیں۔ موم کی بات تو عجیب تر تھی۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ دماغ ماؤف سا ہوتا محسوس ہوا۔ کانوں میں سیٹیاں سی بج اٹھیں۔ میں سمجھ کر بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ مذہب معاشرہ کوئی بھی اس کی اجازت نہیں دے گا پھر بھی وہ ضد کر رہی تھیں۔ بول رہی تھیں'' آخر فہمیدہ میں کیا برائی ہے؟ لاکھوں میں نہ سہی سینکڑوں میں ایک ہے۔ داؤد اسے پسند کیوں نہیں کرے گا؟ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ آپ خود نہیں چاہتے۔''

موم تیز تیز بولے جا رہی تھیں مگر مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میرا ذہن سو گیا ہے۔ آواز کانوں تک پہنچ تو رہی ہے مگر سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ میں بہن سے شادی کر لوں؟ ماں دو ہوئی تو کیا ہوا۔ باپ تو ایک ہے۔ سوتیلی ہی سہی بہن تو ہے۔ اور بہن سے شادی کیسے ہو سکتی ہے؟ اس سے زیادہ سننے کی تاب نہ تھی اس لیے میں اپنے کمرے میں لوٹ آیا اور اپنے وجود کو بستر پر گرا دیا۔

بستر پر آ جانے کے باوجود آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ کافی دیر تک جاگتا رہا سوچتا رہا۔ پھر نہ جانے کب نیند کی دیوی نے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔

اگلی صبح سو کر اٹھا تو سامنے فہمیدہ کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ٹرے تھی اور ٹرے میں بھاپ اڑاتی چائے کی پیالی تھی۔ شاید اسی کی آواز پر میری آنکھ کھلی تھی۔ مجھے اٹھتے دیکھ اس نے لاڈ بھرے انداز میں کہا ''اٹھیے جناب، اپنی لاڈلی بہن کے ہاتھ سے تیار کردہ گرما گرم چائے

نوش جان کیجئے۔ ایسی چائے قسمت والوں کو ملتی ہے۔ ڈھن ڈھن ڈھن یہ وقفہ اشتہار ہے۔''

اس کے انداز تخاطب پر میرے دل میں سکون سا اتر آیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بھی مجھے بھائی مان رہی ہے۔ مگر رات والی بات کی چبھن کم نہ ہوئی۔ موم نے ایسا شوشہ کیوں چھوڑا اس میں کیا راز ہے؟ وہ کیوں فہمیدہ سے میرا رشتہ جوڑنے پر تل گئی ہیں؟ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس پر میں جتنا غور کرتا اتنا ہی الجھ رہا تھا۔

برش کر کے میں نے چائے پی اور ٹی ٹیبل پر رکھے اخبار کو اٹھایا جو شاید فہمیدہ رکھ گئی تھی۔ اخبار کو اٹھایا تو اس کے نیچے دو تین خط رکھے تھے جو شاید کل آئے تھے۔ میں نے لفافے پر نظر ڈالی۔ دیکھنے میں ہی وہ کافی وزنی لگ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اس میں کوئی کتاب ہوگی مگر بھیجا کس نے ہے؟ یہ دیکھنے کے لیے میں نے لفافہ اٹھالیا اور الٹ پلٹ کر دیکھا مگر صرف میرا نام لکھا تھا۔ بھیجنے والے نے اپنا نام نہیں لکھا تھا۔ شاید بھول گیا تھا صرف پتا تھا۔ لندن کے ایک پسماندہ علاقے کا پتا لکھا ہوا تھا۔ وہاں میرا کوئی واقف کار بھی نہیں تھا۔ اس علاقے میں زیادہ تر کالے آباد تھے۔ یا پھر انتہائی غریب انگریز۔ تجسس کے مارے میں نے وہ بھاری لفافہ چاک کیا۔ اس میں سے ایک کاپی برآمد ہوئی مگر یہ کاپی ایک طویل خط پر مشتمل تھی۔ شروع کی دو سطریں پڑھنے کے بعد میں نے اس کے اوراق پلٹے اور آخری صفحہ دیکھا کہ اتنا طویل خط کس نے لکھا ہے مگر خط کے اختتام پر نام کی بجائے یہ الفاظ تحریر تھے۔ ''وہ، جسے آپ نے کبھی نہیں پہچانا اور نہ اب اتنی جلدی پہچان پائیں گے۔''

ان الفاظ نے میرے اندر جذبہ تجسس پیدا کر دیا اور میں وہ طویل خط پڑھنے لگا۔

''آپ کے نام یہ میرا پہلا اور آخری خط ہے جو میں اپنے بیٹے کی میت کے سرہانے بیٹھی لکھ رہی ہوں۔ وہ کئی روز سے فلو میں مبتلا تھا۔ گزشتہ تین روز سے برف باری جاری ہے مگر میرا بیٹا اتنی شدید سردی میں بھی بخار سے تپ رہا تھا۔ میں اسے موت کے منحوس پنجوں سے چھڑانے کے لیے دن رات ایک کرتی رہی۔ مسلسل جاگنے سے میری اپنی حالت خراب ہو رہی تھی۔ اعصاب جواب دینے لگے تھے پھر بھی میں اس کے قریب بیٹھی رہی مگر کل رات نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ تین بجے جب میری آنکھ کھلی تو گھات میں بیٹھی موت اسے مجھ سے چھین چکی تھی۔ وہ اسی طرح لیٹا ہوا تھا مگر اس کی کالی گہری آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی تھیں۔

میں نے چار موم بتیاں جلا کر اس کی چارپائی کے چاروں کونوں پر رکھ دی ہیں جب ہوا

سے ان شمعوں کی لوئیں تھرتھراتی ہیں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ مسکرایا ہو، جیسے وہ ابھی جاگ اٹھے گا اور کہے گا ''ممی! میں سو گیا تھا، مرا نہیں تھا۔'' مگر میں جانتی ہوں، وہ مر چکا ہے اور اب دنیا میں آپ کے سوا کوئی بھی نہیں جسے میں اپنا کہہ سکوں لیکن آپ تو مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔

میرے اعصاب شل ہو چکے ہیں اور سر میں شدید درد ہو رہا ہے شاید مجھے بھی فلو ہو گیا ہے۔ یہ تو اور بھی اچھا ہو گا کہ میں مر کر اپنے بیٹے سے جا ملوں گی لیکن مرنے سے پہلے میں آپ کو وہ سب کچھ بتا دینا چاہتی ہوں جو اب تک میں نے دل میں دفن کیے رکھا ہے۔ میری آرزو ہے کہ آپ میری کتاب زیست کے ایک ایک لفظ سے آگاہ ہو جائیں مگر یہ آگاہی آپ کو اس وقت حاصل ہو گی جب میں مر چکی ہوں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ کو میری زندگی میں اپنے کسی رویے پر ندامت ہو اگر یہ بخار جو لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتا جا رہا ہے میری موت کا باعث نہ بن سکا اور مجھے زندہ رہنا پڑا تو میں یہ خط پھاڑ کر پھینک دوں گی اور ہمیشہ کی طرح خاموش رہوں گی اور اگر یہ خط آپ تک پہنچ جائے تو بلا تامل یقین کر لیجیے گا کہ میں مر چکی ہوں کیونکہ یہ خط میری وصیت کے مطابق میرے مرنے کے بعد ہی پوسٹ کیا جائے گا۔

آپ کو میری ان باتوں سے کوئی خوف محسوس نہیں کرنا چاہیے۔ کوئی مردہ عورت نہ رحم کی طلب گار ہو سکتی ہے نہ محبت کی۔ میں تو آپ سے صرف اتنا چاہتی ہوں کہ میری اس تحریر کو افسانہ طرازی نہ سمجھیں۔ اس تحریر کا ایک ایک لفظ سچ پر مبنی ہے کہ کوئی ماں اپنے اکلوتے بیٹے کی میت کے سرہانے بیٹھ کر جھوٹ نہیں لکھ سکتی۔

مگر میں ابھی آپ کو یہ نہیں بتاؤں گی کہ میں کون ہوں۔ یہ آپ کو بالکل آخر میں پتا چلے گا۔ خیر جب میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا تھا، اسی وقت آپ کو پھانسنے کا پلان بنا لیا تھا۔

آپ سوچیں گے کہ میں آپ کو یہ باتیں کیوں بتا رہی ہوں۔ دراصل میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں آپ کو دیکھتے ہی آپ کی شخصیت سے متاثر ہو گئی تھی جو میرے نزدیک دولت، حیرت اور اسرار کے پردوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ ہمارے جیسی جکڑ میں بندھی زندگی گزارنے والی لڑکیوں کی سوچیں ایسی ہی ہوتی ہوں گی۔ ابھی ابھی مجھے یہ خیال آیا کہ کہیں آپ میری اس تحریر سے اکتاہٹ اور تھکن محسوس نہ کرنے لگیں۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ میرا یہ خط پورا پڑھ لیں، تھوڑی دیر کے لیے اپنے دل پر جبر کر لیں تو یہ مجھ پر آپ کا احسان ہو گا۔

وہ دن اور وہ لمحہ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے شعوری طور پر آپ کے حضور اپنا نذرانۂ دل پیش کیا تھا۔ اس دن میں نئے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہوئی تھی اور ملک مین کے ساتھ آپ کے دروازے کے سامنے کھڑی باتیں کر رہی تھی کہ ایک کار آئی اور آپ اس سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھے تو میں نے بے اختیار آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور اس طرح آپ کے راستے میں آ گئی۔ آپ مجھ سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔ آپ نے محبت آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتے اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مہربانی شکریہ!''

اور یہی میری زندگی کا وہ تاج دار لمحہ تھا جب میں دل و جان سے آپ کی ہو گئی تھی۔ مجھ ایسی تیرہ برس کی لڑکی کے اندر ایک عورت جاگ اٹھی تھی۔ وہ عورت جو ہمیشہ کے لیے آپ کی تھی مگر جسے آپ نہیں پہچانتے۔

جب آپ چلے گئے تو ملک مین نے مجھ سے پوچھا ''وہ کون ہے؟'' میں اسے آپ کا نام نہ بتا سکی کہ وہ میرے لیے متبرک ہو گیا تھا۔ میں نے صرف اتنا کہا۔ ''ہمارا ہمسایہ''

''تمہارے چہرے پر سرخی کیوں دوڑ گئی تھی؟'' اس نے دوسرا سوال کیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے میرے دل میں جھانک لیا ہو اور میں یہ راز کسی پر منکشف نہیں کرنا چاہتی تھی کہ میں نے اپنا دل آپ پر وار دیا ہے، اس لیے میں اسے وہیں چھوڑ کر اپنے اپارٹمنٹ میں چلی آئی۔

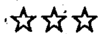
وہ تاج دار لمحہ میرے ذہن و دل میں جگمگاتا رہا اور زندگی کی آخری سانس تک جگمگاتا رہے گا۔ اسی لمحے سے مجھے آپ سے محبت ہے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ عورتوں سے یہ جملہ سننے کے عادی ہوں گے لیکن اتنا مجھے یقین ہے کہ کسی دوسری عورت نے آپ سے اتنی شدت سے اور ایسی بے لوث محبت نہیں کی ہو گی جیسی میں نے کی ہے۔ اس وقت میں صرف اتنا جانتی تھی کہ آپ میری زندگی بن گئے ہیں اور جس شے، جس بات سے آپ کا تعلق نہ ہو وہ میرے لیے وجود ہی نہیں رکھتی تھی۔ میرے دن آپ کے انتظار میں گزرتے تھے۔ اسکول سے آنے کے بعد میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر کتابیں پڑھتی تھی صرف اس لیے کہ آپ بھی کتابیں پڑھنے کے شائق تھے۔ میں اپنی ماں سے بھی ڈرتی رہتی تھی کہ کہیں وہ مجھے کھڑکی کے پاس بیٹھنے سے نہ روک دے مگر چونکہ ہر وقت مطالعہ کرنے سے میں کلاس میں اول آئی تھی شاید اسی لیے انہوں نے مجھے کھڑکی کے پاس بیٹھنے سے نہ روکا۔

یوں پورا ہفتہ بیت گیا۔ اس دوران میں جب کبھی آپ اپارٹمنٹ سے باہر جاتے، زندگی میرے لیے بے معنی اور بے کیف بن کر رہ جاتی۔ میری سمجھ میں نہ آتا کہ میں کیا کروں؟ میری آنکھوں میں ہر وقت آنسوؤں کی دھند سی بھری رہتی اور میں اپنی ماں سے چھپی چھپی پھرتی کہ کہیں میری آنکھیں اس پر میرے دل کا راز فاش نہ کر دیں۔ شاید آپ کو میری یہ باتیں حماقت محسوس ہوں لیکن میں ان پر شرمندہ یا نادم نہیں ہوں۔ تاہم یہ سوچ کر کہیں آپ ان باتوں سے اکتا نہ جائیں، میں اپنی کیفیت کی مزید تفصیل نہیں لکھوں گی لیکن ایک واقعہ ضرور بیان کرنا چاہتی ہوں جو آپ کے نزدیک معمولی سہی مگر میرے لیے بے حد اہم تھا۔

وہ اتوار کا دن تھا۔ آپ کہیں گئے ہوئے تھے۔ آپ کا ملازم قالین جھاڑنے کے بعد اسے گھسیٹ کر اندر لے جانے کی کوشش کر رہا تھا مگر قالین بھاری تھا۔ میں نے کھڑکی سے یہ منظر دیکھا تو بھاگ کر اس کے پاس گئی اور بولی۔ ''اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کا ہاتھ بٹا دوں انکل!''

اسے میری اس پیشکش پر تعجب تو ضرور ہوا مگر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں اس کے ساتھ قالین گھسیٹنے لگی۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ میں نے کتنے ادب و احترام سے آپ کے کمرے میں قدم رکھا تھا، آپ کے لکھنے کی میز پر سیاہ بلوری گلدان میں سفید گلاب سجے تھے۔ دیواروں کے ساتھ کتابوں سے بھرے شیلف رکھے تھے اور ایک دیوار پر دو پینٹنگز آویزاں تھیں۔ میں نے ان چیزوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور اس پورے ماحول کو دل میں اتار لیا۔ مجھے اپنے نگارخانہ تصور کو سجانے کے لیے نیا ساز و سامان مل گیا تھا۔

یہ میری زندگی کا ایک اور خوش آئند لمحہ تھا۔ اب میں چشم تصور سے آپ کو میز پر لکھتے، شیلف سے کتابیں نکالتے، رکھتے اور پینٹنگز پر نگاہ ڈالتے دیکھ سکتی تھی۔ میں نہیں جانتی کہ دوسری لڑکیاں محبت میں مبتلا ہوتی ہیں تو ان پر کیا گزرتی ہے مگر میرے لیے آپ کی محبت ایسا طلسم بن گئی تھی جس نے میرے جسم و جاں ہی کو نہیں، روح تک کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ سوچوں تو صرف آپ کے متعلق، دیکھوں تو صرف آپ کو، کہیں جاؤں تو صرف آپ کے ساتھ اور بات کروں تو صرف آپ سے۔



کل رات موت نے میرا بیٹا مجھ سے چھین لیا اب اگر مجھے زندہ رہنا پڑا تو میں بالکل

تنہا رہ جاؤں گی۔ تکفین و تدفین کرنے والے میرے بیٹے کے لیے تابوت لائیں گے۔ شاید میرے کچھ دوست بھی آئیں۔ وہ مجھے تسلی دیں گے لیکن تسلی کے الفاظ میرے لیے کوئی معنی و مفہوم نہیں رکھتے وہ بھی میرے لیے مر چکے ہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ بھری دنیا میں تنہا رہ جاؤں گی۔ لاتعداد انسانوں کے درمیان تنہا رہ جانا بہت ہی اذیت ناک اور کرب انگیز ہوتا۔ اس کرب و اذیت کا اندازہ مجھے ہو چکا ہے۔ میں اپنے آپ کو ایک بے بس قیدی کی طرح محسوس کرتی تھی حالانکہ میری بہن میرا باپ اور میری ماں ہر طرح میری دلجوئی کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ میرے ہم عمر لڑکے مجھ سے دوستی کے خواہاں تھے مگر میں ان کی ہر کوشش کو ناکام بناتی رہی۔

دراصل میں آپ سے دور رہ کر مسرور و مطمئن ہونا ہی نہیں چاہتی تھی اسی لیے میں قنوطی بن گئی۔ میں کہیں بھی سیر و تفریح کے لیے نہ جاتی بلکہ گھر سے ہی نہ نکلتی، جب میں آپ کو نہیں دیکھ سکتی تھی تو پھر دوسری چیزوں کو، دوسرے لوگوں کو کیوں دیکھتی؟ میں تو صرف آپ کی ہو کر زندگی گزارنا چاہتی تھی۔

اب میں اٹھارہ سال کی ہونے والی تھی۔ راستہ چلتے نوجوان مڑ مڑ کر مجھے دیکھتے تو میں کلس کر رہ جاتی۔ آپ کے سوا کسی اور شخص کو چاہنا یا کسی اور سے چاہا جانا میرے لیے بڑا کرب انگیز تھا۔ جسم کی نشوونما کے ساتھ میرے حواس اور جذبات بھی جاگ اٹھے تھے۔ آپ کی چاہت کا جذبہ ایک بالغ عورت کی محبت میں بدل گیا تھا۔ اب میری ایک ہی آرزو تھی وہ یہ کہ میں اپنا دل، اپنا جسم، اپنی ہستی آپ کو سونپ دوں۔

میں بہت دیر تک کھڑکی میں کھڑی رہی مگر پھر خیال آیا کہ میں ایک بالغ دوشیزہ ہوں۔ کھڑکی میں کھڑی رہنے سے کہیں ہمسائے مشکوک نہ ہو جائیں کہیں وہ آپ پر حرف گیری نہ کرنے لگیں لہٰذا میں نے یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ کھڑکی میں کھڑی ہونے کے بجائے سڑک پر ٹہلتی رہا کروں تو بہتر ہوگا۔ اس فیصلے کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ آپ بھی مجھے دیکھیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کی وہ نگاہ، نگاہ التفات ثابت ہو اور میں آپ کی ضرورت بن جاؤں۔

ہر شام میں اپنے اور آپ کے اپارٹمنٹ والی گیلری پر پہنچ جاتی۔ میری آرزو ہوتی کہ کاش میرا اور آپ کا آمنا سامنا ہو جائے۔ کئی روز تک میری یہ آرزو پوری نہ ہوئی لیکن ایک شام آپ آتے دکھائی دے گئے۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ نہ جانے کیوں میں ایک دم وہی تیرہ برس کی لڑکی بن گئی اور سر جھکا کر یوں تیز قدموں سے آپ کے قریب سے گزر گئی جیسے کوئی

میرا تعاقب کر رہا ہو حالانکہ مجھے آپ کا سامنا کرنے کا اشتیاق تھا۔ بعد میں مجھے اپنی اس حرکت پر غصہ بھی آیا اور ندامت بھی ہوئی۔ میں چاہتی تھی کہ آپ کا سامنا ہو تو آپ مجھے دیکھیں، پہچانیں اور مجھ سے محبت کرنے لگیں۔

اس کے بعد بھی میرا وہی معمول رہا۔ چاہے یخ بستہ ہوائیں چل رہی ہوں یا برف باری ہو رہی ہو، میں آپ کے انتظار میں ٹہلتی رہتی۔ کبھی آپ میرے آنے سے پہلے گھر پہنچ چکے ہوتے اور کبھی کسی دوست کے ساتھ گھر چھوڑ کر کہیں چلے جاتے۔ مجھے اتنا صدمہ ہوتا کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ سوچا اب آپ کا انتظار نہیں کروں گی۔ آپ کے سامنے نہیں آؤں گی لیکن دوسری شام مجھے ڈسنے لگی۔ میں اپنے آپ سے لڑتی رہی اور بالآخر ہار گئی۔

تیسری شام میں پھر آپ کی راہ دیکھ رہی تھی۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ محبت نے مجھے کتنا مجبور اور بے بس کر دیا تھا۔

کئی روز بعد میں نے ایک شام پھر آپ کو سامنے سے آتا دیکھا تو اپنی تمام قوت ارادی کے ساتھ یہ عزم کر لیا کہ آج آپ کے راستے سے نہیں ہٹوں گی جب آپ میرے قریب سے گزرے تو آپ نے غیر ارادی طور پر مجھے بھی اسی انداز سے دیکھا جس سے آپ دوسری عورتوں کو دیکھتے ہیں۔ مگر آپ مجھے نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئے۔ میں بھی چل دی لیکن دل نے مجھے مڑ کر آپ کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ آپ بھی پلٹے، پھر مجھ پر نگاہ ڈالی اور دوبارہ مڑ کر چل دیے۔

دل دوسروں کو دھوکا دیتا ہو یا نہیں مگر میرا دل ہمیشہ مجھے دھوکے دیتا رہا ہے وہ پھر سرگوشیاں کرنے لگا۔ ''کیا محبوب کے انتظار کی اپنی لذت نہیں ہوتی؟ کیا یہ کم خوش بختی ہے کہ اداس لمحوں میں اس کا تصور تمہارے ذہن میں چراغاں کر دیتا ہے۔'' اور میں دل کی ان دلیلوں کو اس لیے تسلیم کر لیتی کہ میرا ذہن و دل کبھی آپ کے خیال و تصور سے خالی نہیں رہا تھا ورنہ میں مر جاتی۔

دو روز بعد پھر ہمارا آمنا سامنا ہوا تو آپ نے مجھے ایسی نگاہ سے دیکھا جس میں شناسائی کی ہلکی سی جھلک شامل تھی۔ آپ نے اس لڑکی کو پہچان کر ایسا نہیں کیا تھا جو آپ کی چاہت میں مبتلا تھی اور جس میں آپ نے ایک عورت کو جگا دیا تھا۔ دراصل آپ نے اس اٹھارہ سالہ حسین دوشیزہ کو پہچانا تھا جسے دو روز پہلے آپ نے اسی جگہ دیکھا تھا۔ جب آپ کے ہونٹوں پر

تبسم کی لکیر ابھری اور آپ نے اپنی رفتار دھیمی کر دی تو میں لرز بھی گئی اور مسرور بھی ہوئی۔

آپ کو وہ شام یاد ہوگی، نہ وہ چھوٹا سا اپارٹمنٹ، نہ وہ باتیں جو آپ نے کی تھیں ہاں وہ تلخ باتیں' میری بے وقوفی ضرور یاد ہوگی۔ وہ بے وقوفی کیا تھی وہ آپ کو کچھ ٹھہر کر یاد دلاؤں گی کیونکہ میری بساط کیا ہے؟ میں تھی ہی کیا؟ ان بہت سی عورتوں میں سے ایک جن کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزارنے کے بعد آپ انہیں بھول گئے تھے۔ میرے لیے یہی بہت تھا کہ آپ میرے سامنے تھے، قریب تھے اور ہم کلام تھے۔ اور تب میں نے ایک پلان بنایا۔ آپ کو قریب کرنے کے لیے۔ آپ کے قریب ہونے کے لیے۔ میں نے امی کو اُکسایا' باجی کو تیار کیا کہ آپ سے رابطہ کیا جائے۔ دوستی بڑھائی جائے۔ آپ کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا پھر بھی انجان بن کر آپ کے گھر جا پہنچی اور پھر مزید قریب ہونے کے لیے ٹیوشن کا بہانہ ڈھونڈ لیا جس کا اختتام دل خراش واقعہ پر ہوا۔ اور آپ خاموشی سے اپارٹمنٹ چھوڑ کر چلے گئے۔ اور میں پاگل ہو اٹھی۔

اب میں ایک اور انکشاف کرنے لگی ہوں۔

میرا بیٹا جسے کل موت نے مجھ سے چھین لیا، یہ آپ کی بے توجہی کا شاخسانہ تھا۔ اب میں اپنا مکمل تعارف کرا ہی دوں' میں وہی ہوں جسے آپ نے ٹھکرا دیا تھا اور میرے دل کو روند کر چلے گئے تھے۔ آپی بہت روئی تھی۔ امی نے بھی آنسو بہائے تھے۔ مگر میری آنکھوں سے ایک بوند بھی نہ ٹپکی تھی۔ وہ لوگ آپ کو مجرم سمجھ رہے تھے اور میں خوش تھی کہ مجھے ٹھکرانے کا میں نے انتقام لے لیا۔ مگر نہیں' انتقام کہاں لیا؟ میں تو مزید الجھ گئی تھی۔ اپنے ٹھکرائے جانے کا انتقام میں نے خود سے لینا شروع کر دیا۔ مانچسٹر میں' بریڈ فورڈ میں' لندن میں' ہر جگہ لڑکیوں کے بھوکے لڑکے بہت ملتے ہیں۔ آپ نے جسے غلط ٹھہرایا تھا۔ اسے یہ لوگ زندگی کی ضرورت کہتے ہیں۔ صرف انگریز ہی نہیں۔ پاکستان ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمان جو یہاں رہ رہے ہیں وہ بھی اسے برا نہیں سمجھتے۔ ایک کے بعد ایک کئی لڑکوں سے میں نے رشتہ جوڑا پھر جب مجھے احساس ہوا کہ میں ماں بننے والی ہوں تو میں نے علی الاعلان گھر میں کہہ دیا کہ میں اپنے دوست کے ساتھ اس کے گھر رہنے جا رہی ہوں۔ یہ پاکستان تو ہے نہیں جو کوئی اعتراض کرتا۔ قانون مجھے اپنی زندگی گزارنے کا یقین دلاتا ہے۔ ساتھ دیتا ہے اس لیے کسی نے مجھے روکا نہیں اور میں وہاں سے لندن آ گئی۔ صرف اس اُمید پر کہ شاید آپ سے ملاقات ہو جائے۔

یہاں آ کر میں نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ وہ میری بے پرواہ عیاشانہ مہربانی کا ماحصل

تھا۔ ممکن ہے کہ آپ کو میرے اس انکشاف پر غصہ آئے یا صرف تعجب ہو۔

میں اپنی تباہی پر آپ کو نہ تو کوئی الزام دے رہی ہوں اور نہ شکایت کر رہی ہوں کہ پیار تو میں نے کیا تھا، پھر آپ سے کیا شکوہ؟

بچے کے جنم لینے سے پہلے آخری مہینوں میں میں نے کام چھوڑ دیا تھا۔ پس انداز کی ہوئی تھوڑی سی رقم سے اور اپنے چھوٹے چھوٹے زیورات بیچ کر گزارہ کرتی رہی۔ زچگی سے ایک ہفتہ پہلے میری بچی کھچی رقم ملازمہ نے چرا لی تو مجھے خیراتی زچہ خانے میں داخل ہونا پڑا۔ یوں میرے بیٹے نے خیراتی شفا خانے کے ایک ایسے وارڈ میں جنم لیا جہاں خون اور کلوروفام کی بو پھیلی ہوئی تھی اور جو لاوارث غریب عورتوں کی کراہوں سے معمور تھا۔ آپ نے شاید ایسے وارڈ نہیں دیکھے۔ وہاں میڈیکل چارٹ پر لکھے نام کے سوا مریض اپنی شخصیت، انفرادیت اور انا تک سے محروم ہو جاتے ہیں۔

میں یہ تلخ باتیں لکھنے پر معذرت خواہ ہوں۔ ان کے قلم بند کرنے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ اس بچے کے حصول کے لیے میں کتنے دکھوں اور عذابوں سے گزری ہوں جسے موت نے مجھ سے چھین لیا ہے میں تو اسے پا کر سارے درد و الم بھول گئی تھی مگر اب جب اس کی میت میرے سامنے پڑی ہے، وہ سارے کرب، سارے عذاب، سارے درد و الم زندہ ہو گئے ہیں، پھر بھی میں آپ کو کوئی الزام نہیں دیتی۔ مجھے آپ پر کبھی غصہ نہیں آیا۔

ہمارا بیٹا جسے آپ جانتے بھی نہیں، کل رات مر گیا۔ آپ نے کبھی اسے دیکھا بھی نہیں۔ وہی تو اب دنیا میں میری مسرت کا واحد ذریعہ تھا۔ میں اس کی پیدائش سے کئی ماہ پہلے اور بہت عرصے بعد تک آپ کی نگاہوں سے پوشیدہ رہی۔ میرے دل میں آپ کی محبت کا وہ پہلا سا جوش و جذبہ بھی نہیں رہا تھا اس لیے کہ اب میرے پاس میرا بیٹا تھا، میں بھی کسی حد تک آپ سے بے نیاز ہو گئی۔ وہ بہت خوبصورت بچہ تھا۔ مگر آج اس کی میت میرے سامنے رکھی ہے اور میں اس کا ماتم کرنے کی بجائے آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔

آپ سوچیں گے کہ میں اس کے اخراجات کی متحمل کیوں کر ہوئی؟......تو سنیئے، میں بغیر کسی شرم و حجاب کے بتا رہی ہوں کہ اسے اچھا ماحول اور بہتر مستقبل دینے کی خاطر میں نے اپنے آپ کو بیچ دیا۔ مجھ سے نفرت نہ کیجئے کہ میں کوئی پیشہ ور کسبی نہیں بنی تھی پھر بھی میں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا۔ میرے خریدار بہت دولت مند تھے۔ پہلے میں نے انہیں تلاش کیا پھر انہوں

نے مجھے ڈھونڈ نکالا کہ میں ایک شاداب جسم کی خوبصورت عورت تھی اور خوبصورت عورت جس سے التفات برتتی ہے، وہ اسی کا ہو جاتا ہے۔ میرے التفات نے انہیں میرا گرویدہ بنا دیا۔ وہ سب مجھ سے محبت کرتے تھے۔ صرف آپ نے مجھ سے محبت نہیں کی۔ آپ جس سے میں محبت کرتی تھی اور کرتی ہوں۔

آپ کو میری اس راست بازی پر ناراض نہیں ہونا چاہئے۔ میں تو ایک مجبور اور بے بس عورت تھی جو اپنے بیٹے کو اچھا ماحول اور بہتر مستقبل دینے کی خاطر وہ سب کچھ کرتی رہی جو مجھے نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرا بیٹا، غریبوں کی گندی گلیوں میں پرورش پائے اور زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو بھی ترستا رہے۔ اسے اس ماحول میں رہنا چاہئے جس میں آپ رہتے ہیں۔ اسے آپ کے نقش قدم پر چلنا چاہئے، اسی لئے میں نے اپنے آپ کو بیچ دیا۔ میں اپنے اس اقدام کو ایثار یا قربانی کا نام نہیں دوں گی۔ میرے نزدیک عزت اور بے عزتی دونوں بے معنی الفاظ بن چکے ہیں۔ میں آپ سے محبت کرتی تھی اور آپ کو اپنے جسم و جاں کا مالک سمجھتی تھی۔ جب میں آپ کی محبت نہ پا سکی تو پھر میں اپنے جسم کے ساتھ کچھ بھی کرتی پھروں، اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

میں ان لوگوں کو اپنے احباب سمجھتی ہوں جو میرے التفات سے محظوظ ہوئے۔ وہ میری ناز برداری کرتے تھے مگر ان کے پر جوش جذبے کبھی میرے دل کو نہ چھو سکے۔ مجھے ان کی یک طرفہ محبت سے ہمدردی تھی۔ میں ان کا احترام کرتی تھی کیونکہ وہ مجھ پر بے حد مہربان تھے مگر میں ان کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتی تھی کہ میرا یہ جذبہ صرف آپ کے لئے تھا اور آپ ہی کے لئے ہے۔

میرے چاہنے والوں میں ایک معمر شخص بھی تھا۔ یہ معمر آدمی مجھ سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اس کی بیوی مر چکی تھی۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ مجھ سے اصرار کرتا رہا کہ میں اس کی بیوی بن جاؤں۔ اگر میں اس کی بات مان لیتی تو آج ٹاٹرال کے ایک محل نما بنگلے میں رہ رہی ہوتی۔ مجھے ہر فکر و پریشانی سے نجات مل جاتی۔ ہمارے بیٹے کو ایک شفیق باپ اور مجھے ایک سنجیدہ اور مہربان شوہر مل جاتا جو میری ہر فرمائش پوری کرتا مگر میں اپنی ضد پر قائم رہی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرے انکار سے اسے اذیت پہنچتی ہے، میں انکار کرنے پر مجبور تھی۔ آپ، سوچیں گے کہ مختلف لوگوں کو جسم کا خراج دینے سے تو اس کے ساتھ شادی کر لینا بہتر ہوتا لیکن ٹھہریئے میں آپ

کو اپنے انکار کی وجہ بتائے دیتی ہوں۔

میرے انکار کا باعث یہ تھا کہ میں اب تک اپنی امیدوں اور آرزوؤں سے دست بردار نہیں ہوئی تھی۔ میں سوچتی تھی کہ شاید کبھی آپ میری ضرورت محسوس کریں اور مجھے بلائیں تو میں آپ کے اشارے پر، آپ کی پہلی آواز پر لبیک کہہ سکوں۔ کوئی بندھن، کوئی پابندی آپ تک پہنچنے میں میری راہ نہ روک سکے۔ جب سے آپ نے میرے اندر عورت کو جگایا تھا، میں مجسم انتظار بن گئی تھی۔ مجھے ہمیشہ آپ کے اشارے کا، آپ کی پکار کا انتظار رہتا تھا، لیکن افسوس کہ آپ میری طرف کبھی متوجہ ہی نہیں ہوئے۔ بہن ہی سمجھتے رہے۔

اب میں شرمیلی سی لڑکی کی بجائے بھرپور عورت تھی۔ ایسی عورت جسے لوگ پیکر شباب کہتے تھے، جو عمدہ اور نفیس لباس پہنتی تھی اور جسے بہت سے لوگ چاہتے تھے مگر جو صرف آپ سے پیار کرتی تھی۔

میں آپ کو اس بے اعتنائی کا قصوروار نہیں سمجھتی۔ آپ مجھ میں چھپی اس دیوانی دوشیزہ کو کیسے پہچانتے جسے آپ نے اپنی خواب گاہ کی مدھم روشنی میں دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس لئے میری التجا ہے کہ یہ خط ادھورا نہ چھوڑ دیجئے گا بلکہ اسے آخری لفظ تک پڑھیے گا۔

میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ میں نے شادی کیوں نہیں کی۔ یہ بھی آپ جان چکے ہیں کہ مجھے اس ساعت کا انتظار تھا جب آپ میری ضرورت محسوس کریں۔

پھر ایک دن لندن کے ایک ہوٹل میں آپ سے ملاقات ہو گئی۔ اس وقت میں پوری طرح عربی انداز کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس لباس کی وجہ سے خریدار منہ مانگے پیسے دیتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں عرب ہوں۔

ہوٹل کے اس لاؤنج میں آپ اکیلے بیٹھے تھے کہ میں آپ کی ٹیبل پر پہنچ گئی۔ میں نے اپنا گیٹ اپ ہی بدل لیا تھا اس پر چہرے پر تھوپا گیا میک اپ' آپ بھی مجھے پہچان نہ سکے۔ مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھتے رہے تب میں نے کہا تھا ''کیا میں کچھ دیر یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟''

''ضرور ضرور۔'' آپ نے کہا تھا۔

''میں تو عرب ہوں آپ؟''

''پاکستانی'' آپ نے کہا تھا۔

''واہ' میں پاکستانیوں کو بہت پسند کرتی ہوں۔ میں پاکستان بھی جا چکی ہوں۔ میرا

ستارہ تو ہمیشہ سفر میں رہا ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں آپ کی طرف دیکھتی رہی۔ میں نے سوچا تھا کہ شاید میری اس بات سے آپ مجھے پہچان لیں مگر افسوس! آپ پھر بھی مجھے نہ پہچان سکے۔

آپ نے مسکراتے ہوئے تسلی آمیز انداز سے کہا "سفر جتنا بھی لمبا ہو، مسافر واپس آجایا کرتے ہیں۔"

"ہاں۔" میں دکھ سے بولی۔ "مسافر واپس آجاتے ہیں مگر اس وقت تک وہ بہت کچھ بھول چکے ہوتے ہیں۔"

شاید آپ نے میرے جذبے کی گہرائی محسوس کر لی تھی، اس لئے آپ نے کہا "اچھی باتوں، اچھی چیزوں اور اچھی یادوں کو انسان فراموش نہیں کر سکتا۔ یہ فراموش کرنے کے لئے نہیں، یاد رکھنے کے لئے ہوتی ہیں۔" آپ نے بات جاری رکھی۔ "تم بھی مجھے یاد رہو گی۔ میں تمہیں کبھی فراموش نہیں کروں گا۔"

میں سمجھی کہ شاید آپ مجھے پہچان گئے ہیں اور ابھی گزرے دنوں کی کسی بات کا حوالہ دیں گے لیکن آپ نے کوئی حوالہ نہ دیا۔ آپ مجھے نہیں پہچان سکے تھے۔ میں اب بھی آپ کے لئے یکسر اجنبی اور بیگانہ تھی۔ میں پلٹ کر آئینے کے سامنے اپنے بال سنوارنے لگی۔ مجھے اپنے عکس کے ساتھ ساتھ آپ بھی دکھائی دیئے۔ آپ میری طرف پیٹھ موڑے جو کچھ کر رہے تھے، اس سے میرے وجود میں غم و غصے کی لہریں دوڑنے لگیں، میں شرم اور نفرت سے لرز اٹھی کیونکہ آپ میرے دستانوں میں دو نوٹ اڑس رہے تھے۔ آپ مجھے وقت کی قیمت ادا کر رہے تھے جو میں نے آپ کے ساتھ گزارا تھا۔ مجھے، جس نے آپ کو دل کی تمام تر شدتوں سے چاہا تھا، آپ نے مجھے ایک عام سی عورت سمجھا تھا۔ کیا میرے لئے آپ کا یہ ظلم کافی نہیں تھا کہ آپ نے مجھے کبھی نہ پہچانا اور بار بار بھول جاتے رہے؟ پھر آپ کو مجھے یوں ذلیل کرنے کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟ شدید کرب و اذیت نے مجھے فی الفور وہاں سے جانے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اپنی شال اور دستانے اٹھائے جو آپ کے نوٹوں کی وجہ سے مجھے غلیظ محسوس ہو رہے تھے۔ میری نگاہیں یہ التجا کر رہی تھیں کہ پہچان بھی لیجئے، آخری بار مجھے پہچان جایئے مگر آپ مسکرا دیئے۔ آپ کی آنکھوں میں پہچان کی ذرا سی جھلک بھی نہیں تھی۔

☆☆☆

میرا بیٹا مر گیا ہے اور میں اس کے سرہانے بیٹھی آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں۔ میرا بخار

تیز ہو گیا ہے مگر میں اپنی تپتی ہوئی پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں نہیں رکھوں گی۔ میں صحت یاب نہیں ہونا چاہتی۔ اس بھری پری دنیا میں اب کون ہے جسے میں اپنا کہہ سکوں؟ آپ کے سوا اب میرا کوئی نہیں لیکن آپ بھی میرے لئے کیا ہیں؟ آپ نے تو مجھے کبھی پہچانا تک نہیں۔ آپ تو میری زندگی میں صبا کا جھونکا بن کر آئے اور گزر گئے۔ شاید میں نے غلط کہا۔ آپ تو ایک مہمان کی طرح میرے خانہ دل میں آئے اور اسے روندتے ہوئے چلے گئے۔ مجھے ایک لامتناہی انتظار میں چھوڑ کر۔

آپ نے کہا تھا کہ سفر جتنا بھی لمبا ہو، مسافر لوٹ آتے ہیں لیکن آپ تو ایسے مسافر ہیں جن کے لئے میں وطن کا درجہ رکھتی ہوں نہ منزل کا۔

جب میرا بیٹا پیدا ہوا تو میں سمجھی تھی کہ میں مکمل ہو گئی لیکن کل رات وہ بھی بڑی خاموشی سے، مجھے الوداع کہے بغیر سفر پر چلا گیا اور اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ انسان کے لئے اس سے بڑی بدنصیبی کیا ہو سکتی ہے کہ وہ کسی کا انتظار بھی نہ کر سکے۔ خدا ایسی تنہائی، ایسا اکیلا پن کسی کے مقدر میں نہ لکھے!

آج میں کتنی تہی دست، کتنی تہی داماں ہوں۔ موت نے میرا بیٹا مجھ سے چھین لیا ہے۔ میرے پاس اب کوئی چیز نہیں۔ آپ کی یادداشت میں بھی میرے لئے کوئی جگہ نہیں۔ اگر کوئی شخص آپ کے سامنے میرا نام لے تو وہ آپ کے لئے کسی اجنبی کا نام ہوگا۔ ایسی عورت کا جسے آپ نے کبھی دیکھا بھی نہ ہو۔ اب آپ ہی بتائیے کہ مجھے اپنی موت کا خوش دلی سے استقبال کرنا چاہیے یا نہیں؟

اب جب میری زندگی کی ڈور ٹوٹنے والی ہے، میں آپ کو ایک بار پھر یقین دلانا چاہتی ہوں کہ اپنی محرومیوں کے لئے آپ پر کوئی الزام نہیں لگانا چاہتی۔ میں نے یہ خط صرف اس لئے لکھا ہے کہ مرنے سے پہلے آپ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دوں۔ مجھے یہ حسرت نہ رہ جائے کہ میں نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا، اپنی چاہتوں سے لاعلم رکھا تھا۔ میرا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ آپ کو اپنے حزن و ملال میں شریک کروں یا آپ کی پر مسرت زندگی پر اپنے دکھ کی پرچھائیں بھی ڈالوں لیکن مجھے ایک بات کا ڈر ہے۔ زندگی میں میرے پاس جو کچھ تھا، آپ کا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری موت کے بعد میرے دکھوں کا ترکہ آپ کو ملے۔ خدا کرے ایسا نہ ہو۔ مجھے ایک اور بات کا بھی خدشہ ہے۔ میں زندگی بھر آپ کے بلاوے کی منتظر رہی مگر

آپ نے مجھے کبھی نہ بلایا۔ ممکن ہے کہ اب آپ مجھے بلانا چاہیں، مجھے آواز دیں تو یہ پہلا موقع ہوگا جب میں آپ کی آواز پر لبیک نہ کہہ سکوں گی۔

بخار اتنا تیز ہوگیا ہے کہ مجھ سے لکھا نہیں جارہا مگر جب تک میرا لرزتا ہاتھ قلم کو تھام سکتا ہے، میں لکھتی اور آپ سے باتیں کرتی رہوں گی۔

اس وقت میں مسرور ہوں کہ میں نے وہ سب کچھ آپ کو بتادیا ہے جو دل میں چھپائے ہوئے تھی، آپ کو سب کچھ معلوم ہوجائے گا سوائے اس ایک بات کے کہ میں آپ سے کتنی محبت کرتی تھی۔ ہاں، میں نے آپ کو سب چاہنے والوں سے زیادہ چاہا ہے۔ یہ میری چاہت ہی تو ہے کہ میں نے آپ کو ڈھونڈ لیا۔ بھوسے کے ڈھیر سے سوئی تلاش کرلی۔ پہلے آپ کے چچا کا گھر ڈھونڈا۔ ان سے دوستی کی اور پھر آپ کا پاکستانی پتا معلوم کیا۔ اور آپ کو خط لکھنے کا سوچ لیا۔

اب میں بیٹھ کر نہیں لیٹ کر لکھ رہی ہوں۔ موت دبے پاؤں میرے قریب آگئی ہے اور میں خوش ہوں۔ اس طرح مجھے اپنے بیٹے کا جنازہ جاتے نہیں دیکھنا پڑے گا۔

میرے ہاتھ میں لرزش آگئی ہے۔ قلم کسی وقت بھی گر سکتا ہے۔ مجھے لفافے پر آپ کا پتا بھی لکھنا ہے اس لئے میرا الوداعی سلام قبول کیجئے۔ اس یقین دہانی کے ساتھ کہ میں نے آپ کے سوا کبھی کسی سے محبت نہیں کی اور اگر آپ اپنی سالگرہ پر میری طرف سے گل دان میں گلاب سجاتے رہے تو میں سمجھتی ہوں کہ مجھے آپ کی محبت مل جائے گی۔ مرنے کے بعد سہی۔

وہ، جسے آپ نے کبھی نہیں پہچانا اور نہ کبھی پہچان پائیں گے۔ آخر میں بس اتنا کہوں گی کہ عورت صرف بہن بن کر نہیں رہ سکتی اسے ساتھی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے کل ہی تمہارا پتا تمہارے چچا سے حاصل کیا تھا اس امید پر کہ تم کو ایک نظر دیکھنے پاکستان جاؤں مگر افسوس میں جا نہیں پاؤں گی اس لیے کہ مجھے اپنی موت سامنے کھڑی نظر آرہی ہے اور مجھے میں مزید سانس لینے کی آرزو بھی نہیں ہے، بغیر بیٹے کے جی کر کیا کروں گی۔۔۔۔۔۔ بس ایک آرزو ہے میں نے آپ پر ایک جھوٹا الزام لگایا تھا جس کی وجہ سے میں ہر قدم پر ٹھوکر کھا رہی ہوں، مجھے معاف کردینا۔"

خط ختم کرتے کرتے میں بری طرح دل برداشتہ ہوگیا۔ ایک لمحہ میں تمام باتیں بھول گیا۔ راحیلہ کی زیادتی' اس کی بے غیرتی' اپنی بے عزتی۔ سب کچھ بھول گیا۔ اس کی تباہی پر دل

رو اٹھا۔ اپنی بے وقوفی میں اس نے اپنی زندگی برباد کردی تھی۔ اگر خط صحیح ہے اور وہ مرچکی ہے تو اس کے لیے دعا کرنا ضروری تھا۔ میں نے فاتحہ پڑھنے کے لیے ہاتھ اٹھا دیا۔

دل غم سے بھرا اٹھا تھا۔ میں نے دل پر چھائے بوجھ کو کم کرنے کے لیے باہر کی کھلی ہوا میں جانے کا ارادہ کیا اور گھر سے نکل پڑا اور سیدھے ڈیفنس والی سڑک پر آگیا' ڈرائیو کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ عنبر کے شوخ جملے' چلبلے فقرے دل پر چھائے بوجھ کو کم کردیں گے۔ یوں بھی آج مجھے ان کے یہاں جانا ہی تھا کیونکہ رات میں جو سنا تھا۔ اس کی تشریح خالہ جان کرسکتی تھیں۔ وہ بتاسکتی تھیں کہ موم نے ایسا کیوں سوچا۔ کیوں ایک بھائی کی شادی ایک بہن سے کرنے پر تل گئی ہیں۔

میں اسی سوچ میں ڈوبا ہوا ڈرائیو کرتا رہا۔ کراچی کی سڑکیں بہت احتیاط مانگتی ہیں۔ ہر شخص یہاں جلدی میں نظر آتا ہے۔ قوانین کو کوئی مدنظر ہی نہیں رکھتا اس لیے بہت احتیاط سے کار چلانا پڑتی ہے۔ مگر میں بھی انہی جیسا بن گیا تھا۔ جہاں سے راستہ نظر آتا وہیں اپنی کار داخل کر دیتا۔ یہ تو قسمت اچھی تھی کہ کوئی حادثہ نہیں ہوا اور میں بخیریت عنبر کے بنگلے تک پہنچ گیا۔

مجھے یوں اچانک دیکھ کر سب خوش ہو اٹھے۔ سب سے زیادہ خوش عنبر نظر آئی۔ اس نے اپنی شوخ آواز میں کہا" زہے نصیب آج صبح ہی صبح آپ کے درشن ہوگئے۔ کہاں بٹھاؤں؟ کہاں جگہ دوں سمجھ نہیں پارہی ہوں۔"

"زیادہ باتیں نہ بنا' جا جاکر شربت لے آ۔ میرا بچہ کتنی دور سے آرہا ہے۔ گلا خشک ہو رہا ہے۔" خالہ نے نصیحت کا پٹارا کھولا ہی تھا کہ عنبر بولی:

"جی ہاں آپ کا بچہ دوڑتا ہوا آیا ہے۔"

"دیکھ میں کہے دیتی ہوں میرے منہ مت لگیو' میں آج ہی تیرے باوا جان سے کہتی ہوں۔ اس کا علاج کرے۔" خالہ چیخیں۔

"اس کی باتوں کو چھوڑیں' یہ بتائیں آپ کیسی ہیں؟" میں نے دونوں کو الجھنے سے روکنے کے لیے کہا۔

"بے فکر رہیں' یہ رکنے والی نہیں ہیں۔" عنبر نے پھر چوٹ کی۔

ابھی یہ چق چق اور چلتی کہ خالو جان کمرے میں آگئے۔

"ارے داؤد! تم کب آئے؟"

"بس ابھی آیا ہوں۔" میں نے مسکرا کر مصافحہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"سنا ہے تم بھی ہندوستان دیکھنا چاہتے ہو۔"

"جی ہاں!" میں نے کہا۔

"مشکور راضی ہو گیا ہے کہ اپنے خرچ پر وہ تمہاری بڑی خالہ کو انڈیا دِکھا دے گا۔ تم بھی تیاری کر لو۔ ایک دو دن میں ویزا لگ جائے گا۔"

مشکور عنبر کے بڑے بھائی تھے۔ وہ بھی عنبر کی طرح خوش مزاج۔ ان سے مل کر بھی بہت اچھا لگا تھا۔ ان کی آفر پر میں نے غور کرنا شروع کر دیا۔ مجھے ویزا لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں برٹش نیشنل جو تھا۔ امیگریشن کاؤنٹر پر پہنچتے ہی انٹری ویزا لگ جاتا۔ اس لیے میں نے بتا دیا کہ اگر ابو اجازت دے دیں تو میں چلا جاؤں گا۔

"ابو میں بھی ایک نظر اس ملک کو دیکھنا چاہتی ہوں جہاں مسلمانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کیا جاتا ہے۔ جس شہر میں مسلمان ترقی کرنے لگتے ہیں کہ وہاں ہندو مسلم فساد برپا کر دیا جاتا ہے۔"

"تم جانا چاہتی ہو تو اپنی امی سے پوچھ لو۔ خرچ میں دے دوں گا۔"

عنبر ساتھ ہو گی' اس بات نے مجھے خوش کر دیا پہلے تو یہ سوچا تھا کہ وقت گزاری کے لیے جاؤں گا مگر اب عنبر کی وجہ سے تو جانا ضروری ہو گیا تھا۔ جیسے ہی خالو جان ہٹے عنبر نے کہا "حضور میں صرف آپ کو کمپنی دینے کے لیے راضی ہوئی ہوں ورنہ اس بھیک منگے ملک میں کون جائے۔"

"ابتدا میں تو میں نے صرف اس لیے ہاں کہا تھا کہ سیر ہو جائے گی مگر اب تو فرض سمجھ کر جاؤں گا۔"

"تو بس تیاری کر لیں بہت جلد سواری نکل پڑے گی۔ مشکور بھائی جب کوئی وعدہ کرتے ہیں تو سمجھ لیں وہ ضرور پورا کرتے ہیں۔"

"چلو ان کی دریا دلی ہم بھی دیکھ لیتے ہیں۔" کہہ کر میں اس کی امی سے ملنے کے لیے ان کے کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ کافی دیر گپ شپ رہی مگر میری ہمت نہ ہوئی کہ رات والی بات نکالوں۔ سوچ لیا کہ جب ابو یا موم نے خود چھیڑا تو جواب دے دوں گا۔ شام ڈھلے واپسی ہوئی تھی۔

ابھی میں کچھ ہی دور گیا تھا کہ رابیل آتا ہوا نظر آیا۔ اسے دیکھتے ہی میرے ہونٹوں پر

مسکراہٹ آ گئی، اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ میرے پاس آ کر رک گیا پھر بولا "یہ لندن والے لوگ کہاں گھوم رہے ہیں؟"

"بس یوں ہی وقت گزاری کے لیے گھر سے نکل آیا۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ سے باتیں کر کے اچھا لگا تھا۔ پلیز اب آپ خالو جان کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔ آپ کے بغیر وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کرتے ہیں۔ یوں بھی اس عمر میں بیٹے کی بہت ضرورت محسوس ہوتی ہے۔" وہ کسی اچھے مقرر کی طرح بول رہا تھا۔

"اب میں آ گیا ہوں نا' اب انہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔" میں نے کہا۔

"میرا یہی مشورہ ہے' اس لیے بھی کہ میں نے دنیا کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ لوگوں کی روباہی دیکھی' چالاکی اور مکاری دیکھی۔ ایک چہرے پر کیسے کئی چہرے لوگ سجائے لیتے ہیں یہ دیکھا گویا ہمارے تجربے کا نچوڑ یہی ہے کہ آپ خالو کا سہارا بنے رہیں۔"

"انشاءاللہ اب آپ سب دیکھیں گے کہ میں کیسے ابو کو آسائش بھری زندگی دیتا ہوں" میں نے فخر سے کہا کیونکہ مجھے مستقبل کا پتا جو نہیں تھا۔

"جی ہاں' اب آپ لندن جانے کا سوچیں گے بھی نہیں۔"

"جی ہاں!" میں نے جواب دیا۔

"آپ خود سوچیں وہ خود کو کتنا اکیلا سمجھتے ہوں گے' کوئی بیٹا جو نہیں ہے۔"

اس بات نے میرے ذہن میں اس رات والی بات تازہ کر دی۔ ایسی کیا وجہ ہے جو موم نے ابو سے کہا کہ وہ فہمیدہ کو' میری بہن کو میری دلہن بنا دیں۔ مجھ سے بہن کی شادی کرانے پر تل گئیں ہیں۔ ایسا کیوں' کیا فہمیدہ میری بہن نہیں ہے؟ کیا وہ ابو کی بیٹی نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ شخص دے سکتا ہے۔ اسی سوچ کے تحت میں نے اس سے کہا "اگر مناسب سمجھیں تو میرے ساتھ چل کر ایک کپ چائے پی لیں۔"

"کیوں نہیں' آپ کی دعوت کو ٹھکرانا عنبر کو ناراض کرنا ہے' اس دن ہی میں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ آپ کو خاص اہمیت دے رہی ہے۔ پھر چچی جان کے ہر رشتے دار کو میں خاص اہمیت دیتا ہوں' وہی ایک تو ہیں جنہوں نے میری خاطر سب سے لڑائی مول لی۔ ان کا احسان میں چکا نہیں سکتا۔" اس نے معصوم سے لہجے میں کہا۔ وہ کسی رخ سے مجھے ہیروئین کا عادی نہیں لگ رہا تھا اور نہ وہ کوئی تیز مزاج یا بدمعاش۔

میں اسے لے کر نزدیکی ریسٹورنٹ میں آیا۔ ایسے ریسٹورنٹ میں لوگ کم کم ہی آتے ہیں۔ شاید چیزوں کی قیمت زیادہ ہونے کی وجہ سے۔ اس وقت بھی بہت کم لوگ نظر آرہے تھے اس لیے میں اسے یہاں لے کر آیا تھا۔ کونے کی ایک خالی میز دیکھ کر میں ادھر ہی بڑھتا چلا گیا۔ پھر میں نے پوچھا۔ ''کچھ کھانے کا ارادہ ہے؟ منگوالوں؟''

''آپ مہمان ہیں آپ بل نہیں دیں گے تو منگوا سکتے ہیں؟'' اس نے صاف جواب دیا۔

''مگر لے کر میں آیا ہوں اس لیے بل دینا میری ہی ذمے داری ہے' آپ صرف آرڈر دیں گے۔'' کہہ کر میں نے بیرے کو اشارہ کیا۔ وہ مینو لے کر آ گیا۔ میں نے مینو نوٹ کرایا پھر بولا ''ایک بات پوچھوں آپ برا تو نہیں مانیں گے؟''

''یقیناً آپ پوچھیں گے کہ عنبر نے مجھے ہیروئین کا عادی کیوں کہا تو سن لیں اس نے غلط نہیں کہا میں ہی نہیں میری بیوی بھی عادی تھی۔''

''گویا اب آپ نے اس سے نجات حاصل کر لی۔''

''جی ہاں مگر ایک آگ کا دریا تھا جسے ہم نے پار کیا' آپ فلمیں دیکھتے ہیں؟''

''جی ہاں!''

''میری کہانی بھی کسی فلم کی کہانی جیسی ہیں۔ اور میں بلا جھجک سنا دیتا ہوں۔ اگر آپ کے پاس وقت ہے تو میں سنانے پر تیار ہوں کہ کیسے میں نے شادی کی اور کیوں ہیروئین کا عادی بنا' کیوں جیل یاترا کی۔''

کسی سے کوئی راز کی بات معلوم کرنا ہو تو پہلے اس کے دل میں جگہ بنانی پڑتی ہے اسی لیے میں نے اس کی کہانی سننے پر خود کو راضی کر لیا اور اثبات میں جواب بھی دے دیا۔

''تو سنیں میں ایک ایک بات جزیات کے ساتھ سنا دیتا ہوں۔ اس دن میں ڈیوٹی سے واپس آرہا تھا مگر جیسے ہی گلی میں داخل ہوا ٹھٹھک کر رک گیا۔ میری نظریں اس پر جم گئیں۔ اس وقت میری کھلتی ہوئی عمر تھی۔ ایسی عمر جو خرمستیوں پر اکساتی ہے۔ لیکن امی کی بندشوں اور بے جا سختیوں نے میرے اندر سنجیدگی پیدا کر دی تھی۔ میں نے بچپن سے سیدھے بڑھاپے میں چھلانگ لگائی تھی۔ اسی لئے ہر بات کو عقل کے میزان پر تولنے کی عادت تھی پھر بھی میں ٹھٹھک گیا تھا۔ گلی کے موڑ پر آتے ہی میری نگاہیں اس کار پر جم گئی تھیں۔ کار میں روشنی تھی' اندر ایک نوجوان لڑکی بیٹھی تھی۔ کار کا بونٹ کھلا ہوا تھا اور سرخ کپڑوں میں ملبوس ایک دوسری نوخیز لڑکی بونٹ پر جھکی

ہوئی تھی' لیمپ پوسٹ کی ٹمٹماتی روشنی میں' میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ لڑکی کسی ماڈرن گھرانے کی ہے۔ اس کے کپڑے بھی میرے خیال کی تائید کر رہے تھے۔ ایسے جدید تراش کے کپڑے اس گلی میں شاید ہی کوئی پہنتا ہو۔ ان کپڑوں کی وجہ سے اس کا حسن کھل اٹھا تھا۔ اس نے ایک پل کے لئے میرے طرف دیکھا اور وہی لمحہ مجھ پر بجلی بن کر گرا تھا۔ دل بڑے زور سے دھڑکا تھا اور پہلی بار کسی میں دلچسپی لینے کے لئے مچلا تھا۔

لڑکیاں میں نے ہزاروں دیکھی تھیں۔ اچھی بھی اور بری بھی۔ ان کی نگاہوں کو پیروں سے لپٹتے ہوئے بھی محسوس کیا تھا۔ مگر کبھی رکا نہیں' کسی میں دلچسپی نہیں لی ایک پولیس آفیسر کے پاس ان فالتو باتوں کے لئے وقت ہوتا ہی کب ہے۔ جب تک کالج میں رہا امی کی نگاہیں محاسبہ کرتی رہیں اور جب پولیس انسپکٹر بنا تو ذمے داریوں کے احساس نے موقع نہ دیا۔ یہ تو پہلا موقع تھا جب میرے دل میں ہوک سی اٹھی تھی۔ کوئی میٹھی گدگدی سی مچا گیا تھا۔ بالکل فلمی انداز تھا۔ مگر ابھی تک دلچسپی یک طرفہ تھی۔ میں بونٹ پر جھکی لڑکی کے کھلے ہوئے کمر تک جھکے بالوں کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ واقعی شاعروں نے صحیح لکھا ہے بال ہوتے ہی ہیں ناگن جیسے۔ ایک نظر میں ڈس لیتے ہیں' اس کے بال تو جوانی کے خطرناک موڑ کی طرح خم کھائے ہوئے تھے اور ایسے گھنے سیاہ تھے کہ اس تاریک صحرا میں کوئی بھی مسافر راستہ بھٹک سکتا ہے۔ پتا نہیں کس کی قسمت میں اس کنواری زلفوں کی خوشبو ہوگی' کون خوش نصیب ان زلفوں کی چھاؤں میں رات بسر کرے گا۔ کسے زلفوں کی سیج نصیب ہوگی؟ میں تو ایسا خوش نصیب نہیں ہوں۔ ابو امی رہتے تو شاید کوشش کرتے۔

ابھی میں سوچ رہا تھا کہ نقرئی گھنگرو بج اٹھے۔ ''سنیے!''

''جی!'' میں نے تابعداری کے انداز میں کہا اور تقریباً دوڑتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ اس وقت مجھے کوئی دیکھ لیتا تو یقیناً ہنستا۔ ایک پولیس انسپکٹر بچوں جیسی حرکت کرے گا یہ تعجب کی بات تھی مگر دل تو ہوتا ہی ہے عقل کا اندھا۔ فوراً دماغ پر پردہ ڈال دیتا ہے۔

''ذرا ہماری مدد کریں نا۔ پتا نہیں کیا خرابی ہو گئی ہے؟'' کھڑکی سے جھانکنے والی نے کہا۔

میں بونٹ پر جھک گیا۔ اسی وقت میری گردن پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ کھڑی ہتھیلی کا بھرپور وار ہوا تھا۔ میں تیورا کر گرا تھا اور دھیرے دھیرے میرے حواسوں کے چراغ گل ہو گئے تھے۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے پایا۔ میرے جسم پر نہ ہی شرٹ تھی نہ بنیان۔ میں نے گھبرا کر سامنے دیکھا۔ وہی لڑکی ہاتھ میں شیشے کا جگ لیے کھڑی تھی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اسی جگہ سے مجھ پر پانی پھینکا گیا تھا۔ چہرے کے ساتھ میرا سینہ بھی تر تھا۔ سینے پر پھیلے چھوٹے چھوٹے گھونگریالے بالوں میں پھنسی پانی کی بوندیں سرسراتی ہوئی، گدگدی پیدا کرتی نیچے گر رہی تھیں۔

میں نے گھبرا کر کھڑے ہونے کی کوشش کی اور لڑکھڑا گیا۔ میرے دونوں پیر کھڑکی کے پائیوں سے بندھے تھے۔

"کوشش کرنا فضول ہے!" لڑکی نے چڑانے والے انداز میں کہا۔ "ہم نے فقط حفظ ماتقدم کے طور پر تمھارے پیر باندھ دیے ہیں تاکہ تم یکا یک حملہ نہ کر دو۔"

"ایسا کیوں۔ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"صبر میری جان صبر، ہم نے تمھیں شادی کے لئے اغوا کیا ہے۔"

"آں! شادی کے لئے؟" میرے لہجے میں حیرت تھی۔

"جی ہاں۔ ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ عورتیں کسی سے پیچھے نہیں ہیں وہ ہر کام کر سکتی ہیں جس پر تم مردوں کی اجارہ داری ہے۔"

"یہ تو سراسر غنڈہ گردی ہے۔"

"ہاں ہاں، یہ غنڈہ گردی ہی سہی، لیکن ہم کھل کر تو سامنے آئے ہیں۔ تم مردوں کی طرح میٹھی چھری سے تو ذبح نہیں کرتے۔" اس نے ایک ایک بات کو چبا چبا کر کہا۔

میں نے لڑکی کے چہرے پر نظر ڈالی۔ جوش و جذبات سے لڑکی کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ گورے مکھڑے پر جوش کی لالی نے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔ پیشانی پر پڑے بلوں نے بھوؤں کو کڑکتی کمان بنا دیا تھا۔ تراشیدہ ہونٹ کے کنارے پھڑک رہے تھے۔ تقریباً چیخنے کے انداز میں بول رہی تھی۔ "تم مردوں نے الفاظ کے تسمے سے عورت کو باندھ رکھا ہے۔ ہر دور میں عورت اسی ہتھیار سے شکار ہوئی ہے۔ پیار کی زنجیر پہنا کر انھیں قیدی بنایا گیا ہے۔ قیدیوں کو ہتھکڑی، بیڑی پہنائی جاتی ہے کمر میں رسہ باندھا جاتا ہے۔ انہی چیزوں کو خوبصورت بنا کر کڑے، بالے اور چوڑیوں کا نام دیا گیا ہے۔ بیڑی کی جگہ پائل، پازیب، جھانجر، توڑا۔ کمر کے رسے کی جگہ کمر بند، کمر زیب، جوشن یا پٹکا پہنا دیا جاتا ہے۔ کیا یہ غلامی کی نشانیاں نہیں ہیں؟"

"یہ سارے زیور تو سہاگ کی نشانی ہیں اور سہاگن بنانے کے لئے عورت کی رضا مندی لازمی ہے اسی لئے اسلام نے عورت کی رضامندی لینے کا حکم دیا ہے۔"

"عورت نے غم سے ہچکی لی اور تم مردوں نے اسے رضامندی کہہ دیا۔ کبھی کسی عورت کے دل میں جھانک کر دیکھا ہے کہ وہ راضی ہے یا نہیں! اس کے بھی تو خواب ہوتے ہیں۔"

"محترمہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔" میں نے باتوں میں پھنسا کر رسی ڈھیلی کرنا چاہی۔

"لیکن عورت کی چھوٹی سی غلطی کو شاذ و نادر معاف کیا جاتا ہے۔ اگر ہلکی سی لغزش ہو جائے تو فوراً لات ماردی جاتی ہے۔ ذرا سی شکل میں نقص دیکھا اور انکار کر دیا۔ میں پوچھتی ہوں یہ دق زدہ لڑکے کس منہ سے خوبصورت لڑکیوں کی مانگ کرتے ہیں۔ میری سہیلی جمیلہ کا جرم یہی ہے کہ وہ کالی ہے اس لئے کوئی رشتہ بھی نہیں بھیجتا۔ اس سے تم شادی کرو گے تم۔" لڑکی نے میرے سینے کی جانب اشارہ کیا۔ "ورنہ تمھاری زندگی تمھاری اس شرٹ کی طرح کالی بنا دوں گی۔" لڑکی نے میری شرٹ کو اٹھا کر دکھایا۔ "یہ تو تمھیں ڈکی میں ٹھونسنے کی وجہ سے کالی ہوئی ہے مگر تمھاری زندگی میرے ہاتھوں کالی ہو جائے گی۔"

لڑکی کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ کچھ بھی کر گزرنے کے لئے تیار ہے۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں؟ کیسے اس پاگل لڑکی کے چنگل سے آزادی حاصل کروں۔ تبھی دروازے کا پٹ کھلا اور ایک سانولی سی لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اکھڑے کے بدن کی اس لڑکی کے لباس کو دیکھ کر میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے میں نے گلی میں کار کے اندر بیٹھے دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور لڑکی تھی۔ وہ کچھ زیادہ ہی تندرست تھی۔ فٹ بال کی طرح لڑھکتی ہوئی داخل ہوئی تھی۔ اور اندر آتے ہی ٹھسا مار کر زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ "ارے جمیلہ ذرا پانی تو پلانا۔ گلا سوکھنے لگا ہے۔"

"موٹی تجھے کھانے پینے کے علاوہ بھی کچھ آتا ہے؟" اسی لڑکی نے طنزیہ کہا۔

"تو چپ رہ آصفہ کی بچی!" موٹی نے جھلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"خدا کے لئے آصفہ اب کچھ نہ کہنا ورنہ خوہ مخواہ یہ کمرا میدان جنگ بن جائے گا۔" جمیلہ نے مجھ سے سوال و جواب کرنے والی لڑکی سے کہا۔

"تم جس کام کے لئے گئی تھیں وہ کر آئیں؟ مولوی کو لائی ہو؟" آصفہ نے جمیلہ سے پوچھا۔

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"کیوں کہ یہ بے چارہ مظلوم ہے۔" اس نے میری جانب اشارہ کیا۔

اس کی بات پر میں چونک گیا اور جمیلہ کے چہرے کو سوالیہ انداز میں گھورنے لگا۔

"مرد کبھی مظلوم نہیں ہوتے۔" آصفہ غرائی۔

"مگر یہ مظلوم ہے۔" جمیلہ بولی۔ "تم بھی صادقہ کی اس خوبی سے آگاہ ہو کہ وہ ہر کسی کے پیٹ کی بات معلوم کر لیتی ہے۔ منصوبے کے مطابق جب ہم اس کے محلے میں معلومات حاصل کرنے پہنچے تو پتا چلا کہ یہ شفاعت کا بیٹا نہیں ہے۔"

میں اچھل پڑا۔ یہ اطلاع میرے لئے بالکل نئی تھی۔ بچپن سے جسے میں اپنا باپ سمجھتا آیا تھا۔ جس کی گود میں ہمکتے ہوئے میرا بچپن گزرا۔ جس نے اپنے خون پسینے کی کمائی سے مجھے افسر بنایا' وہ میرا باپ نہیں ہے۔ یہ اطلاع بالکل عجوبہ سی لگی۔

"اس کا باپ کون ہے؟" آصفہ نے پوچھا۔

"ندیم' اس کے باپ کا نام ندیم ہے اور وہ ترکی میں رہتا ہے۔ دس سال سے وہیں ہے۔"

"اور ماں؟ کیا وہ عورت جو شفاعت کے ساتھ رہتی تھی وہ بھی اس کی ماں نہیں ہے؟

"ہاں! رابیل کی ماں کوئٹہ میں ہے۔"

"بات پلے نہیں پڑی۔" آصفہ نے کہا۔

"صادقہ نے اب تک جو معلومات جمع کی ہیں اس کے مطابق رابیل کی ماں کا نام نوراں ہے۔ وہ لاہور کے موچی دروازے کے رہنے والی ہے۔ شفاعت کی بیوی بھی اسی محلے کی ہے۔ دونوں میں بڑی دوستی تھی۔ شادی کے بعد دونوں سہیلیاں بچھڑ گئیں۔ شادی کے بعد وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملتان چلی گئی۔ اسی دوران میں نوراں کا نکاح بھی ہو گیا۔ محمد عمر نامی لڑکے سے اسے منسوب کیا گیا تھا۔ عمر کراچی میں رہتا تھا۔ نوکر پیشہ تھا۔ سال میں دو تین بار ہی گھر جاتا۔ ایک بار وہ لاہور آیا تو اپنے سسر سے ملنے ان کے گھر بھی پہنچا مگر وہ گھر میں نہیں تھے۔ اور نوراں اکیلی تھی۔ اکیلے گھر اور تنہائی کا عمر نے فائدہ اٹھانا چاہا۔ نوراں نے شوہر کی مرضی کے آگے سر جھکا دیا۔ اس کے پیر بھاری ہو گئے تھے۔ یہ خبر جب نوراں کے سسرال پہنچی تو ان لوگوں نے آسمان سر

پر اٹھا لیا۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ نوراں بدکردار ہے۔ کسی اور کا گناہ عمر کے سر تھوپ رہی ہے۔ عمر باپ کے غصے کو جانتا تھا۔ اس نے باپ کے حکم پر نوراں کو طلاق بھیج دی۔ وقت کافی گزر چکا تھا۔ ڈاکٹروں کے بہت اصرار کے باوجود بھی خطرہ مول لینے سے انکار کر دیا مجبوراً وہ اس معصوم کا انتظار کرنے لگی۔ لیکن پریشان بھی تھی۔ بچے کا کیا ہوگا؟ اس خیال سے نوراں ہر وقت روتی رہتی۔ اسی دوران میں شفاعت کی بیوی کو ڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ کبھی بھی ماں نہیں بن سکے گی۔ اس مسئلے کا حل اس نے یہ نکالا کہ اس بچے کو گود لے لیا۔ رابیل ہی وہ بچہ ہے۔"

میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اپنی کہانی سے میں خود ہی بے خبر تھا۔ جسے اپنا سب کچھ سمجھے بیٹھا تھا وہ میرے کچھ بھی نہ تھے۔ ابھی خیالات کے گرداب چکر ہی دے رہے تھے کہ آصفہ کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ جمیلہ سے مخاطب تھی۔ "اگر یہ مظلوم ہے تو اس کی مدد فرض ہے فوراً مولوی کو بلاؤ۔"

"کیوں؟" جمیلہ نے پوچھا۔

"تم سے نکاح پڑھایا جائے تاکہ تم اس کے زخم پر پھایا رکھ سکو۔"

"اے ہے رے ہمدرد' خوب ہمدردی جتا رہی ہو۔ ایسے لڑکے کو بے چاری جمیلہ کے گلے منڈ رہی ہو جس کے باپ کا ہی پتا نہیں ہے۔" صادقہ نے ہاتھ نچا کر کہا۔

"تو چپ رہ موٹی' یہ اپنا راز چھپائے رکھنے کے لئے جمیلہ کے آگے کبھی سر نہیں اٹھائے گا۔"

"عقل کی دم' تو خود کر لے تجھے ہی ایسا شوہر مبارک۔"

دونوں عورت تھیں۔ ان کی جبلت عود آئی تھی۔ ساری ڈگریاں دھری رہ گئی تھیں۔ مردانہ پن کے دعوے ہوا ہو گئے تھے۔ اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے وہ کنجڑنوں کی طرح لڑے جا رہی تھیں۔

"خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ۔" جمیلہ نے کہا۔

"اسے خاموش کر۔ اس موٹی کو چپ کرا۔" آصفہ گرجی۔

"خدا کے لئے صادقہ چپ ہو جاؤ!" جمیلہ نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"ٹھیک ہے میں چپ ہو جاتی ہوں مگر اسے شادی کرنی ہوگی۔"

"ہاں ہاں میں شادی کروں گی۔ بلاؤ مولوی کو۔" آصفہ گرجی۔

"میں ابھی لے کر آتی ہوں۔ گردن سے پکڑ کر لاؤں گی۔" صادقہ جھٹکے سے کھڑی ہوگئی۔

"تم گواہ رہنا جمیلہ اگر اس نے نہ کی تو میں اس کی گردن توڑ دوں گی۔" بکتے جھکتے صادقہ باہر نکل گئی۔

کچھ دیر بعد لوٹی تو اس کے ساتھ ایک مولانا تھے۔ سیاہ شیروانی' دوپلی ٹوپی' بغل میں رجسٹر' ہونٹ پان کی لالی سے سرخ۔ اندر داخل ہوتے ہی ٹھٹک گئے۔ انھوں نے ایک نظر لڑکی پر ڈالی اور پھر رابیل کی طرف متوجہ ہوگئے۔ "اے میاں یہ کون سی شرافت ہے لڑکیوں کے سامنے ننگے بیٹھے ہو۔"

"اے بڈھے یہ ننگا نہیں ہے اسے گرمی لگ رہی ہے اس لیے شرٹ اتار دی۔" صادقہ نے کہا۔

"کیا گرمی سر پر بھی چڑھ گئی ہے جو اس کے پیر بندھے ہیں۔" مولانا نے طنز کیا۔

"اے مولانا' زیادہ باتیں نہیں، نکاح شروع کرو۔" آصفہ نے جھڑکا۔

"اے کیسے پڑھا دوں؟ آں۔ نکاح ہے کوئی کھیل نہیں۔ گواہ لاؤ' دلھن دولھے کو لاؤ۔" مولانا بولے۔

"گواہ یہ دونوں ہیں۔" آصفہ نے جمیلہ اور صادقہ کی جانب اشارہ کیا۔

"آں' یہ گواہ ہیں؟ ارے بے وقوفوں عورت کی گواہی آدھی ہوتی ہے۔ مرد گواہ لاؤ۔"

"صادقہ! دو بندے پکڑ لا۔" آصفہ نے حکم دیا۔

"ابھی لائی۔" وہ باہر نکل گئی۔

"دلھن دکھاؤ تم سب خطرناک نظر آرہی ہو کہیں کسی کو اغوا کر کے تو نہیں لے آئیں۔"

"دلھن میں خود ہوں۔" آصفہ نے کہا۔

"آں!" مولانا اچھل پڑے۔ "اور دولھا؟"

"دولھا یہ بندھا بیٹھا ہے۔" آصفہ نے اشارہ کیا۔ "تم نے صحیح سمجھا ہے ہم اسے اغوا کر کے لائے ہیں۔"

"یا اللہ' کیا یہ آخری وقت ہے قیامت آنے والی ہے کیا؟" مولانا نے چھت کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "جو لڑکیاں لڑکے کو اغوا کرنے لگیں۔"

میں خاموش تھا۔ انھیں ٹک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ جمیلہ کی کہانی نے مجھے گونگا بنا دیا تھا۔ میں سب کچھ سن رہا تھا پر بولنے سے قاصر تھا۔ تبھی آصفہ بولی۔ "اے مولانا خطبہ شروع کرو' گواہ آتے ہوں گے۔"

"جبریہ نکاح پڑھانا جرم ہے۔" مولانا بولے۔

"جرم کے بچے میں ابھی تجھے جرم بتاتی ہوں۔" آصفہ اچھلی' ہوا میں قلابازی کھاتے ہوئے اس کے پیچھے پہنچی اور ایک زوردار لات اس کے کولھے پر ماری۔ مولانا قلابازی کھا کر دور جا گرے۔

"سن اوئے مولانا' میں کراٹے میں بلیک بیلٹ ہوں۔ زیادہ چوں چرا کی تو پیر توڑ کر ہاتھ میں دے دوں گی۔"

مولانا کا رنگ فق ہوگیا۔ چہرہ خون کا آئینہ بن گیا تھا جسم تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ وہ ایسے سے حالات کب دوچار ہوئے تھے۔ وہ سہم کر ان لڑکیوں کے اشاروں پر معمول کی طرح عمل کرنے لگے "لو گواہ بھی آگئے۔" صادقہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ چہرے سے وہ مزدور لگ رہے تھے۔ عسرت کی زندہ تصویر تھے۔

"لو مولانا گواہ لے آئی۔" صادقہ نے ایک کی گردن پر ہاتھ رکھ کر آگے دھکیلا۔

"گواہ' لیکن مجھے تو آپ مزدوری کے لئے لائی ہیں۔" ایک نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

"گواہی تو تیرا باپ بھی دے گا۔" صادقہ نے اس کی پیٹھ پر دھول جمایا۔ اس وقت پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ یہی وہ موٹی ہے جو گوشت کا پہاڑ بن کر سست پڑی رہتی تھی۔ اس وقت اس کی پھرتی دیدنی تھی۔ خونی خواتین کا نرغہ' ان کے بگڑے تیور اور مولانا کے چہرے پر اڑی ہوائیاں دونوں مزدوروں کا حوصلہ پست ہوگیا۔ انھوں نے ہتھیار ڈال دیا۔

مولانا نے خطبہ پڑھا اور نکاح ہوگیا۔ اس پورے ڈرامے میں میرا کردار بت کا رہا۔ میں خاموش بیٹھا دیکھتا رہا۔ تیسری بار پوچھنے پر میں نے "قبول ہے۔" کہا تھا۔

نکاح کے فوراً بعد گواہان اور مولانا کو پیسے دے کر بھگا دیا گیا۔

"اے' تم کیسی دلھن ہو' شوہر سے باتیں کرو نا۔" صادقہ نے چھیڑا۔

"سنو مسٹر رابیل اب تم میرے شوہر ہو' میرے مجازی خدا مگر صرف نام کے۔ میرے مزاج کے خلاف کچھ بھی نہیں کرو گے۔ مجھ سے پوچھے بغیر ڈیوٹی پر بھی نہیں جاؤ گے۔ جب تک

میری مرضی نہ ہو میرے قریب بھی نہ آؤ گے۔ اب تم جا سکتے ہو۔''

آزادی کی نوید بھی میرے حواسوں کو لوٹا نہ سکی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری کہانی اتنی پُر درد ہوگی۔ میں معاشرے کے لئے گالی ہوں۔

''مسٹر رابیل' آپ کو شاید میری باتوں سے دکھ پہنچا ہے۔'' گلیارے میں روک کر صادقہ نے کہا۔

''آں!'' میں نے چونک کر کندھے سے اس کا ہاتھ ہٹایا۔

''آپ بے فکر رہیں۔ میں جو چاہتی تھی وہ ہو گیا۔ میں آصفہ کے عہد کو توڑنا چاہتی تھی' سو توڑ دیا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ شادی نہیں کرے گی مگر میں نے اسے مجبور کر دیا۔ میں نے جمیلہ کے ساتھ مل کر جو منصوبہ بنایا تھا وہ کامیاب رہا۔ ابھی ہم نے آپ کے متعلق جو کہانی سنائی تھی وہ صد فیصد جھوٹ تھی۔ صرف آصفہ کو اکسانے کے لئے سنائی تھی۔ آپ شفاعت صاحب ہی کے بیٹے ہیں''۔

''کیا؟'' آصفہ اچھل پڑی۔

''ہاں وہ کہانی جھوٹی تھی...... صرف تجھے غصہ دلانے کے لئے گھڑی تھی تاکہ تو جوش میں آجائے۔''

میرے چہرے پر شادابی لوٹ آئی۔ ''اچھا.... میں تو بری طرح ٹوٹ چکا تھا' کون مرد ایسی گالی سہے گا۔''

''ہاں ہاں یہ گالی بھی تو عورت کے لئے منسوب ہے۔ فعل بد تو خود کریں لعنت کریں شیطان پر۔'' آصفہ بپھر اٹھی۔

''تمہاری یہی بات غلط ہے۔ ہر معاملے کو تم عورت کی مظلومی کے چشمے سے دیکھتی ہو۔'' جمیلہ نے سمجھانا چاہا۔

''اور کیا' سارا ہی قصور مردوں کا ہوتا ہے' عورت مظلوم ہے اس لئے اس پر الزام دھر دیتے ہیں۔ دیکھ لینا میں اسے کس طرح غلط ثابت کرتی ہوں۔ رابیل کی زندگی اجیرن نہ کر دی تو کہنا۔''

''بی بی! تم بھول رہی ہو مرد جب چاہے عورت کو طلاق دے دے۔''

''ہاں ہاں اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے ہو جب دل بھر جائے طلاق دے دو۔ غلطی کا احساس ہو جائے تو بلالو مگر حلالہ کرا کر اور حلالہ عورت کو ہی کرانا پڑتا ہے۔''

''حلالہ اس لئے کرانے کا حکم ہے کہ زندگی بھر مرد پشیمان رہے کہ اس کی بیوی کچھ دنوں کے لئے کسی دوسرے کی بھی ہو گئی تھی۔'' میں نے سمجھانا چاہا۔

''میرا دماغ مت چاٹو۔ اب جاؤ جب میرا دل ہوگا بلالوں گی۔'' آصفہ نے جھڑکا۔

جمیلہ اور صادقہ نے آصفہ کی تائید کی تھی۔ مجبوراً میں باہر نکل آیا۔ نکلنے کے بعد باہر رُک کر اس مکان کو بغور دیکھا تھا۔ اس مکان کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہتا تھا۔

اس رات میں کافی دیر تک جاگتا رہا۔ سوچتا رہا کہ ان نفسیاتی مریضوں کو کیسے راہ راست پر لاؤں۔ ان کے خود پسندی کے خول کو کیسے توڑوں کیونکہ آصفہ کیلئے بھلے ہی وہ ایک کھیل ہو مگر میرے لئے احکام شرع تھا' باضابطہ نکاح تھا۔ وہ میری بیوی بن چکی تھی۔ اسے راہ راست پر لانا میرا فرض تھا۔

میں ایک ہفتے سے آصفہ کو تلاش کر رہا تھا۔ اس مکان پر بھی گیا تھا جہاں مجھے لے جایا گیا تھا مگر وہ مکان خالی ملا تھا۔ لڑکیوں نے اسے کرائے پر حاصل کیا تھا۔ ایک اسٹیٹ ایجنسی والے نے مکان دلوایا تھا اسی لئے مکان مالک بھی لڑکیوں کا پتا نہ بتا سکا۔

اس دن بھی میں تھانے میں بیٹھا آصفہ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

''ہیلو!'' میں نے ریسیور اٹھا کر کہا۔

''میں لٹ گیا۔ جلدی آؤ۔ پورے بارہ لاکھ لوٹ لئے۔'' دوسری جانب سے گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟''

''میں ابراہیم شاہ ہوں بھئی ابراہیم شاہ۔ جیمس اینڈ جیولری کا مالک۔'' وہ بے ربط انداز میں بولا۔

''آپ فکر نہ کریں میں فوراً پہنچ رہا ہوں۔'' میں نے جیمس اینڈ جیولری نامی دکان دیکھی تھی۔ کافی بڑی دکان تھی۔ زیورات کی ان گنی چنی دکانوں میں سے ایک تھی جس کے زیورات غیر ممالک میں بھی پسند کئے جاتے تھے جڑاؤ زیورات بنانے میں اس کا ثانی نہ تھا۔ پچھلے

ہی دنوں اخباروں میں پڑھا تھا کہ عرب کے ایک شیخ نے پچیس لاکھ روپے کی منقش کرسی بنوائی تھی۔ اتنی خوبصورت گل کاری کی بنی تھی کہ لوگوں نے دانتوں تلے انگلیاں دبا لی تھیں۔

اس مشہور دکان میں پہنچا تو وہاں پہلے سے ہی انٹیلی جنس کے کئی افسر بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے زمین پر دس لڑکے بیٹھے تھے۔ لڑکوں کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ان کے بٹھائے جانے سے میں نے اندازہ لگایا کہ یقیناً انٹیلی جنس والے مجرم پر ہی ہاتھ ڈالتے ہیں، خاص کر خطرناک مجرموں پر۔ یہ بھی خطرناک مجرم ہوں گے۔

میں نے خطرناک کتے دیکھے تھے۔ جب تک وہ آزاد رہتے ہیں خطرہ ہی خطرہ رہتا ہے مگر گلے میں پٹا پڑتے ہی ایسے خاموش ہو جاتے ہیں گویا ازل کے شریف ہوں۔ لڑکوں کے چہرے پر بھی معصومیت کا پرتو تھا مگر مجھے ان پر رحم نہ آیا۔ میں نے بیٹھتے ہی پوچھا۔ "کیا بات تھی؟"

"ان لوگوں نے ہمارے نام پر انھیں دھوکا دیا ہے۔" انٹیلی جنس کے افسر نے کہا۔

میں نے مڑ کر لڑکوں کی جانب دیکھا پھر ابراہیم شاہ سے بولا۔ "آپ واقعہ بتائیے۔"

ابراہیم شاہ نے بتانا شروع کیا۔ "آج صبح جب میں دکان پر پہنچا تو یہ لڑکے آئے۔ ان کے ساتھ تین لڑکیاں بھی تھیں۔ ایک تو بہت خوبصورت تھی۔ گوری رنگت، اونچا پورا قد، گھنے بال، سفید شلوار قمیص پہنے تھی اور بالوں میں کلپ لگائے ہوئے تھی۔"

میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ "میاں تم تاجر ہو یا درزی جو عورتوں کو بغور دیکھ کر پورا ناپ لیتے ہو۔"

ابراہیم شاہ بولے جا رہا تھا۔ "اور دوسری لڑکی اکہرے بدن کی تھی۔ رنگت سانولی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی کپڑوں کا رنگ گلابی تھا۔ اس نے ہائی ہیل کی سینڈل پہن رکھی تھی۔ اور تیسری لڑکی بھاری بدن کی تھی۔ بہت بول رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا اس کے منہ میں لاؤڈ اسپیکر فٹ ہو۔ بڑی پاٹ دار آواز تھی۔"

میں چونک گیا اور جلدی سے بولا۔ "کیا اس کی ناک پر چھوٹا سا مسا تھا؟"

"جی! جی ہاں مسا تھا۔" ابراہیم شاہ نے جواب دیا۔

"آپ اسے پہچانتے ہیں؟" انٹیلی جنس افسر نے پوچھا۔

میرا دل کانپ اٹھا۔ انٹیلی جنس والے جس کے پیچھے پڑ جائیں اسے پاتال سے بھی کھینچ لاتے ہیں۔ یقیناً یہ آصفہ، صادقہ اور بیلا کو نہیں بخشیں گے۔ کوئی گہرا معاملہ ہے جبھی یہ آئے

ہیں۔ انھیں مطمئن کرنا ضروری تھا اس لیے بولا۔ "جی ہاں! ایک روز ویران سڑک پر تین لڑکیاں ایک نوجوان لڑکے کو لوٹنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میری مداخلت کے بعد وہ فرار ہو گئیں۔ مجھے ان پر شبہ ہوا تھا۔ ان کا حلیہ بھی ایسا ہی تھا۔" میں مضطرب تھا پھر میں نے ابراہیم شاہ سے پوچھا۔ "ان لڑکیوں نے کیا کیا تھا؟"

"جناب یہ سب آئے۔ پہلے لڑکی نے اپنا کارڈ دکھایا پھر انھوں نے۔ کارڈ دیکھ کر میں چونک گیا۔ انٹیلی جنس کا کارڈ تھا۔ کہنے لگی ہمیں اطلاع ملی ہے کہ آپ غیر قانونی طور پر ہیرے منگوا رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا تھا آپ خود چیک کر لیں۔ سارے ہیرے ٹیکس پیڈ ہیں۔ ان لوگوں نے فائلوں کی چیکنگ شروع کر دی۔ خوبصورت لڑکی نے تجوری کھلوائی۔ اندر سے ہیروں کی پوٹلی نکلوائی اور اسے دیکھتے ہوئے بولی ان کے کاغذات......؟ میں نے کاغذات دکھائے تو بولی وزن پر مجھے شبہ ہے اسے چیک کرنا ہوگا۔ میں نے کہا چیک کر لیں اور وزن دیکھ لیں مگر وہ نہ مانی کہنے لگی ہمارے ایکسپرٹ تجربہ کریں گے۔ اسے پوٹلی کو اٹھاتے دیکھ کر میں نے دکان سے باہر لے جانے سے منع کیا تو دھمکی دینے لگی پھر اس نے مجھے مطمئن کرنے کے لئے رسید بنا دی اور بولی ہمارے آدمی تاک دیکھ رہے ہیں۔ ہم ابھی آ جائیں گے اور چلی گئی۔ صاحب جی بارہ لاکھ کے ہیرے لے گئی۔" ابراہیم شاہ رونے لگا۔

"ان لڑکوں نے نہیں بتایا کہ وہ کہاں گئیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ سب بدمعاش ہیں۔" جوش میں اس نے ایک لڑکے پر تھپڑ چلا دیا۔

"آرام سے، آرام سے۔" انٹیلی جنس افسر نے روکا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "ان لڑکوں نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ دو دن پہلے انھوں نے اخبار میں اشتہار پڑھا تھا کہ ملک و قوم کی خدمت کے لئے حب الوطنی سے سرشار نوجوانوں کی ضرورت ہے، انھیں جیب خرچ بھی ملے گا۔ یہ لڑکے بے کاری میں وقت گزار رہے تھے اشتہار پڑھ کر پہنچ گئے۔ انھیں لڑکیوں نے بتایا کہ ان کا تعلق انٹیلی جنس سے ہے۔ وہ صدر کے حکم سے ایک نیا گروپ بنا رہی ہیں۔ اس جانباز گروپ میں نئے افسروں کا تقرر ہوگا۔ ایسے خفیہ کام کے لئے کھلا اشتہار دیا نہیں جا سکتا اس لئے مبہم الفاظ کا اشتہار دیا گیا ہے۔ اگر آپ نے حکومت کو مطمئن کر دیا تو آپ کی تنخواہ تیس ہزار روپے ماہانہ ہوگی۔ لڑکے خوش ہو گئے۔ انھوں نے گھر میں بھی نہ بتایا کیوں کہ رازداری شرط تھی۔ نام نہاد ٹریننگ کے نام پر کچھ دنوں ان سے اچھل کود کروائی اور آج یہ ڈاکا ڈالنے

پہنچ گئے۔"

میں نے دل ہی دل میں آصفہ کی عقل کو داد دی۔ کتنی آسانی سے اس نے بارہ لاکھ کے ہیرے اُڑا لیے۔ لیکن میں نے عہد بھی کر لیا کہ آصفہ کو ہیرے ہضم کرنے نہ دوں گا۔ اگر وہ پاتال میں بھی چھپی ہوگی تو میں اسے باہر کھینچ لاؤں گا۔ لیکن کیسے؟ یہی سوچ رہا تھا۔

"آپ انھیں لے جائیں لیکن ہمیں بھی کچھ سوالات کرنے ہیں اس لیے ہم انھیں واپس لے لیں گے۔" انٹیلی جنس افسر کے کہنے پر میرے خیالات بکھر گئے۔

"جی بہتر ہے۔" میں انھیں لے کر تھانے آ گیا۔

تھانے پہنچنے کے بعد بھی میرے دماغ پر آصفہ سوار تھی۔ اسے گرفتار کرنے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا کہ کمال کا نام میرے ذہن میں گونجا۔

کمال مقامی روزنامے میں کرائم رپورٹر تھا۔ اس کے ذریعے میں نے کئی مجرموں کو ان کی پناہ گاہوں سے باہر نکالا تھا۔ اس بار بھی میں نے اس کے ساتھ مل کر ایک ڈراما رچانے کا سوچا اور اسے فون کرنے لگا۔ کمال تو گویا فون کا منتظر تھا۔ فوراً ہی تھانے پہنچ گیا۔ میں نے اسے منصوبہ سمجھا کر وعدہ لے لیا کہ وہ جتنی جلدی ممکن ہو اس خبر کو چھاپ دے۔

اسی دن میری طلبی ہوئی۔ افسرانِ بالا نے مجھے چوبیس گھنٹے کا وقت دیا کہ ان لڑکیوں کو گرفتار کر کے لے آؤں۔ میں نے اپنے منصوبے سے انھیں بھی آگاہ کر دیا۔ منصوبہ اتنا جامع تھا کہ افسرانِ بالا نے بھی اس منصوبے کی توثیق کر دی۔

اگلے دن کے اخبار میں خبر تھی۔ "جیمس اینڈ جیولری میں لگے ہوئے خود کار کیمرے نے دھوکے باز حسیناؤں کی تصویر اتار لی ہے۔ وہ تصویر اس وقت انسپکٹر رابیل کے پاس ہے مگر انھوں نے ابھی تک کسی کو دکھائی نہیں ہے۔ اپنے افسران کو بھی اس کی ہوا لگنے نہیں دی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ مجرموں کو بچانا چاہتے ہیں۔"

میں جانتا تھا کہ یہ خبر آصفہ کی عقل کو مات دے دے گی۔ اسی لئے میں تھانے نہیں گیا تھا۔ اپنے بنگلے کے برآمدے میں بیٹھا تھا۔ آصفہ مجرم ہے۔ اور مجرم کبھی بھی تھانے میں جا کر باتیں کرنا پسند نہیں کرتے۔ اسے ملنا ہوگا تو میرے گھر آئے گی۔ اس وقت میں اسی کا انتظار کر رہا تھا کہ میری نظر سڑک کے کنارے کھڑے ایک شخص پر پڑی۔ وہ میرے بنگلے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ کچھ مشکوک سا لگا، کون ہے کیا آصفہ کا بندہ ہے؟ ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ فون کا بزر چیخ

اٹھا۔ میں نے اٹھ کر فون ریسیو کیا۔ دوسری جانب سے کمال کی جانی پہچانی آواز آئی۔ "تصویر تمہارے پاس ہے نا؟"

"جی ہاں کہو تو دکھا دوں؟"

"نہیں یار، میرا ایڈیٹر میری جان کھا رہا ہے کہ جھوٹی خبر کیوں لگا دی۔"

"بھئی اسے سمجھا دو کہ افسران بالا کی منشا یہی ہے۔"

"اس کا کہنا ہے کہ عوام کو دھوکا دینا ٹھیک نہیں ہے۔ اخبار سچی خبروں کے لئے ہوتا ہے۔"

"اسے ایک روز سنبھال لو۔" میں نے فوراً لائن کاٹ دی۔ ابھی مڑا ہی تھا کہ بزر پھر چیخا۔ میں نے جھٹکے سے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "اب کیا ہے؟"

"تصویر تمہارے پاس ہے؟"

"کہیے تو دکھا دوں۔" میں نے کہا۔

"ہم آ رہے ہیں بنگلے پر ہی رہنا۔"

"بھئی یہ بھی خوب رہی۔ دلھن خود چل کر دولھا کے گھر آئے۔"

"بکواس نہیں۔" دوسری جانب سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میں پھر آ کر اسی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ایک کار آ کر گیٹ پر رکی، میں نے جا کر گیٹ کھول دیا۔ کار اندر داخل ہوئی اور پورچ میں پہنچ کر رک گئی۔ پہلے آصفہ اتری پھر جمیلہ اور صادقہ۔"

"آیئے اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔" آصفہ بولی۔

دلھن آئے تو دولھا کے گھر اور کہے وقت نہیں۔ یہ تو عجیب سی بات ہے۔" میں نے مصنوعی پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"مذاق نہیں۔" آصفہ نے جھڑکا۔

"مذاق کون کمبخت کر رہا ہے۔ ہم تم تو جیون ساتھی ہیں۔ جنم جنم کا رشتہ ہے۔ تم چور ہو میں سپاہی۔ تم قانون شکن ہو اور میں قانون کا محافظ۔ اسی لئے تو مولانا نے ہم دونوں کو ایک ڈور میں باندھا ہے۔"

"چپل کھینچ ماروں گی۔" آصفہ نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچھل پڑی۔ اگر میں اسے سنبھال

نہ لیتا تو وہ گر پڑتی۔ پستول کے دھماکے نے اسے بوکھلا دیا تھا۔

''سنو مسٹر راتیل میرے آدمیوں نے اس بنگلے کو گھیر لیا ہے۔ فوراً ان لڑکیوں کو میرے حوالے کر دو۔'' پستول تھامے ہوئے ایک شخص نے کہا۔

''کیوں بھائی۔ میری تو بیوی ہے تمہاری کون ہے؟'' میں نے کمال اطمینان سے کہا۔

اس شخص نے دوسرا فائر کیا۔ اس بار بھی نشانہ ہمارے سر پر لٹکتا ہوا فانوس تھا۔

''میرے بھائی خواہ مخواہ کیوں میرے قیمتی فانوس کے دشمن ہو گئے ہو۔ کہیں حرم کی آواز پر کوئی آنہ جائے۔''

سڑک کے دونوں سرے پر میرے آدمی تعینات ہیں۔ رہا پڑوسیوں کا سوال تو جناب یہاں کوئی کسی کے پھڈے میں نہیں پڑتا۔ اخوت بھائی چارے کا زمانہ کب کا لد گیا۔''

''ایسی بات ہے تو یہ لو۔'' کہتے ہوئے میں نے کمال پھرتی سے آصفہ کو کمرے میں دھکا دیا اور خود کو گراتے ہوئے لوٹ لگاتا چلا گیا۔ ہمیں گرتے دیکھ کر آصفہ اور جمیلہ نے بھی چلرز کی آڑ لی تھی۔ پستول ہلاتا ہوا وہ شخص برآمدے کی جانب دوڑا تھا کہ میں نے سیٹی بجا دی لان کی جھاڑیوں کے پیچھے سے کئی پولیس والے نکل آئے۔

''خبردار پستول پھینک دو ورنہ گولی مار دیں گے۔'' ایک سپاہی نے للکارا۔ اس شخص نے گھبرا کر پیچھے دیکھا اور اس پر سکتہ سا چھا گیا۔ آٹھ نالیں اس کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔

''اسے ہتھکڑی لگا کر اندر لاؤ۔'' میں نے ایک سپاہی سے کہا۔

''میں......ہم جا رہے ہیں۔'' آصفہ نے کہا۔

''میری جان! تم کہاں چلیں؟ یہ سپاہیوں کی تعیناتی تمہارے لیے ہی تو تھی۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پٹر پٹر بولنے والی صادقہ نے ہمیں یوں دیکھا گویا سرزنش کرنا چاہتی ہو لیکن کچھ بولی نہیں۔ جمیلہ بھی خاموش تھی۔

''چلو نا۔'' میں نے اسے اندر دھکیلا۔ جمیلہ اور صادقہ بھی ساتھ آگئیں۔ میں نے فریج سے مٹھائی نکالی۔ ان کے سامنے رکھی اور بولا۔ ''پہلے منہ میٹھا کر و تا کہ میں ایک کڑوی خبر سناؤں۔''

تینوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔

''کھاؤ!'' میں دہاڑا۔ ''اس دن تم حکم چلا رہی تھیں آج میرا حکم مانو۔''

تینوں کا ہاتھ چلنے لگا۔ مٹھائی ختم ہوتے ہی میں نے کہا۔ ''میری بیگم جان! اب ہتھکڑی

پہن لو۔'' پھر میں نے سرعت سے پستول نکال لیا اور زور سے پکارا۔ ''انگل خان انہیں گرفتار کر لو۔''

دروازے پر کھڑے پولیس والوں نے اندر داخل ہو کر لڑکیوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگا دی۔

تھانے کے ایک لاک اپ میں وہ شخص بند تھا جس نے مجھ پر فائر کیا تھا جبکہ تینوں لڑکیاں ایک دوسرے کمرے میں رکھی گئی تھیں ان لڑکیوں کو دیکھنے کئی افسران آچکے تھے۔ یہ معمولی لڑکیاں! ایسا معصوم چہرہ اور کرتوت ایسے قابل نفرت! انھیں سب ہی ملامت سے دیکھتے تھے۔ کئی افسروں نے لڑکیوں سے ہیروں کے بارے میں پوچھا! اس دوسرے قیدی کے بارے میں پوچھا لیکن انھوں نے اس بات سے لاعلمی ظاہر کی۔ اس شخص کے بارے میں تو خود مجھے بھی تجسس تھا کہ وہ کون ہے اور انھیں ساتھ کیوں لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے یہی سوال اس شخص سے بھی کیا تھا لیکن اس نے تو خاموش رہنے کی قسم کھائی تھی۔

اس وقت بھی میں اس کے سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا کہ تم کس لئے لڑکی کو لے جانا چاہتے تھے۔ تبھی ایڑیاں بجنے کی آواز سنائی دی۔ سلوٹ کی آواز سنتے ہی میں نے مڑ کر دیکھا۔ آئی جی سلطان کے ساتھ ایک بھاری بدن کا شخص تھا وہ دونوں اندر داخل ہو رہے تھے۔ میں نے بھی سلوٹ کیا۔ وہ جا کر کرسی پر بیٹھ گئے۔

''کیا یہی تینوں لڑکیاں ہیں؟'' آئی جی صاحب نے پوچھا۔

''جی ہاں!'' میں نے جواب دیا۔

ساتھ والا شخص بڑی دلچسپی سے لڑکیوں کو دیکھ رہا تھا۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے آگے بڑھ کر ریسور اٹھا لیا۔ دوسری جانب سے بولنے والے کا نام سنتے ہی اچھل پڑا۔ ''کیا......تم......شیر خان۔''

شیر خان کا نام سنتے ہی آئی جی بھی چونک گئے۔ شیر خان ایک ایسا نام تھا جس سے پورے ملک کی پولیس واقف تھی۔ وہ منشیات کی دنیا کا بے تاج بادشاہ تھا۔

شیر خان پور... [illegible] مطلوب تھا۔ آئی جی نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور تھام لیا اور بولے ''کون ہو تم؟''

میں شیر خان بول رہا ہوں۔ چودھری کو رہا کر دو۔''

''تم جھوٹے ہو۔ شیر خان کا نام لے کر بھی تم کامیاب نہیں ہو سکتے۔''

"اگر تم نہیں چھوڑو گے تو ہم خود رہا کرالیں گے۔ ابھی ایک نوجوان لڑکی آئے گی۔ وہ آکر اسے چھڑالے جائے گی۔" دوسری جانب سے ریسیور رکھ دیا گیا۔

"لگتا ہے کسی بچے نے مذاق کیا ہے۔" کہتے ہوئے آئی جی صاحب باہر نکل گئے۔ جاتے جاتے اپنے دوست سے کہہ گئے تھے کہ وہ بیٹھے۔ راؤنڈ لگا کر اسے لیتے جائیں گے۔ ہم مذاق سمجھ رہے تھے کہ وہ لڑکی پہنچ گئی۔ وہ آئی جی کے ساتھ آنے والے کی بیٹی شگفتہ تھی۔ اس نے آتے ہی کہا۔ "ڈیڈی چودھری کو چھوڑ دیجیے۔"

"تم ہوش میں تو ہو؟"

"جی ہاں! میں بہ ہوش وحواس کہہ رہی ہوں چودھری کو چھوڑ دیجیے ورنہ میں پیپر ویٹ مار کر بلب توڑ دوں گی۔"

پتا نہیں کیوں اس بے تکی بات کا گہرا اثر ہوا۔ آئی جی صاحب کے دوست کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ انھوں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ "اسے چھوڑ دو۔"

آئی جی کے دوست کا حکم۔ اسے ٹالنے کی کس میں ہمت تھی پھر بھی قانون روک رہا تھا۔ ہمیں پس وپیش کرتے دیکھ کر آئی جی کے دوست نے پستول نکال لیا۔ ہم تیار نہ تھے اس نے چودھری کو آزاد کرالیا۔ چودھری کو شگفتہ اپنے ساتھ لے گئی۔

ایک مجرم کی مدد کرنا جرم ہے۔ مجرم کتنا ہی بڑا افسر کیوں نہ ہو۔ قانون اسے معاف نہیں کرتا۔ آئی جی صاحب کے دوست عثمانی پر مقدمہ قائم ہوگیا اور وہ گرفتار ہوگئے۔ انھیں شاہ پور جا کر سے گرفتار کیا گیا تھا۔ وہ بھاگ کر وہاں چھپے ہوئے تھے۔

ان کے جیل جانے سے مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں تو اپنی فتح پر شادماں تھا۔ مجھے جو کامیابی ملی تھی وہ معمولی نہ تھی۔ اتنی بڑی واردات کے مجرموں کو گرفتار کر کے شہرت حاصل کر لی تھی۔ اخبارات نے پہلے صفحے پر تعریفیں لکھی تھیں، مجھے ایک ذہین پولیس افسر لکھا تھا لیکن میں اپنے ذہن کی گتھی کو سلجھا نہیں پایا تھا۔ میرے سامنے عثمانی صاحب کا فعل سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔ یہ بات صحیح تھی کہ وہ اپنی بیٹی کو دل وجان سے عزیز رکھتے تھے لیکن اس کی ایک چھوٹی سی بات پر قانون شکنی کر بیٹھے یہ بات سمجھ سے پرے تھی۔ پھر شگفتہ کی بات مہمل تھی۔ وہ ایک فضول سا جملہ تھا کہ بلب توڑ دوں گی اس جملے میں ایسی کون سی بات تھی۔ جس نے انھیں اتنا بڑا قدم اٹھانے پر مجبور کردیا تھا۔ اس راز کو سمجھنے کے لئے میں ایک دن جیل پہنچ گیا۔ وہ بی کلاس کے قیدی تھے۔

انھیں تمام آسائشیں مہیا تھیں۔ ان سے ملاقات کے لئے جیلر نے الگ کمرے کا انتظام کردیا۔ میں نے پہلا سوال کیا۔

"انکل! آپ میرے افسر کے دوست ہیں۔" میں کچھ دیر کے لیے رکا اور سانس لے کر بولا۔ "ایسی کون سی بات ہے جس نے آپ کو اتنا بڑا قدم اٹھانے پر مجبور کردیا تھا۔ شگفتہ کے جملے میں ایسی کون سی بات پوشیدہ تھی جس نے آپ کو ہلا دیا تھا۔"

عثمانی صاحب خاموش تھے۔ ان کا چہرہ تاریک ہوگیا تھا۔ وہ سر جھکائے کچھ سوچ رہے تھے۔

"بولئے ایسی کون سی بات تھی جس نے آپ کو قانون شکنی پر آمادہ کردیا؟"

"میری زندگی اور موت کا سوال ہے بیٹے اس زخم کو مت کریدو۔ میرے ساتھ تم بھی رو پڑو گے۔ اس جملے میں ہم دونوں کے لئے دھمکی تھی۔ میرے ساتھ تم بھی تباہ ہوجاتے۔"

"میں...... میری تباہی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں...... میں نے تمھیں بہت پہلے پہچان لیا تھا۔ اسی لئے اتنا قریب آیا تھا۔ تم غیر نہیں ہو۔ میرے عزیز دوست کے بیٹے ہو۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ شگفتہ اور تم پھانسی پر لٹکا دیئے جاؤ۔ اگر اس کی بات نہ مانتا پھر بھی میں مجرم ٹھہرا دیا جاتا۔ گھر ایسے بھی تباہ ہوتا ویسے بھی۔ اس لیے میں نے آسان تباہی کا راستہ ڈھونڈ لیا۔" پھر انھوں نے آہستہ آہستہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں میری اپنی داستان سنادی۔

میں خود نہیں جانتا تھا کہ میرا ہاتھ خون سے رنگا ہوا ہے۔ میں قتل جیسے بھیانک جرم کا ارتکاب کر چکا ہوں۔ بھلے ہی قانون کی نظروں سے بچا ہوا ہوں مگر ضمیر کی عدالت تو معاف نہیں کرے گی۔ اسی خیال نے مجھے بے چین کردیا تھا اور مجھے شگفتہ سے انسیت سی ہوگئی تھی۔ یوں بھی میرے بیان نے اسے بچا لیا تھا۔ نادانستگی میں لکھی رپورٹ نے ہی اسے بچا لیا تھا۔ میں نے رپورٹ میں شگفتہ کا نام نہیں دیا تھا۔ صرف اتنا لکھا تھا کہ آئی جی کے دوست عثمانی نے آکر مجرم کو فرار کرا دیا تھا یہی وجہ تھی کہ پولیس نے اسے گرفتار نہیں کیا تھا۔ لیکن اب مجھے اپنے فعل پر ندامت نہیں تھی۔ بلکہ شگفتہ پر پیار آرہا تھا۔ اسی کی وجہ سے مجھے ایک نئی بات معلوم ہوئی تھی۔ اب میں اپنے طور پر شگفتہ کے بارے میں تحقیق کررہا تھا کہ وہ کس کے کہنے پر تھانے پہنچی تھی۔ ملزم چودھری سے اس کا کیا رشتہ تھا تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ منشیات کی عادی ہے۔ یقیناً اس کی اسی کمزوری کا

مجرم نے فائدہ اٹھایا تھا۔ چودھری کا تعلق بھی منشیات فروشی کے گروہ سے ہے۔ اس کا اقرار شیر خان نے بھی کیا تھا اور شیر خان کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں یہ بات مجھے معلوم تھی۔ اس بد بخت کے پنجے سے شگفتہ کو بھی نکالا جا سکتا تھا۔ جب وہ اس لت سے چھٹکارہ پا لیتی۔

کافی دیر غور کرنے کے بعد میں نے عثمانی صاحب سے کہا۔ ''آپ کو معلوم ہے شگفتہ شیر خان کے گروہ سے وابستہ ہے؟''

''نہیں' یہ غلط ہے۔ کسی اور نے شیر خان کے نام کا فائدہ اٹھایا ہوگا۔''

''آپ کو کیسے پتا ہے؟''

''مجھے؟'' وہ گھبرا گئے لیکن فوراً ہی انھوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''میں ہر بات پر نظر رکھتا ہوں۔''

''کیا اس بات پر بھی آپ کی نظر ہے کہ شگفتہ منشیات کی عادی ہے۔''

''آں! وہ منشیات کی عادی ہے؟''

''ہاں! اسے یہ لت کالج سے لگی ہے۔ اسی لت نے اسے شیر خان کی بات ماننے پر مجبور کیا تھا۔''

''اسے کسی طرح بچالو۔ اگر وہ مرگئی تو میں بھی نہیں بچوں گا۔ اسے بدنامی سے بچانے کے لئے ہی میں نے اتنا بڑا اقدام اٹھایا ہے۔''

''آپ مطمئن رہیں۔ میں اس کا علاج کراؤں گا۔'' کہتے ہوئے میں اٹھ گیا۔

اسی دن شگفتہ کو لے کر راحیل کلینک پہنچا۔ ڈاکٹر راحیل کا شمار ملک کے معروف نفسیاتی معالجوں میں ہوتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اسے اس لعنت سے چھٹکارا دلا دیں گے۔

شگفتہ کو ان کے ہسپتال میں داخل کرانے کے بعد میں پھر منشیات فروشوں پر ٹوٹ پڑا۔ اس بار میرا انداز جارحانہ تھا۔ میں نے ایک ہفتے کے اندر اپنے علاقے سے منشیات فروشوں کا نام و نشان مٹا دیا۔ میری کارروائی سے منشیات فروشوں میں افراتفری پھیل گئی۔ میرے اس اقدام سے میرے ہی ڈپارٹمنٹ کے کئی افسران ناراض ہو گئے مگر مجھے پروا نہیں تھی کیونکہ زیادہ تر افسران مجھے شاباشی دے رہے تھے۔

اس روز بھی ایک بڑی مچھلی پر ہاتھ ڈال کر لوٹا تھا کہ ڈاکٹر راحیل گھبرائے ہوئے آئے۔ ''میری پوتی' ہائے میری پوتی۔'' وہ بے ربط الفاظ میں بولے۔

''کیا ہوا آپ کی پوتی کو؟'' میں نے پوچھا۔

''اسے کسی نے اغوا کر لیا' ہائے میری پوتی۔''

''ڈاکٹر صاحب یہ کراچی ہے ایسا واقعہ تو عام سی بات ہو گئی ہے۔ جب لوگ مادہ پرست بنیں گے تو یہی ہوگا۔''

''ڈھونڈو اسے تلاش کرو!'' وہ کہاں ہے۔

''عمر کیا ہوگی؟''

''تیرہ سال۔ میرے مرحوم بیٹے بہو کی وہی تو ایک نشانی ہے۔''

''اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ میں ابھی سارے تھانوں کو الرٹ کرتا ہوں۔ نام کیا تھا؟

''فہمیدہ نازلی۔ باپ کا نام فرحت حسین اور......اور وہ پھولوں ایسی نازک ہے ہائے میری پوتی۔''

میں نے سپاہی کو انھیں پانی پلانے کا حکم دیا اور افسران بالا سے رابطہ کرنے لگا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس کے پیچھے شیر خان کا ہاتھ ہوگا۔ اسے خبر مل گئی ہوگی کہ شگفتہ اسی کلینک میں ہے وہ ڈاکٹر کے ذریعے اسے اغوا کرانا چاہتا ہوگا تا کہ مجھ پر دباؤ ڈال سکے۔ میں نے کانسٹیبلوں کو اس کے ہسپتال بھیج دیا۔ ڈاکٹر کو بھی تسلی تشفی کے بعد واپس بھیج دیا۔

دس دن گزر چکے تھے نازلی کا پتا نہ چلا۔ وہ کہاں ہے' کس کے قبضے میں ہے اس کی خبر نہ ملی۔ میں نے ڈاکٹر سے بھی رابطہ کیا مگر وہ خاموش رہے۔ اداسی ان کے چہرے کا جز بن چکی تھی' وہ مسکرانا بھول گئے تھے مگر اب وہ مجھ سے پوتی کے بارے میں سوال نہیں کرتے۔ ایسا لگتا تھا انھیں قرار آ چکا ہے۔ شگفتہ کی حالت بھی اب سدھرنے لگی تھی۔ وہ پہلے جیسی نہ تھی۔ اب بہکی بہکی باتیں بھی نہیں کرتی تھی۔ جب بھی جاتا وہ پرسکون ملتی۔

پہلے نشے کی طلب اسے بے چین کیے رہتی۔ وہ رات میں بھی جاگتی رہتی مگر اب اسے نیند آنے لگی تھی۔

اس دن جب میں پہنچا تو وہ سو رہی تھی۔ میرے پکارنے پر وہ اٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں مگر مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ بیٹھی اور بولی۔ ''رابیل ایک سگریٹ پلاؤ گے؟ نشے کی طلب بے چین کیے دے رہی ہے۔''

میں نے پیکٹ نکال کر بڑھا دیا۔ اس نے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا اور ڈبی کو ٹیبل پر

رکھتے ہوئے بولی۔ ''سادے سگریٹ میں مزہ کہاں لیکن کچھ تو راحت ملے گی۔''

ٹیبل پر دوا کی شیشی الٹی پڑی تھی دوا بہہ کر پیکٹ تک پہنچ رہی تھی کہ میں نے جلدی سے اسے اٹھالیا۔ مجھے پیکٹ اٹھاتے دیکھ کر وہ بولی۔ ''پلیز ایک اور سگریٹ۔''

میں نے ڈبی بڑھادی۔ اس نے پیکٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''پلیز رابیل! مجھے ایک ٹھنڈی بوتل لادونا۔''

میں اٹھ کر باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد لوٹا تو وہ منتظر بیٹھی تھی۔ میرے ہاتھ سے بوتل لے کر چسکیاں لینے لگی۔

کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر باہر نکل گئی۔ مجھے تھانے پہنچنا تھا۔ اس لیے اٹھ گیا۔ باہر آ کر بائیک اسٹارٹ کی اور تھانے کی جانب چل پڑا کچھ ہی دور گیا تھا کہ میری بائیک کے سامنے ایک ہیرونچی آ گیا۔ اسے بچانے کے لئے میں نے پوری کوشش کی اس کوشش میں بائیک قبرستان کے گیٹ سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ غصے میں ابلتا ہوا میں مڑا لیکن وہ ہیرونچی غائب تھا۔ عیسیٰ نگری میرے علاقے میں نہیں تھا ورنہ میں ہیرونچیوں کو اس طرح جمع ہونے نہ دیتا۔ کبھی کبھی تو مجھے حیرت ہوتی تھی۔ غریب آباد پل سے حسن اسکوائر تک ہیرونچیوں کی جنت نظر آتی تھی۔ سینکڑوں کی تعداد میں ہر وقت جمع نظر آتے تھے۔ جدھر بھی نظر اٹھتی چار پانچ کی ٹولی میں بیٹھے نظر آتے۔ سب کا چہرہ ایک چادر سے ڈھکا ہوتا۔ ایک ہیروئن پیتا باقی اس کے دھوئے سے لطف لیتے۔ یہ نظارہ میری طرح افسران بالا بھی دیکھتے ہوں گے۔ برابر میں ہی بھٹائی رینجرز کا ہیڈ کوارٹر ہے ان جانبازوں پر اس کا اثر کیا پڑے گا کبھی کسی نے سوچنے کی زحمت نہ کی ہوگی۔ مگر اس دن میں پاگل ہوا اٹھا تھا۔ وردی میرے جسم پر تھی۔ وہی وردی جسے زیب تن کرتے وقت ہم قسم کھاتے ہیں کہ جرم کا نام ونشان مٹادیں گے۔ اس وردی کی لاج رکھنا ضروری تھی۔ میں نے قبرستان کے گیٹ پر بنی ماربل والی دکان سے ایک ڈنڈا اٹھایا اور ان بدبختوں پر پل پڑا۔ دو چار کو ڈنڈے پڑے تو باقی نے اونگھتے ہوئے سر کو اٹھا کر دیکھا اور پھر وہ سب ایسے بھاگے گویا بھوت دیکھ لیا ہو۔ بھگدڑ دیکھ کر منارنی فرنٹ کے آفس سے کچھ لوگ نکل آئے۔ میں نے انھیں اشارے سے بلایا۔ وہ نزدیک آ کر کھڑے ہوگئے۔

''کیا نام ہے؟ میں نے ایک سے پوچھا۔

''جاوید مسیح۔''

''تمھیں شرم نہیں آتی۔ تمھارے علاقے میں یہ گندگی پھیلی ہے۔''

''سر ہم تو خود پریشان ہیں لیکن کیا کریں آپ لوگوں نے ہی انھیں چھوٹ دے رکھی ہے۔ مائکل صاحب نے کئی بار حکام بالا سے شکایت کی اوپر سے آرڈر بھی آیا مگر کون سنتا ہے۔''

''کل سے یہاں کوئی نہ بیٹھے۔'' میں نے بائیک پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں جانتا تھا اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ وہ بے چارے کچھ بھی نہیں کر سکتے یہ لعنت اتنی آسانی سے تو ختم نہ ہوگی۔

تھانے پہنچ کر میں نے ڈبی سے سگریٹ نکالی اور ہونٹوں میں پھنسا کر تیلی جلائی۔

دو چار کش لیتے ہی منہ کا مزہ عجیب ہوگیا۔ ایسا لگتا تھا کہ دوا کا اثر سگریٹ میں بھی آ گیا ہے۔ اکلوتا سگریٹ تھا مجبوری میں اسے ہی پینا پڑا۔ سگریٹ ختم ہوتے ہی میرا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے دائرے ناچنے لگے اور میں نے ٹیبل پر سر رکھ دیا۔

''اے مسٹر اٹھو۔'' چھڑی کی چبھن نے مجھے سر اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ سامنے کھڑے شخص کو دیکھتے ہی میں گھبرا گیا۔ ایس پی عارف حسین کھڑے تھے۔

میں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی تو ایسا لگا کہ میرے پیروں میں جان نہیں ہے میں لڑکھڑا گیا اور کرسی کے ساتھ فرش پر گر گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں ہسپتال میں تھا۔ میرے بیڈ کے نزدیک ایک سپاہی بیٹھا تھا۔

''مجھے کیا ہوگیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ نے ہیروئن پی رکھی تھی۔ جس کے لئے شام میں آپ نے عیسیٰ نگری میں مار پیٹ بھی کی تھی۔ اب آپ لائن حاضر ہیں۔''

''میں۔ میں نے ہیروئن پی تھی؟''

''ہاں آپ نے! ایس پی صاحب نے خود پکڑا ہے۔ ڈاکٹر نے بھی تصدیق کر دی ہے۔''

''میرا دماغ ہوا میں معلق ہوگیا تھا۔ میں ایسی غلیظ شے کو ہاتھ لگا ہی نہیں سکتا تھا پھر ایسا کیوں ہوا؟ میں نے تو دوا میں بھیگی سگریٹ پی تھی اور وہ دوا وٹامن بی کمپلیکس تھی۔ ضرور ڈاکٹر کو دھوکا ہوا ہے۔

میں نے پاکٹ میں ہاتھ ڈالا۔ سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی مگر سگریٹ نہ تھی، میں نے سپاہی سے کہا۔ ''بھاگ کر ایک پیکٹ سگریٹ لے لو۔''

"لیجیے پیجیے۔" اس نے سگریٹ نکال کر بڑھائی۔ میں نے سگریٹ تھام لی پہلا کش لیتے ہی مجھے بالکل ویسا ہی مزہ لگا جیسے میں وٹامن بی کمپلیکس میں بھیگا سگریٹ پی رہا ہوں۔ میں نے حیرت سے سگریٹ کو دیکھا۔ وہی میرا برانڈ تھا۔ میں سوچنے لگا پھر مزہ کیوں بدلا بدلا سا ہے۔ لگتا ہے منہ میں دوا کا ذائقہ باقی ہے۔ سگریٹ پی کر میں لیٹ گیا۔ مجھ پر غنودگی سی چھا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہونے لگا۔

میری آنکھ رات کے دس بجے کھلی۔ بھوک پیاس مر چکی تھی۔ صرف سگریٹ کی طلب تھی۔ میں نے اسٹول کی جانب دیکھا۔ وہ سپاہی ہنوز بیٹھا تھا۔ میں نے پھر ایک سگریٹ طلب کی جو اس نے فوراً پیش کر دی۔ مجھے پھر ویسا ہی مزہ ملا لیکن اس بار وہ مزہ نہیں لگا۔ عجیب سے سرور کا احساس ہوا۔ میں پھر سو گیا۔ صبح اٹھا تو پھر سگریٹ کی طلب ہوئی۔ میں اس سپاہی کو تلاش ہی کر رہا تھا کہ میرے تھانے کا ایس آئی توفیق آ گیا۔ اس نے خلاف توقع سلام تک نہ کیا۔ میں جانتا تھا وہ مجھ سے حسد کرتا ہے میں نے اسے کئی بار لائن حاضر کروایا تھا۔ اس بار مجھے لائن حاضر کیا گیا تو وہ پہنچ گیا۔ ضرور میرا مذاق اڑانے آیا ہوگا۔

"کہو مسٹر رابیل کیسی طبیعت ہے۔ مجھے تو خبر ہی نہ تھی کہ منشیات کے خلاف مہم چلانے والا ہی منشیات کا عادی ہے۔"

اس کی زہریلی باتوں نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی پھر بھی میں نے جواب نہیں دیا۔ ڈال سے پتا گر جائے تو حقیقت کھو دیتا ہے۔ میں اس وقت زیرو تھا۔ اس لئے بھی خاموش رہ گیا۔

مجھے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا "کسے تلاش کر رہے ہو؟"

"ایک گارڈ تھا" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"گارڈ؟ تم کیا وی آئی پی ہو جو تمہیں گارڈ ملے گا۔ شکر کرو کہ ایس پی صاحب کو رحم آ گیا اور انہوں نے تمہیں اسپتال بھیج دیا مجھے حکم ملا ہے کہ تمہیں گھر پہنچا دوں۔"

"مگر وہ سپاہی؟"

"تم کس سپاہی کی بات کر رہے ہو۔ ٹھہرو میں نرس سے پوچھتا ہوں۔"

اس نے ایک نرس سے پوچھا جواب میں نرس بولی۔ "جی ہاں ایک سپاہی تو ان کے کمرے میں تھا۔ اس نے رات والی ڈیوٹی کے انچارج سے کہا تھا کہ اسے حکم ہوا ہے کہ مریض

کے ساتھ رہو۔"

"لیکن ایسا حکم تو ہمارے تھانے کو ہوگا۔ ایس پی صاحب نے ہمیں تو ایسا کچھ نہیں بتایا۔ خیر چلو باہر عثمانی صاحب کے دوست کی بیٹی منتظر ہے۔ وہ تمہیں اپنے گھر لے جائے گی۔"

میں اس کے ساتھ باہر آ گیا۔ شگفتہ کار میں بیٹھی تھی۔ اس کے برابر بیٹھتے ہوئے میں نے پوچھا۔ "تمہیں چھٹی مل گئی کیا؟"

"ہاں اب میں گھر میں رہوں گی۔ اکیلے کیسے رہتی اسی لئے تمہیں لے آئی۔" شگفتہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں نے جواب نہیں دیا سر جھکائے بیٹھا رہا۔

ایس آئی ہمیں عثمانی صاحب کے بنگلے پر اتار کر چلا گیا۔ جاتے وقت میں نے اس سے سگریٹ کی ڈبی لے لی تھی۔

ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی میں صوفے پر ڈھے سا گیا۔ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ کو ہونٹوں میں دبا کر کش لینے لگا۔ دو چار کش میں ہی جی متلانے لگا۔ میں نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیا۔ شگفتہ میری حرکتیں نوٹ کر رہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اپنی ڈبی بڑھائی۔ "لو پیو شاید یہ برانڈ اچھا لگے۔"

میں نے اس کے سگریٹ کو سلگایا اور پہلے ہی کش میں مزہ آ گیا۔ سگریٹ کی طلب ختم ہوگئی۔ عجیب سا سرور محسوس ہونے لگا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے سر کو صوفے کی پشت سے ٹیک دیا۔

☆☆☆

شگفتہ کے بنگلے میں پندرہویں رات تھی۔ میں سگریٹ کی طلب سے بے چین تھا۔ بار بار نسیں کھنچتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ آنکھوں سے نیند گویا روٹھ گئی تھی۔ رات کا آخری پہر تھا مگر مجھے ایسا لگ رہا تھا گویا دوپہر ہو۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی ساڑھے تین بج رہے تھے۔ میں تنگ آ کر لان میں نکل آیا رات کی رانی اپنی مہک پھیلا رہی تھی۔ حسنِ حنا کی خوشبو ہمیشہ سے میری کمزوری رہی ہے مگر اس وقت وہ بھی اچھی نہ لگی۔ کبھی میں ہری دوب پر بیٹھ جاتا اور کبھی ادھر ادھر ٹہلنے لگتا۔ کافی وقت گزر گیا لیکن میری بے چینی دور نہ ہوئی۔ اب میری سمجھ میں آنے لگا تھا کہ شگفتہ والے سگریٹ میں کچھ ہوتا ہے۔ یقیناً نشیلی چیز ہوگی۔ تبھی مسجد سے موذن کی پکار آئی اللہ اکبر۔

نشہ واقعی بری چیز ہے۔ تبھی تو اتنی میٹھی پکار بھی میرے دل کو موم نہ کر سکی۔ میرے دل پر شیطان کا قبضہ رہا۔ مؤذن پکارتا رہا۔ نماز نیند سے بہتر ہے، میرے دل میں چھپا شیطان بہکاتا رہا کہ سگریٹ ہی سب سے افضل ہے۔ یہ شیطانی خیال مجھے سوچنے کا موقع بھی نہیں دے رہا تھا کہ اسلام نے نشے کی ممانعت کیوں کی ہے۔ نشہ شیطان کی ہدایت ہے۔ میں اسی پر چل رہا تھا۔

چلتے چلتے شگفتہ کے کمرے تک آ گیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو دستک دیتا۔ یہی اخلاق کا تقاضا ہے۔ میرا اخلاق تو تباہ ہو چکا تھا۔ نشے نے اندھا بنا دیا تھا۔ دروازے کے پٹ کھولتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔

کمرے میں سرخ روشنی پھیلی تھی۔ شگفتہ کی پسندیدہ روشنی۔ وہ اس روشنی میں سرخ ہو رہی تھی۔ بال کھلے تھے۔ کچھ ادھر بکھرے تھے، کچھ ادھر بکھرے تھے درمیان میں چاند ایسا مکھڑا تھا۔ سرخ رنگت نے کشش بڑھا دی تھی۔ وہ ایسی بے خبر تھی کہ اسے کپڑوں کا بھی ہوش نہ تھا۔ اس کے سانس کی رفتار میرے دل کی دھڑکن بڑھانے کے لئے کافی تھی۔ تبھی اس نے کروٹ بدلی۔ چوڑیاں چھنچھنا اٹھیں۔ مجھے ایسا لگا گویا مجھے پکار رہی ہوں۔ آ، میری قیمت بڑھا دو۔ میری نگاہیں آگے بڑھیں اور آگے، سمٹی ہوئی قمیض سے بھی آگے۔ میرا گلا خشک ہو جانا چاہئے تھا۔ خون کی گردش بڑھ جانی چاہئے تھی مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس کے جسم کے قریب تر ہوا۔ اس کا شانہ پکڑ کر میں نے کہا۔ ''شگفتہ''

وہ بڑبڑائی۔ ''اف! پریشان نہ کرو۔''

''پریشان میں ہوں آنکھیں کھولو میری حالت دیکھو۔'' میں بھی بڑبڑایا اور قدرے زور سے ہلایا۔ وہ چونک اٹھی۔

آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا تو اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

''کیا ہے؟'' اس کی آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔

''مجھے کچھ ہو رہا ہے۔''

''کیا ہو رہا ہے۔ جاؤ جا کر سو جاؤ۔'' اس نے دوپٹا اٹھا لیا۔

''مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔ نسیں کھنچ رہی ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے میری جان نکل رہی ہے۔''

''میری جان تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ جاؤ جا کر سو جاؤ۔''

''پلیز ایک سگریٹ دے دو۔''

''نہیں، تمہیں سگریٹ نہیں ملے گا۔''

''کیوں؟''

''جو دیتا ہے، اسی نے منع کیا ہے۔''

''کون دیتا ہے؟''

''وہی جس نے مجھے چودھری کو چھڑانے بھیجا تھا۔ اسی کے حکم سے ڈاکٹر راحیل علاج کی جگہ مجھے سگریٹ دیتا رہا۔''

''کیا؟ ڈاکٹر راحیل منشیات کے مریضوں کا علاج نہیں کرتا ہے؟''

''کرتا ہے مگر میرا نہیں کیا۔ اس کی پوتی کو اغواء کر کے انہوں نے اسے مجبور کیا۔ بے چارے نے پوتی کی زندگی بچانے کے لئے میری زندگی سے کھیلنا شروع کر دیا اور میں نے تمہاری زندگی سے۔'' وہ کچھ دیر کے لئے رکی اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ''اس نادیدہ ہمدرد کا حکم تھا کہ اس کے سب سے بڑے دشمن کو بھی لت لگے۔ اسی لئے میں نے تمہیں بھی بوتل لانے کے بہانے بھیج کر سگریٹ بدل دیا۔''

''اور......اور وہ کانسٹیبل؟''

''وہ کانسٹیبل نہیں تھا۔ وردی پہن کر اس کا ایک گرگا آیا تھا۔''

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا لیکن پریشانی کی وجہ سے نہیں۔ میرے ساتھ جو کچھ ہو چکا تھا اس پر غور کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں تو طلب سے پریشان ہو کر بیٹھا تھا۔

''سنو تمہیں ایک شرط پر سگریٹ دوں گی۔''

''بولو، جلدی بتاؤ۔''

''تمہاری زندگی تباہ کس نے کی؟''

''تم نے اور شیر خان نے۔''

''نہیں، ایس پی نے۔ اگر وہ تمہیں لائن حاضر نہ کرتا تو تم برباد نہ ہوتے۔ ذہن ساتھ دیتا اور تم فوراً مجھ تک پہنچ جاتے مگر ایس پی کی ظالمانہ کارروائی نے تمہیں سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ تمہاری سوچ کا رخ مڑ گیا۔ خود کو بچانے کے چکر میں پڑ گئے۔ اس لئے......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اس لئے کیا؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔
"اس لئے تم بدلہ لو۔ تمہیں سگریٹ مل جائے گی۔"
"کیا اسے قتل کرنا ہوگا؟"
"نہیں' اس کی ایک بیٹی ہے۔ تم نے بھی اسے دیکھا ہوگا۔ کتنی خوبصورت ہے کیا تم اسے حاصل کرنا نہیں چاہو گے؟"
میں نے جواب نہیں دیا۔
"عورت کی معراج ہے مرد کی بانہیں۔ میں اسے پھسلا کر لے آتی ہوں تم اسے معراج بخش دو بدلے میں سگریٹ بھی ملے گی۔"
"جلدی' اسے جلدی لاؤ۔"
"ابھی تو وہ اٹھی بھی نہیں ہوگی۔"
"پھر میں کیا کروں؟"
"صبر میری جان صبر۔ اب باہر جاؤ۔ دو گھنٹے بعد آنا۔"
اس کے دھتکارنے پر میں باہر آ گیا۔ دو گھنٹے کیسے گزرے میں ہی جانتا ہوں۔ جب سورج پوری طرح روشنی پھیلانے لگا تو میں دوبارا اس کے کمرے میں جا پہنچا۔ وہ اٹھ چکی تھی اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی بھی وہ اٹھی نہیں ہوگی پھر بھی میں کوشش کرتی ہوں۔" اس نے فون کو قریب گھسیٹا اور نمبر ڈائل کرنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں رابطہ مل گیا۔
"کون' میں شگفتہ بول رہی ہوں۔ خان تک پیغام پہنچا دو کہ رابیل راضی ہو گیا ہے۔ میں ایس پی کی بیٹی کو بلا رہی ہوں رابیل کا کوٹا بھیج دو۔"
لائن ڈسکنکٹ کر کے پھر اس نے دوسرا نمبر ڈائل کیا۔ کچھ دیر تک گھنٹی بجتی رہی۔ کافی دیر بعد شگفتہ بولی۔ "کون یاسمین' میں شگفتہ بول رہی ہوں۔ ہاں ہاں عثمانی صاحب کی بیٹی نہیں یار بس یوں ہی فون کر دیا۔ نہیں نہیں ابھی آ جاؤ آج میری برتھ ڈے ہے۔ نوکر سے پہلے تمہارا چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ تم ہی تو میری سب سے خاص سہیلی ہو۔ نہیں یار ابھی اور اسی وقت چلی آؤ۔ اوکے۔" اس نے ریسیور کو کریڈل پر رکھ دیا۔
مین انتظار کرنے لگا۔ انتظار میں لذت ہوتی ہے کوفت ہوتی ہے مگر اس وقت مجھے بے چینی ہو رہی تھی۔ جسم کا تقاضا تھا سگریٹ' شگفتہ کا تقاضا تھا یاسمین۔ مجھے کانپتے ہوئے جسم کا حکم

بجا لانا تھا۔ اسے شیر خان کا حکم پورا کرنا تھا۔ ہم دونوں انتظار کر رہے تھے۔ میں عزت لوٹنے کے لئے منتظر تھا اور وہ بے خبری میں دوڑی چلی آ رہی تھی۔
آخر وہ وقت آ گیا۔ گیٹ پر کار رکی۔ ہارن بجا۔ شگفتہ نکل کر باہر گئی' لوٹی تو یاسمین ساتھ تھی۔ کانٹے کے ساتھ پھول۔ مقابلہ ہی قیمت کا احساس جگاتا ہے۔ اگر صبح نہ ہو تو رات کی سیاہی کا راز کیسے کھلتا۔ بدصورتی نہ ہوتی تو خوبصورتی کا پتا کیسے چلتا۔ شگفتہ کے ساتھ آ کر یاسمین نے بتا دیا تھا' اس کے خاموش حسن نے جتا دیا تھا کہ وہ چاہے جانے کے قابل ہے۔
میں بھی چاہت میں مرا جا رہا تھا۔ میری چاہت سگریٹ تھی۔ جیسے ہی وہ شگفتہ کے ساتھ بیڈروم میں داخل ہوئی میں باز کی طرح جھپٹا۔ آدھا مرحلہ شگفتہ نے آسان کیا اور آدھا میں نے۔ وہ تڑپ رہی تھی شگفتہ اسے دبا رہی تھی۔ ملنے نہیں دے رہی تھی۔ نشہ ہوتا ہی ایسا ہے۔ ماں سے ممتا' باپ سے شفقت' عورت سے حیا چھین لیتا ہے۔ شگفتہ بھی بے حیا بن گئی تھی۔ مجھے اکسا رہی تھی۔ گناہ کی سیڑھی پر چڑھنے کا اشارہ دے رہی تھی۔
میں نے یاسمین کے کپڑے دور پھینکے' سگریٹ کے لالچ میں بڑھا۔ ابھی پہلا ہی قدم اٹھایا تھا کہ کسی نے مجھے کھینچا۔ میں ڈگمگایا اور پیچھے الٹ گیا۔ کب اور کس وقت توفیق آ گیا تھا مجھے خبر نہ ہوئی۔ اس نے تڑاتڑ طمانچے جڑ دیئے۔ میرے جسم میں تو پہلے ہی جان نہ تھی۔ میں بے سدھ ہو گیا۔ اس نے وہی حرکت شگفتہ کے ساتھ بھی کی پھر یاسمین کو چادر دے کر بولا۔ "بے بی تم دوسرے کمرے میں جاؤ۔" پھر اس نے سپاہیوں کو آواز دی۔ ان کے آتے ہی بولا۔ "ہتھکڑی لگا دو۔"
آج تک میں ہتھکڑی لگاتا آیا تھا' آج مجھے خود لگ رہی تھی مگر مجھے غم نہ تھا۔ غم و فکر کا احساس تو مر چکا تھا۔ میں تو ایک زندہ لاش تھا۔ ٹک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیا۔ سلسلہ ملتے ہی بولا۔ "سر آپ جتنی جلدی ممکن ہو یہاں پہنچیں۔ بے بی کو میں نے بال بال بچا لیا ہے۔" پھر وہ دوسری جانب کی باتیں سننے لگا۔ کچھ دیر بعد بولا۔ "یس سر ایک گمنام فون ملا تھا' مجھے حیرت ہوئی تھی مگر جب اس نے بے بی کا نام لیا تو میں دوڑ پڑا۔ آیا تھا چیک کرنے۔ بات صحیح نکلی اور میں نے انہیں گرفتار کر لیا۔"
جیل کی در و دیوار ظالم ہوتی ہے۔ کتنی ظالم اس کا اندازہ ہر کوئی نہیں لگا سکتا۔ میں جو ایک پولیس افسر تھا قانون شکنوں کے درمیان آ کر پھنس گیا تھا۔ مجھے عزت کا جنازہ نکل جانے کی

فکر نہ تھی' نوکری سے برخواست کیے جانے کا غم نہیں تھا۔ فکر تھی تو بس اتنی کہ کسی طرح ایک سگریٹ مل جائے۔ پورے پانچ دن ہو گئے تھے مگر کسی نے رحم نہیں کھایا تھا۔ کئی لوگوں کے پاس سگریٹ نظر آتے۔ جانا پہچانا مخصوص دھواں بھی دیکھا۔ دل کو مسحور کر لینے والی خوشبو بھی سونگھی مگر حاصل نہ کر سکا۔ وہاں تو ہیرے کے مول بکتا تھا۔ مجھ سے ملنے کوئی آیا بھی نہیں تھا کہ پیسے مانگ لیتا' ساتویں دن مجھ سے ملنے ایک شخص آیا۔ وہ میرے لئے اجنبی تھا لیکن میرا ہمدرد تھا۔ اس نے سگریٹ بھی دی اور خوش خبری بھی۔ اسی کے ذریعے معلوم ہوا کہ شگفتہ زنانہ حصے میں ہے۔ اس حصے میں آصفہ' صادقہ اور جمیلہ بھی ہیں۔ وہ سب میری وجہ سے شگفتہ کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ لوگ بہت جلد جیل کی دیواریں پھلانگ لیں گی۔ کیسے؟ یہ وہی بتائیں گی۔ مجھے ان کے پیغام کا انتظار کرنا ہوگا۔

انتظار کرنے کے لئے میں بیرک میں لوٹ آیا۔ مردانہ بیرک اور زنانہ بیرک کے درمیان صرف ایک دیوار تھی۔ ڈھائی فٹ موٹی اور چالیس فٹ اونچی۔ اُدھر میری جان تھی اِدھر میری جان پر بنی تھی۔ آصفہ کیسی بھی تھی میری بیوی تھی میں اس کا مجازی خدا تھا بھلے ہی اس کا مزاج مختلف ہو۔ میں اسی کے متعلق غور کر رہا تھا کہ ایک قیدی آ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بیرک میں گنتی کے لوگ تھے۔ صرف وہی لوگ جو حوالاتی تھے۔ جن پر مقدمہ قائم ہو چکا تھا مگر عدالت نے مہر ثبت نہیں کی تھی۔ جن کو عدالت نے مجرم ٹھہرا دیا تھا وہ مشقت کے لئے جا چکے تھے۔ اس قیدی الیکٹریشن کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ وہ جھکا اور سرگوشی میں بولا۔ ''آصفہ بی بی نے یہ خط دیا ہے۔'' اور آگے بڑھ گیا۔ میں خط پڑھنے لگا۔

آصفہ نے لکھا تھا۔ ''ڈیئر رابیل میں تم سے ملنے کے لئے بے چین ہوں۔ یہاں سے نکلنے کی راہ تلاش کر رہی ہوں۔ کسی طرح زنانہ بیرک میں آ جاؤ پھر میں تمہیں باہر نکال لوں گی۔''

اس نے جتنی آسانی سے لکھ دیا تھا کام اتنا ہی جوکھم بھرا تھا۔ عورتوں کے بیرک میں جانا آسان نہ تھا پھر بھی میں نے سوچ لیا تھا کہ وہاں تک جا کر دکھاؤں گا۔ اس نے میری غیرت کو للکارا ہے۔ میں دکھا دوں گا کہ میں مرد ہوں اور مرد ہی جان پر کھیل سکتے ہیں۔ اس طرح اسے بھی اپنی اوقات کا پتا چل جائے گا۔ وہ جتنا ڈینگ مار رہی ہے اس کی قلعی بھی کھل جائے گی۔

ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ وہ قریب آ گیا۔ اس نے سرگوشی میں پوچھا۔ ''اور کوئی خدمت؟''

''میں زنانہ وارڈ میں جانا چاہتا ہوں۔''

''جیب میں روپے ہیں؟'' لیاقت مسیح نے پوچھا۔

''کتنے؟''

''جو آپ دے سکیں۔''

''آصفہ سے دلا دوں گا۔''

''شام میں تیار رہیے گا۔ آ کر لے جاؤں گا۔''

شام میں آنے کا کہہ گیا۔ میں شام کا انتظار کرنے لگا۔ انتظار کا لمحہ کتنا جاں گسل ہوتا تھا اسکا احساس اب ہوا تھا۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ بڑے انتظار کے بعد شام آئی۔ گنتی ہونے میں کافی دیر تھی۔

جیل اور لائن مجھے لازم و ملزوم لگنے لگے تھے۔ صبح ہوئی بیرک سے نکلو گنتی کرانا ہے' لائن میں لگو۔ دوپہر ہوئی کھانا کھانا ہے' لائن میں لگو۔ شام ہوئی کھانا لینا ہے' لائن میں لگو۔ رات کی آمد ہے سوتے جانا ہے' لائن میں لگو۔ غرض ہر قدم پر سزا ہے' قطار میں لگنے کی سزا اور ابھی اس سزا کا وقت نہیں آیا تھا کیونکہ سورج اپنے سفر کے آخری حصے میں تھا اندھیرا پھیلنے کے بعد گنتی ہوتی ہے اس لئے مجھے اطمینان تھا۔ تبھی گیٹ کھلا' لیاقت مسیح ہاتھ میں ایک تھیلا لئے داخل ہوا۔ اس نے اندر آتے ہی مجھے اشارہ کیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے بڑھنے لگا۔ اس کا رخ مین سوئچ بورڈ کی جانب تھا۔ بہ حالت مجبوری میں بھی ادھر ہی بڑھنے لگا۔ تبھی مجھے اپنی پیٹھ میں چبھن سی محسوس ہوئی۔ شاید یہ میری چھٹی حس کا اشارہ تھا' مجھے ایسا لگا جیسے کوئی مجھے گھور رہا ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا' بیرک کے گیٹ پر عثمانی کھڑے تھے۔ جس دن سے میں آیا تھا مجھے لگ رہا تھا وہ میرے گرد نظروں کا جال بن رہے ہیں' مجھے ان کی نظریں گھیر رہی ہیں' میری ایک ایک حرکت کو نوٹ کر رہی ہیں۔ اس وجہ سے میں ان سے دور دور رہتا۔ پھر پہلے ہی دن ان سے جھڑپ بھی ہوئی تھی۔ جس دن میں آیا تھا انہوں نے میری کہانی سن کر مجھے ہی مورد الزام ٹھہرایا تھا۔ ہر باپ کی طرح انہیں بھی بیٹی کی برائی نظر نہیں آئی تھی۔ وہ اس کی غلطی ماننے پر تیار ہی نہ تھے۔ میں ان کی عزت کرتا تھا مگر اس جھڑپ نے مجھے ان سے متنفر کر دیا تھا۔

میں نے انہیں گھورتے دیکھ کر اپنی چال تیز کر دی اور سامنے والی لیٹرین میں گھس گیا۔ وہ لیٹرین کے نام پر چھوٹے چھوٹے ڈربے تھے۔ تقریباً پچاس فٹ لمبا شیڈ تھا۔ شیڈ کے نیچے

لائن سے چار چار فٹ اونچی تین جانب سے دیوار کھنچی تھی۔ ان ہی دیواروں نے پردہ کر دیا تھا۔
میں ابھی دروازہ بند کر ہی رہا تھا کہ آواز آئی۔ ''دیوار کے نزدیک آؤ۔'' میں کھسک کر نزدیک پہنچ گیا۔ ادھر سے ہاتھ بڑھا کر لیاقت مسیح نے کپڑوں کا چھوٹا سا بنڈل دیا۔ ''اسے پہن لو۔''
میں نے بنڈل کھول کر دیکھا اور حیرت زدہ رہ گیا۔ بوسیدہ سی جیل کے ملازموں والی وردی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''
''فرار کا چولا۔'' اس نے کہا۔ ''اسے پہن کر میرے ساتھ آؤ۔ سنتری کی ڈیوٹی بدل چکی ہے۔ نئے آنے والے کو کیا معلوم کہ میں اکیلا ہوں یا ساتھی کے ساتھ۔''
میں نے دل ہی دل میں اس کی عقل کو سراہا۔ کپڑے تبدیل کئے۔ اپنے آپ کو دیکھتے ہی مجھے ہنسی آ گئی۔ میں کارٹون لگ رہا تھا لیکن فرار کے لئے گوارہ کرنا پڑا۔ پینٹ شرٹ کا بنڈل بنایا اور لیاقت سے پوچھا۔ ''اپنے کپڑوں کا کیا کروں؟''
''پیچھے والے نالے میں پھینک دو۔''
میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور باہر نکل آیا۔ سامنے بیرک کی جانب دیکھا۔ عثمانی کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میں نے جلدی سے منہ موڑ لیا۔ لیاقت مسیح نے تھیلا آگے بڑھا دیا۔ ''اسے پکڑ لو۔''
تھیلی پکڑ لی اور چل پڑا۔ آگے آگے لیاقت مسیح تھا پیچھے پیچھے میں۔ ہم دونوں گیٹ پر پہنچے۔ لیاقت مسیح نے گیٹ پر کھڑے سنتری کو سلام کیا۔
''یہ کسے لے آئے؟'' سپاہی نے جواب کی جگہ سوال کیا۔
''کام زیادہ تھا اسسٹنٹ کو ساتھ لے آیا۔''
''کارڈ بنوایا ہے؟'' سنتری نے گیٹ کھولتے ہوئے کہا۔
میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے عثمانی کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ اگر وہ منہ کھول دیتا تو ہم پکڑے جاتے۔ میری سزا میں اضافہ ہوتا ہی لیاقت مسیح بھی معتوب ہو جاتا۔
''کھڑے کیا ہو آگے بڑھو۔'' لیاقت مسیح نے کرخت لہجے میں کہا۔
میں نے چونک کر قدم تیز کر دیئے۔ اس گیٹ کے بعد صرف دو گیٹ تھے پھر کھلی فضا تھی۔ آزاد ماحول تھا لیکن ہمیں باہر والے گیٹ کی جانب تو جانا نہیں تھا۔ میری منزل برابر والی

بیرک تھی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ ادھر بڑھا۔ وہاں کھڑے سنتری نے بھی وہی سوال کیا۔
''ہاں حضور' میں نے گیٹ پر لکھا دیا ہے۔'' کہتے ہوئے وہ دوسرے حصے میں داخل ہوگیا۔ میرے ہاتھ میں الیکٹریشن کے سامان سے بھرا ہوا تھیلا تھا۔ ہاتھ دکھنے لگا تھا لیکن مجبوری تھی۔ اسی تھیلے کی آڑ تھی۔ الیکٹریکل فالٹ صحیح کرنے کے بہانے سے لیاقت مسیح اندر آیا تھا۔

چار جانب دیواروں سے گھرا کھلا میدان' درمیان میں بڑی سی بیرک' اور بیرک میں قیدیوں کی جماعت۔ لیاقت مسیح نے بیرک کی جانب بڑھنے کی بجائے ایک چھوٹے سے کمرے کی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔ وہ کمرا دیوار سے متصل تھا۔ دروازے پر زنگ خوردہ تالا لٹک رہا تھا۔ لیاقت نے وہاں پہنچ کر کہا۔ ''مجھے لڑکیوں نے یہاں تک پہنچا دینے کا حکم دیا تھا۔ میری ڈیوٹی ختم اب تم اپنی حفاظت آپ کرو۔'' کہتے ہوئے وہ سوئچ کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ دیوار کے اوپر لگے سوئچ بورڈ پر بڑا سا تالا تھا جس کی چابی اسی کے پاس رہتی تھی۔ اس نے چابی نکال کر میرے ہاتھ میں پکڑا دی تھی۔
''چلو باہر نکلو۔'' اس آواز پر میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک شخص کھڑا تھا۔ اس کے اشارہ پر لیاقت باہر نکل گیا۔ اب کمرے میں ہم دونوں رہ گئے۔ اس نے کہا۔ ''میں گیٹ کی طرف جا رہا ہوں تم بھی آؤ۔''
وہ بڑے گیٹ پر پہنچا پھر اس نے دستک دی۔ باہر سے چھوٹی کھڑکی کھل گئی۔ کسی نے اندر جھانکا پھر بولا کیا ہے؟
''اسے باہر بھیجو۔ کام پورا کر چکا ہے۔'' مجھے ساتھ لانے والے نے کہا۔
''کارڈ ہاتھ میں لے کر آؤ۔'' سپاہی نے کہا اور چھوٹی کھڑکی بند کر دی۔
''میں پستول سے کور کروں گا۔ تم نکلتے چلے جانا۔ باہر میرا آدمی منتظر ہے۔'' اس نے جملہ مکمل کیا تھا کہ دروازہ کھل گیا۔
دروازہ کھلتے ہی اس نے پستول کی نال سپاہی کی گردن پر رکھ دی۔ وہ دونوں سپاہی ہونقوں کی طرح دیکھتے رہ گئے اور ہم بھاگتے ہوئے باہر نکلے۔ باہر وہ آفت کا پرکالہ گروپ منتظر تھا۔ ہمیں دیکھ کر ایک ہائی روف آگے بڑھی۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک بھیانک چہرے والا بیٹھا تھا۔ ہم ادھر بڑھ رہے تھے کہ ایک دوسری کار تیزی سے بڑھی۔ اس پر ایک خوش پوش نوجوان سوار تھا۔ ہم ہائی روف میں بیٹھ ہی رہے تھے کہ عثمانی نے شگفتہ کا ہاتھ پکڑ کر دوسری گاڑی کی جانب

کھینچا۔ ”ادھر نہیں ادھر۔ یہی اصلی گاڑی ہے۔“

اسی وقت بھیانک چہرے والے نے آصفہ سے کہا۔ ”ہری اپ جلدی۔“ پھر اس نے ہاتھ باہر نکال کر کار پر فائر کر دیا۔ کار والا بھی مسلح تھا اس نے بھی جوابی فائر کیا۔ شگفتہ نیچے تھی۔ ہائی روف کا ڈرائیور کار کو موڑنا چاہتا تھا کہ آصفہ نیچے اتری۔ باز کی طرح عثمانی پر جھپٹی اور پھر اس نے کھڑی ہتھیلی کا وار اس کی کلائی پر کیا۔ وہ ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ آصفہ شگفتہ کو کھینچتی ہوئی ہائی روف میں لے آئی۔ ہائی روف فل اسپیڈ سے دوڑنے لگی۔ صرف دو ڈھائی منٹ کا تماشہ تھا مگر مجھے صدیوں جیسا لگا تھا۔

میں نے پیشانی پر ابھر آئی پسینے کی بوندوں کو ہتھیلی کی پشت سے پونچھا اور شگفتہ کی جانب دیکھا۔ وہ آصفہ کے ہاتھوں میں مچل رہی تھی۔

”پاپا۔ پاپا کو تو لے لیتے۔“ شگفتہ نے روہانسی آواز میں کہا۔

”چپ پاپا کی بچی۔“ آصفہ نے ڈانٹا۔

”تم کیوں رو رہی ہو کیا تمہیں آزادی پسند نہیں آئی۔“ بھیانک چہرے والے نے شگفتہ سے پوچھا۔

”میں پاپا کے لئے پریشان ہوں۔ وہ بھی ہمارے پیچھے تھے۔“

”وہ کوئی اور ہے جو تمہارے پاپا کی جگہ سزا کاٹ رہا ہے۔“

”وہ پاپا نہیں تھے؟“ شگفتہ نے پوچھا۔

”ہاں وہ تمہارے پاپا نہیں تھے۔“ بھیانک چہرے والے نے اسٹیئرنگ گھماتے ہوئے کہا۔ ”وہ کون تھا یہ صرف مجھے پتا ہے۔“

کوئی اور وقت ہوتا تو میں ایسے شخص کا منہ دیکھنا بھی گوارا نہ کرتا۔ اس کا پورا چہرہ جھلسا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی بھیانک آتش زدگی کا شکار ہو گیا ہو۔ پھر بھی میں اس مکروہ چہرے کو دیکھنے پر مجبور تھا۔

”آپ کا نام کیا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”سہیل!“ اس نے جواب دیا اور ایک بنگلے کے کھلے ہوئے گیٹ میں داخل ہو گیا۔ وہ جدید انداز کا بنگلا تھا۔ اس کی بناوٹ بتا رہی تھی کہ اس کی تعمیر کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔

ہائی روف رکی تو ہم سب نیچے اترے۔ سہیل کی چال بہت تیز تھی۔ وہ دوڑنے کی حد

تک تیز چل رہا تھا۔

”میرے پیچھے آؤ۔“ اس نے برآمدے پر چڑھتے ہوئے کہا۔

ہم سب نے بھی رفتار تیز کر دی اور بنگلے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ اس نے تالا کھول کر ہمیں اندر جانے کا اشارہ کیا۔ ہمارے داخل ہوتے ہی وہ بھی اندر آ گیا۔ اندر آتے ہی اس نے کہا۔ ”جلدی جلدی میرے پیچھے آؤ۔“

اس کی گھبراہٹ دیکھ دیکھ کر مجھے الجھن ہو رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب اسے کیا پریشانی ہے۔ اگر یہ محفوظ مقام ہے تو پھر وہ گھبرایا ہوا کیوں ہے۔

جس بڑے کمرے میں ہم داخل ہوئے تھے وہ ڈرائنگ روم تھا۔ اسے پار کر کے ہم ایک دوسرے کمرے میں داخل ہوئے لیکن وہ اس کمرے میں بھی نہیں رکا۔ اس کمرے میں ایک دوسرا دروازہ بھی تھا۔ اس سے گزر کر وہ ایک تیسرے کمرے میں پہنچا۔ یقیناً وہ آخری کمرا تھا۔ اس میں صرف ایک ہی دروازہ تھا جس سے ہم داخل ہوئے تھے۔ وہ دیوار کی سمت بڑھتا گیا اور ایک الماری کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اسٹیل کی اس الماری کو کھول کر اس نے اندر لٹک رہے کوٹ پینٹ وغیرہ کو باہر نکالا پھر اس نے الماری کی پچھلی دیوار میں لگے کسی کھٹکے کو دبایا۔ پچھلا حصہ اوپر اٹھ گیا۔ دوسری جانب بھی اسٹیل کی چادر نظر آئی۔ اس نے چادر میں ابھرے ہوئے حصے پر انگوٹھے سے دباؤ ڈالا وہ حصہ بھی کھل گیا۔ دوسری جانب خلا نظر آیا۔ وہ اس میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ ”آؤ!“

ہم سب اس کے پیچھے پیچھے اس خلا میں داخل ہو گئے۔ دوسری جانب نکلتے ہی میں نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں پایا۔

”اس مکان کا دروازہ دوسری گلی میں کھلتا ہے لیکن تم لوگ دروازے کی سمت جانے کی کوشش نہ کرنا۔ ادھر والے دروازے پر کرایہ کے لئے خالی ہے کا بورڈ لٹک رہا ہے۔“ سہیل نے کہا۔

”آخر اتنی رازداری کی ضرورت کیا ہے۔ ہمیں اب کس سے خطرہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تم شاید بھول رہے ہو کہ تم لوگوں کو نکال لے جانے کی کوشش میں ایک کار والا میرے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ وہ شیر خان کا آدمی تھا۔ اس نے جیل سے نکالنے کے لئے منصوبہ سازی کی تھی جسے میں نے ناکام بنا دیا۔“ سہیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو کیا تمہارا تعلق پولیس سے ہے؟" شگفتہ نے گھبرا کر پوچھا۔

"نہیں، اگر میرا تعلق پولیس سے ہوتا تو میں تم لوگوں کو بچانے کے لئے پولیس والوں پر فائر کیوں کرتا؟" اس نے مسکرا کر کہا۔

"لیکن تم کون ہو؟" آصفہ نے جھلا کر پوچھا۔

"صبر محترمہ شاداں صبر!" سہیل کے ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ ناچ اٹھی۔

آصفہ اچھل پڑی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو کیا میں نے غلط نام لیا ہے۔" پھر وہ صادقہ کی جانب مڑ کر بولا۔ "حوراں، تم اپنی سہیلی کو سمجھاؤ کہ میں اس کا دوست ہوں دشمن نہیں۔"

صادقہ بھی چونک گئی۔ اس کی کیفیت بھی آصفہ کے جیسی ہوگئی۔

سہیل نے اسکی جانب توجہ نہیں دی اور جمیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں پولیس کی گاڑی کو ٹھکانے لگا کر ابھی آیا۔ اور وہاں جمو تم انہیں سنبھالے رکھنا واپسی میں تمہارے ایک اور ساتھی کو بھی لانا ہے۔"

جمیلہ بھی اپنا نیا نام سنتے ہی اچھل پڑی۔ لیکن سہیل نے توجہ نہ دی اور الماری کے راستے گزرتا ہوا دوسری جانب نکل گیا۔ الماری کا دروازہ بند کر گیا۔

کمرے میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہم سب حیران پریشان سے کھڑے تھے۔ ان لڑکیوں کے نئے ناموں نے مجھے بھی الجھن میں ڈال دیا تھا۔

کافی دیر بعد میں نے خاموشی کو توڑا۔ "آصفہ! کیا واقعی تمہارا نام شاداں ہے؟"

"ہاں! لیکن اسے کس نے بتایا؟ یہ نام تو میں نے بارہ سال پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔" آصفہ نے پرفکر لہجے میں کہا۔

"یہی بات میں سوچ رہی ہوں کہ اسے میرا نام کیسے معلوم ہوگیا، یہ نام تو صرف میری امی کے لئے مخصوص تھا۔" صادقہ نے عجیب سے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"آخر یہ ہے کون، ہمارے ماضی کی خبر اسے کیسے ہوئی؟" جمیلہ بھی چپ نہ رہ سکی۔

"ایک بات تو بتاؤ۔" میں نے آصفہ سے پوچھا۔ "کیا تمہارے امی ابو کا قتل ہوا تھا؟"

"ہاں تقریباً بارہ سال پہلے۔"

"اس وقت تم شیخوپورہ میں تھیں؟" صادقہ نے جلدی سے کہا۔

"ہاں!" آصفہ نے سپاٹ دیوار کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"اور اس قاتل کا چھ بچوں نے قتل کر کے بدلہ لے لیا تھا؟" شگفتہ بولی۔

"ہاں۔"

"میری جان میری بلبل" کہتی ہوئی صادقہ اس سے لپٹ گئی۔ "یہی کہہ کر تجھے پکارتی تھی میں آہ اتنے نزدیک رہ کر بھی ہم کتنے دور تھے۔"

"شاداں اپنی حوراں کے گلے لگ لی اب جمو کو بھی سینے سے لگا لے۔" جمیلہ نے بانہیں پھیلا دی۔

شگفتہ بھی آگے بڑھ کر لپٹ گئی۔

"کاش میں اب بھی اتنا سا ہی ہوتا۔ وہی تیرہ چودہ سال کا رابے تو میں بھی لپٹ لپٹ کر خوشی کا اظہار کرتا۔" میں نے ماحول کی سنجیدگی کو دور کرنا چاہا۔ "لیکن شاداں تم تو میری بیوی ہو آؤ نا" میں نے ہنسانے کے لئے بانہیں پھیلا دیں۔

"اے مسٹر نوشے بھائی سنبھل کے، بچپن میں جس طرح تمہیں پیٹ کے رکھ دیتی تھی وہی حالت کردوں گی۔" صادقہ روتے روتے ہنس دی۔

"اور یہ بھول گئی شاداں تجھ سے بدلہ بھی لے لیتی تھی۔" میں نے ٹکڑا لگایا۔

"مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ سہیل کو یہ سب کیسے معلوم ہوا۔ وہ ہمیں کیسے پہچان گیا۔ تم خود سوچو حوراں، ہم تینوں اتنے قریب تھے پھر بھی ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے اور وہ پہچان گیا۔" آصفہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اس سے بھی اہم مسئلہ یہ ہے کہ اس نے ہمیں جمع کیوں کیا۔ ان پانچ ہستیوں کو جو کبھی چھ تن ایک جان کہلاتے تھے۔" میں نے اپنا خیال پیش کیا۔

"پانچ تو آ چکے ہیں لگتا ہے چھٹے کو لانے گیا ہے۔ یقیناً وہ کمالے ہوگا۔" آصفہ نے کہا۔

"اُف کمالے بھی اب بڑا ہو گیا ہوگا۔" صادقہ نے دخل دیا۔ "کتنا بڑا ہوا ہوگا۔"

"اتنا بڑا کہ تو شادی کر سکے۔" شگفتہ نے چٹکی لی۔ "میں اب تک نہیں بھولی ہوں کمالے کیسے تجھ پر مرتا تھا۔ ذرا سا تو نظروں سے دور ہو جاتی تو وہ بے چین ہو جاتا تھا۔"

"اتنے دنوں بعد ہم اکٹھے ہوئے ہیں تو مجھے وہ خوفناک رات یاد آنے لگی ہے۔" آصفہ نے سر جھکا کر کہا۔ "مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ ہم سب ایک جگہ جمع ہیں۔ پلاننگ بنا رہے ہیں،

ابوامی کے قاتل سے بدلہ لینے کے لئے بے چین ہیں۔''

میں نے دخل دیا تا کہ اسے ماں باپ کی یاد سے چھٹکارہ مل جائے ذہن کا رخ بدل جائے۔''شاداں' تمہیں یاد ہے کتنی جامع پلاننگ تھی؟''

''واقعی شاداں کی عقل کو داد دینا ہوگا اس نے کسی چالاکی سے قصاص لے لیا تھا۔ جان کے بدلے جان۔''

''عقل کے معاملے میں تو واقعی یہ سب سے آگے رہی ہے۔'' شگفتہ بولی۔''جب اس نے لوہے کے تار منگوائے تھے تو میں تھانے میں پڑے دو بنڈل اٹھالائی تھی جسے تم نے پورے کمرے میں بچھا دیا تھا۔'' اس کا مخاطب میں تھا۔''پھر تم نے اس کے سرے کو کمال چابکدستی سے بجلی کے سرکٹ میں پھنسا دیا تھا اور میں نے پیپر ویٹ مار کر بلب توڑ دیا تھا اندھیرے میں جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوا تم نے مین سوئچ آن کر دیا تھا۔''

''مر کر اس کمینے کی لاش کیسی بھیانک ہوگئی تھی۔'' جمیلہ بولی۔''میں تو دیکھ کر ہی ڈر گئی تھی۔''

''ان باتوں کو چھوڑو یہ بتاؤ اتنے سارے دن کہاں گزارے' کیسے گزارے۔'' میں نے آصفہ سے پوچھا۔

''کیسے گزارے؟'' اس نے میرے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔''سن سکو گے میری المناک داستان' مردوں کے ظلم کا قصہ' میرے گھٹ گھٹ کر جینے کی روداد۔'' وہ رک کر مسکرائی۔ اس کی ہنسی میں طنز کی چبھن تھی۔ وہ طنزیہ انداز میں بولنے لگی۔''ابوامی کے قتل ہو جانے سے میں بے سہارا ہوگئی تھی۔ میرے سر پر دست شفقت پھیرنے کے لئے خالہ آگے بڑھیں۔ انہوں نے گود پھیلا دی۔ میں ان کی سونی گود کو سجانے کے لئے ان کے گھر چلی آئی۔ خالہ کی عمر زیادہ نہ تھی۔ وہ امی سے پانچ سال چھوٹی تھیں لیکن ان کی گود سونی تھی۔ ان کی گود خود خالو نے سونی کی تھی۔ کسی بات پر وہ بپھر اٹھے تھے اور غصے میں لات چلا دی تھی۔ ان دنوں خالہ امی پورے دنوں سے تھیں۔ ان کی جان پر بن آئی۔ ڈاکٹروں کی کوشش سے ان کی جان تو بچ گئی مگر وہ ہمیشہ کے لئے بانجھ ہوگئیں۔ غلطی خالو کی تھی لیکن وہ مرد تھے اپنی غلطی کیوں مانتے۔ سارا الزام خالہ پر ڈال کر دوسری شادی کے لئے کمر باندھنے لگے۔ عورت دکھ سہہ لیتی ہے۔ بھوکے رہ لیتی ہے مگر سوتن کو برداشت نہیں کرتی ہے۔ سوتن کے ڈر سے ہی خالہ مجھے لے کر آئی تھیں۔ میرے دودھیال میں

کوئی قریبی رشتے دار نہ تھا اس لئے خالو بھی مطمئن ہوگئے۔ زندگی آرام سے گزرنے لگی لیکن۔''

وہ سانس لینے کے لئے رکی اور پھر غمزدہ لہجے میں بولی۔''لیکن قسمت کو یہ بات پسند نہ آئی۔ ایک روز خالو آفس سے لوٹ رہے تھے کہ سامنے سے آتا ہوا گھوڑا بھڑک گیا۔ تانگہ ان سے ٹکرا گیا اور وہ گر پڑے۔ سواری بھرا تانگہ ان کی کمر پر چڑھ گیا۔ وہ وہیں چٹ پٹ ہوگئے۔ ان کی موت نے قیامت برپا کر دی۔ کوئی پرسان حال نہ تھا۔ ایسے وقت میں خالو کے ایک دوست کام آئے۔ وہ برابر آ کر نقد رقم دے جاتے۔ یہ تو بہت بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اپنی مردانہ فطرت سے مجبور ہو کر ایسا کر رہے تھے۔ تبھی تو میں مردوں سے نفرت کرتی ہوں۔'' آصفہ نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔''جانتے ہو کچھ ہی دنوں بعد انہوں نے امداد کا تاوان وصول کرنا شروع کر دیا خالہ عورت تھیں۔ عورت جو صدیوں سے محکوم ہے۔ وہ لٹنے لگیں۔ لوٹنے والے ہمدردوں کی تعداد کم ہوئی تو خالہ نے نئے نئے ہمدردوں کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ اتنا بڑا ڈراما کھیلا جا رہا تھا مگر مجھے خبر نہ تھی۔ خبر ہوئی بھی تو تب جب بات مجھ تک پہنچ گئی۔ کئی لوگوں نے مجھے مانگنا شروع کر دیا تب خالہ کھلیں اور انہوں نے بتایا کہ میں ہر دوسرے تیسرے اپنی نند کے ہاں جانے کا کہہ کر کہاں جاتی تھی۔ انہوں نے اس نئی مصیبت کا حل تلاش کر لیا۔ وہ مجھے لے کر گوجرانوالہ چلی آئیں وہاں ان کا دیور تھا۔ انھوں نے مجبوری میں میرا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ مجھ سے کم سے کم بیس سال بڑا تھا۔ اس عمر میں بھی میں نے عزت کی زندگی پانے کے لئے اسے قبول کر لیا۔ تقریباً چھ ماہ تک میں نے اس کی اور اس کی بیوی کی خدمت کی لیکن وہ کمبخت بدمعاش نکلا میری ایک چھوٹی سی غلطی پر مجھے روئی کی طرح دھنک دیتا۔ ایک دن صرف اتنی سی بات کہ بس سالن میں نمک تیز ہوگیا تھا اس نے سالن کا بھرا پیالہ میرے منہ پر پھینک دیا۔ یہ دیکھو نشان۔'' آصفہ کی پیشانی پر زخم کا نشان تھا اس پر انگلی پھیرتے ہوئے بولی۔''اسی جگہ پیالہ ٹکرایا تھا۔ ٹوٹ کر گر گیا تھا۔ مجھے بھی غصہ آگیا عورت تھی اس لئے جوابی حملہ تو کر نہیں سکتی تھی دل کی بھڑاس الفاظ میں نکالی۔ مجھے جواب دیتے دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہوگیا اور چیختے ہوئے بولا۔''جا میں نے تجھے طلاق دی' طلاق' طلاق۔'' اور میں مرد کی اس قوت سے ہار گئی۔ کلنک ایسا ٹیکا لگا کر لاہور لوٹ آئی۔ خالہ نے سنا تو سر پیٹ لیا۔ لیکن اب کر بھی کیا سکتی تھیں۔ مجھے اپنے راستے پر چلا نہیں سکتی تھیں۔ اس لیے سب سے چھپا کر رکھنے لگیں۔ انہی دنوں میرے پڑوسی فہد کی نظر مجھ پر ٹھہر گئی۔ وہ دیوانہ بن کر پروانے کی طرح میرے گرد چکر لگانے لگا۔ عورت تو ہمیشہ سے ہی مرد کی جھوٹی باتوں

پر یقین کرتی آئی ہے۔ میں نے بھی اس کی محبت پر یقین کرلیا اور ایک رات خالہ کی جمع پونجی لے کر اس کے ساتھ کراچی چلی آئی۔ اس نے مجھے ایک ہوٹل میں ٹھہرایا۔ ہم ایک ہی کمرے میں رہے لیکن میں بے وقوف نہ تھی۔ ایک غلطی کر آئی تھی دوسری کیسے کر لیتی۔ ساری رات جاگتے گزاری۔ اسے قریب آنے ہی نہیں دیتی۔ میرا مطالبہ تھا پہلے نکاح کرو پھر قریب آؤ۔ تین ہی دن میں وہ اکتا گیا ایسا بھاگا کہ لوٹ کر نہیں آیا۔ اس رات میں نے کچھ نہ کھایا۔ بھوک مٹانے کے لئے پیسے چاہیے تھے جو میرے پاس نہ تھے۔ سوتے جاگتے رات گزاری۔ صبح ہوئی، بھوک میں تیزی آ گئی۔ میں نے سوچا روم اٹینڈنٹ سے کھانا منگوالوں لیکن فوراً ہی سنبھل گئی۔ نوکر کو پیسا کہاں سے دیتی۔ تبھی دروازے پر دستک ہوئی میں نے سوچا فہد واپس آ گیا ہے لیکن۔" وہ رک گئی۔ ہم سب ہمہ تن گوش تھے۔ آصفہ کا یوں چپ ہو جانا گراں گزرا۔ شگفتہ نے اسے ٹوک ہی دیا۔ "پھر کیا ہوا۔"

"لیکن وہ فہد نہ تھا ہوٹل کا منیجر تھا۔ اس نے آتے ہی بدتمیزی شروع کر دی۔ کہنے لگا۔ آج شام تک ہمارے واجبات ادا نہ ہوئے تو ہم تمھیں پولیس کے حوالے کر دیں گے اور پولیس والے تمھاری ساتھ کیسا سلوک کریں گے یہ تم خود سمجھ سکتی ہو۔ حدود آرڈیننس کا مقدمہ قائم ہوگا۔ بچنے کی صرف ایک صورت ہے کہ تم اپنے زیور بیچ کر رقم لے آؤ۔ یا پھر ہمارے ہاں نوکری کر لو۔ اچھا خاصا کیش مل جایا کرے گا۔ اپنی بات ختم کر کے وہ ایسا ہنسا تھا گویا اس نے مجھے بازاری سمجھ لیا ہو۔ میں نے عقل سے کام لیا اور بولی میں اس شہر میں نئی ہوں اگر آپ کسی کو میرے ساتھ صرافہ مارکیٹ بھیج دیں تو مہربانی ہوگی۔ میری بات سن کر اس کا چہرہ بجھ سا گیا۔ اس نے یہی سوچا ہوگا کہ میرے پاس کچھ نہیں بچا ہوگا۔ فہد سب کچھ لے کر فرار ہو گیا ہوگا۔ یہ سچ بھی تھا۔ میرے پاس زیور کے نام پر صرف ایک انگوٹھی تھی۔ پھر بھی میں نے اسے مغالطے میں ڈال دیا۔ دراصل میں فرار ہونا چاہتی تھی۔ اپنے منصوبے میں عمل کرنے کے لئے میں اس کے نوکر کو ساتھ لے کر بازار پہنچی اور ایک دوکان کے سامنے پہنچ کر بولی۔ "مجھے متلی سی ہو رہی ہے ایک میٹھا پان لے آؤ جب تک میں دکان والے سے معاملہ طے کر رہی ہوں۔ وہ بے چارہ پان لینے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں سامنے والی گلی میں گھس گئی۔ دوسرے جانب بھی بڑی سڑک تھی۔ میں اندازے سے بڑھنے لگی۔ انجان شہر کسی سے واقفیت نہیں، بس خدا کے بھروسے پر آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ چلتے چلتے جب تھک گئی تو ایک گھر کے سامنے بیٹھ کر ستانے لگی۔ وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ دیکھا ایک

بڑے میاں لاٹھی ٹیکتے ہوئے آ رہے ہیں ابھی وہ مجھ سے دس بارہ قدم دور تھے کہ لڑکھڑا کر گر پڑے۔ انھیں گرتے دیکھ کر میں اٹھ کر دوڑی اور انھیں سہارا دے کر اٹھانے لگی۔ کہاں جائیں گے" میں نے پوچھا۔ وہ کراہتے ہوئے بولے۔ سامنے والا میرا مکان ہے اگر پہنچا دو تو بڑی مہربانی ہوگی۔ میں انھیں سہارا دے کر لے چلی۔ وہ ایک بڑا سا بنگلہ تھا۔ باہر سے ہی امارت ٹپک رہی تھی۔ اندر جاتے ہی تصدیق ہوگئی۔ ہر سامان قیمتی تھا۔" آصفہ پھر رک گئی۔ اس نے پانی مانگا۔

وہ گھر ہم سب کے لئے نیا تھا مگر آصفہ کی کہانی نے ہمیں اس طرح مسحور کر لیا تھا کہ ہر ایک یہ بات بھول گیا۔ جمیلہ فوراً کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ دروازے کی جانب بڑھتے بڑھتے رک گئی اور مڑ کر بولی۔ "میں بھی کیسی بدھو ہوں پانی لانے چل دی جبکہ یہ بھی نہیں پتا کہ پانی کہاں سے ملے گا۔"

میں نے بے خیالی میں کہہ دیا۔ "کچن میں اور کہاں۔"

"دیکھتی ہوں شاید مل جائے۔" وہ بڑھتی چلی گئی اور جب لوٹی تو اس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔ اسے بڑھاتے ہوئے بولی۔ "کچن میں فریج ہے اور اس میں کھانے کی اشیاء۔ اگر کہو تو کچھ لے آؤں۔"

"نہیں بھئی ہمیں کہانی سننے دو۔" میں نے کہا۔

تب تک آصفہ پانی پی چکی تھی۔ اس نے ہونٹ پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں ان سامانوں کو دیکھ ہی رہی تھی کہ ایک بڑی بی کمرے میں داخل ہوئیں انھوں نے ہانپتے ہوئے بڑے میاں کو دیکھا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولیں۔ "بیٹی یہ کہاں مل گئے تھے۔"

میں نے جواب دیا۔ "چلتے چلتے گر گئے تھے میں سہارا دے کر لے آئی۔"

وہ بولیں "میں نے کتنی بار منع کیا باہر نہ جایا کریں مگر سنتے ہی نہیں۔ ہر روز پوسٹ آفس پہنچ جاتے ہیں کہ بیٹے کا خط آیا ہوگا۔"

میں نے پوچھا۔ "بیٹا کسی دوسرے شہر میں رہتا ہے۔"

وہ بولیں۔ "دوسرے شہر نہیں دوسرے ملک میں، بڑا بیٹا امریکہ پڑھنے گیا تھا۔ وہیں کا ہو رہا۔ دوسرا گیا وہ بھی وہیں رہ گیا۔ تیسرا بیٹا سفارتی عملے میں شامل ہے کبھی اس ملک تو کبھی اس ملک۔ بیٹیاں اپنے اپنے گھر کی ہو چکی ہیں۔ سات بچے تھے بڑھاپے میں ایک بھی ساتھ دینے کے لئے پاس نہیں ہے۔"

اس بے چاری کی داستان نے مجھے بھی غم زدہ کر دیا۔ لیکن حوصلہ بھی ملا کہ ایک تم ہی نہیں بے سہارا اور بھی غم کے مارے اور بھی ہیں۔ ہر ایک اپنے سر پر غموں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے۔ ابھی میں خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ بڑی بی نے پوچھا۔ ''بیٹی تم کہاں رہتی ہو؟ کچھ دکھ اور کچھ عقل مندی کا تقاضا' میری آنکھیں بھر آئیں میں آبدیدہ ہو گئی اور سسکتے ہوئے بولی کہ میرے ماں باپ مر چکے ہیں ایک چچا ہے وہ میری شادی ایک بوڑھے سے کروانا چاہتا ہے اسی لیے گھر سے بھاگ آئی ہوں۔ وہ بولیں بیٹی لڑکیوں کو گھر نہیں چھوڑنا چاہیے۔ گھر صرف چار دیواری کا نام نہیں ایک حفاظتی قلعے کا نام ہے۔ وہاں صرف اینٹ پتھر کے ستون ہی نہیں ہوتے سہارا دینے کے لئے اپنوں کے بازو بھی ہوتے ہیں۔ پھر وہ رک کر کچھ سوچنے لگیں۔ کافی دیر بعد وہ بولی تھیں کہ اگر تم چاہو تو ہمارے ساتھ رہ سکتی ہو۔ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ انھیں پنشن ملتی ہے اسی سے گھر چلتا ہے۔ جب کسی بیٹے کو ماں باپ کی یاد آجاتی ہے تو کچھ بھیج دیتے ہیں۔ جہاں دو آدمی وہاں ایک اور سہی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں میں فوراً راضی ہو گئی۔ اسی گھر میں آج تک رہ رہی ہوں۔ بڑی بی کا انتقال ہو چکا ہے۔ بڑے میاں لب گور ہیں ان کی خدمت نوکروں کے ذمے ہے۔ میں تو صرف عیش کرتی ہوں۔ ہاں جب ان کا کوئی بیٹا یا بیٹی آجاتی ہے تو تھوڑی سی تکلیف ہو جاتی ہے۔ کچھ دنوں کے لئے مجھ سے حکومت چھن جاتی ہے۔'' آصفہ نے اپنی کہانی ختم کر کے میری جانب دیکھا۔

''لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ صادقہ اور نجمہ کہاں ملیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک دن میں بازار سے لوٹ رہی تھی دیکھا کہ بس اسٹاپ پر مجمع لگا ہے۔ لوگ دائرے کی شکل میں کھڑے ہیں اور کسی لڑکی کی آواز ابھر رہی ہے۔ تجسس سے میں مجمع کے نزدیک پہنچی تبھی مجمع پھٹا اور ایک نوجوان تیزی سے نکل کر بھاگا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک لڑکی تھی۔ لڑکی کے ہاتھوں میں چپل تھی۔ میں سمجھ گئی کہ وہ اس نوجوان کی خاطر مدارت کر رہی تھی۔ تبھی میں نے آگے بڑھ کر لڑکی سے پوچھا۔ ''کیا ہوا تھا؟''

''ہوتا کیا مجھے اکیلی سمجھ کر چھیڑ رہا تھا۔''

''بہت خوب' اس سڑک چھاپ مجنوں کی پٹائی کرنا ثواب ہے۔'' میں نے کہا ہی تھا کہ ویگن آگئی وہ بھی اسی ویگن میں چڑھی۔ راستے میں ہی اس سے دوستی ہو گئی۔ وہ لڑکی کوئی اور نہیں یہی آفت کی پرخالہ صادقہ عرف حوراں تھی۔

''کیوں بھئی حوراں تم کراچی کیسے پہنچی۔'' میں نے سوال کیا۔

صادقہ نے ٹھنڈی سانس لی اور بھرآئی آواز میں بولی۔ ''میری زندگی بھی شاداں کی طرح غم و آلام کا مجموعہ ہے۔ کبھی بھوکے رہے کبھی پھٹا پہنا مگر اف نہ کی۔ ابو نے شیخوپورہ چھوڑا تھا قسمت چمکانے کی خاطر۔ وہ بھول گئے تھے کہ قسمت کی دیوی ہر کسی پر مہربان نہیں ہوتی یہ تو اس کی مرضی ہے۔'' صادقہ نے چھت کی جانب انگلی اٹھائی۔ ''کہ وہ چاہے خوش رکھے چاہے ناخوش' ہم تو کٹھ پتلی ہیں' ڈور تو اسی کے ہاتھ میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بغاوت میری فطرت میں رچتی بستی جا رہی ہے۔ میں جب بھی اکیلی ہوتی ہوں یہی سوچتی ہوں۔ وہ نیلی چھتری والا ایسا کیوں سوچتا ہے' کیوں مصائب کا طوفان اٹھاتا ہے۔ کیوں سانپ بن کر ڈستا ہے' جوش و جذبات میں اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ''عورت کو بھی اسی نے پیدا کیا' مرد کو بھی اسی نے بنایا پھر دونوں کے حقوق میں کمی بیشی کیوں کی۔ کیوں مرد کی محکومی میں عورت کو دے دیا' کیوں؟''

صادقہ اپنی کہانی سناتے سناتے بہکنے لگی۔ کفر بکنے لگی تھی۔ مجھ سے خاموش رہا نہ گیا اور بول پڑا۔ ''یہ کیوں بھول رہی ہو کہ عورت کا مقام بلند تر ہے عورت پیغمبروں کو پیدا کرتی ہے لیکن اس میں کوئی کمی ضرور ہے جس کی وجہ سے وہ خود پیغمبر نہیں بن سکی۔ خیر اس بحث کو گولی مارو تم اپنی کہانی سنا رہی تھیں؟''

''ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ میری زندگی کسمپرسی میں گزری۔ ابو کے انتقال کے بعد ایک وقت ایسا آگیا کہ بوڑھی ماں کو بھی کئی کئی دن فاقے کرنے پڑے۔ مجبور ہو کر میں خود نوکری کے لئے نکل پڑی۔ محلے کی بہت سی لڑکیاں آس پاس کی گارمنٹ فیکٹریوں میں کام کرتیں۔ میں نے بھی اسد گارمنٹس پرائزز میں نوکری کر لی۔ صبح نو بجے جاتی شام پانچ بجے لوٹتی۔ تنخواہ معقول تھی۔ ہر ہفتے چھ سو روپے ملتے۔ زندگی کی گاڑی بہ حسن و خوبی چلنے لگی تھی کہ امی کا انتقال ہو گیا۔ میں اکیلی ہو گئی اور ایک دن۔'' وہ رک گئی اور کمرے کی سپاٹ دیوار کو یوں دیکھنے لگی جیسے وہاں فلم چل رہی ہو۔ گزرے ہوئے مناظر نظر آرہے ہوں۔ اس کی آ بھر آئی تھیں۔ ''ایک دن جب میں کارخانے پہنچی تو دیکھا میری سیٹ پر کوئی اور بیٹھا ہے۔ ابھی میں کچھ پوچھتی کہ برابر والی سیٹ کی رخشندہ نے کہا۔ ''تمھیں منیجر صاحب نے اپنے کمرے میں بلایا ہے۔'' میں ان کے کمرے کی جانب چل دی۔ بند دروازے پر دستک دی اور اندر داخل ہو گئی۔ انھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''صادقہ! کل سے تم اسی کمرے میں بیٹھو گی۔ اب تمھیں چیکنگ کے لئے کھڑے ہونے کی

ضرورت نہیں۔۔ یہاں بیٹھ کر سب کا کام لکھا کرنا۔'' ان کی پیشکش عمدہ تھی مجھے خوشی ہوئی لیکن میں حیران بھی تھی۔ اس لیے کہ میں صرف میٹرک پاس تھی؛ مجھ سے پہلے جو لڑکی یہ کام کرتی تھی وہ بی اے تھی۔ اس کی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے مجھے عجیب سا فخر محسوس ہوا لیکن یہ فخر شام کو ذلت محسوس ہونے لگا۔ فیکٹری میں چھٹی ہو چکی تھی۔ سارے کاریگر جا چکے تھے۔ آفس اسٹاف بھی چھٹی کر چکا تھا۔ پوری عمارت میں صرف دو افراد تھے۔ میں اور مینیجر۔ کام کچھ زیادہ تھا اس لیے مینیجر نے روک لیا تھا۔ کام نمٹا ہی رہی تھی کہ وہ اٹھ کر میرے پاس آ گیا۔ بے چارہ بہت جلد باز تھا۔ گرم گرم ہی کھانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں تر نوالہ تو تھی نہیں قلم کو چاقو کی طرح پکڑ کر اس کی آنکھوں میں گھونپ دیا۔ وہ درد کی شدت سے چیخنے چلانے لگا۔ جوش و جذبات میں اتنا بڑا قدم تو اٹھا بیٹھی تھی مگر اس کی تڑپ نے مجھے گھبرا دیا اور میں خوف سے کانپتی، لرزتی باہر نکل آئی تب تک وہ بھی کھڑا ہو چکا تھا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھے مغلظات بکتا ہوا دوڑا۔'' وہ اپنی کہانی سناتے سناتے رک گئی۔

کمرے میں بیٹھے ہر شخص کے چہرے پر تجسس تھا۔ اسے رکتے دیکھ کر جمیلہ بولی۔ ''پھر کیا ہوا؟''

میں نے باہر نکلتے ہی دروازہ بند کیا اور نیچے اتر آئی۔ سیدھی اپنے گھر پہنچی اپنا سامان باندھا اور مالک مکان کو بتائے بغیر نکل پڑی کیوں کہ مجھے مینیجر سے خطرہ تھا۔ وہ پولیس کے ذریعے مجھے سزا دلا سکتا تھا۔ سیدھی اسٹیشن پہنچی اور کراچی کی ٹرین میں سوار ہو گئی۔ لاہور سے آتے وقت میرا ایک ہی آسرا تھا۔ میری ایک سہیلی کا آسرا۔ وہ لوگ لاہور کے تھے اور کراچی منتقل ہو گئے تھے۔ اس کے گھر پہنچنے کے تیسرے روز آصفہ یعنی شاداں سے ملاقات ہو گئی۔ میری طرح اس کی جسمانی ساخت بھی اتنی تبدیل ہو چکی تھی کہ میں اسے پہچان نہ سکی اور نہ یہ مجھ میں پرانی شباہت ڈھونڈ سکی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہم میں سے کسی کو یہ احساس نہ ہو کہ جس بچپن کو شیخوپورہ میں چھوڑ آئے ہیں وہ اتنی دور کراچی آ چکا ہے۔ خیر میں نے پولیس کے ڈر سے اپنا نام بدل لیا تھا۔ اسے بھی اپنا نیا نام بتایا۔ یہ تو پہلے ہی دن میری معتقد ہو گئی تھی۔ جب اس نے سنا کہ میں بے سہارا ہوں تو سہارا دینے کے لئے اپنے گھر لے آئی۔''

''اور تم جمیلہ۔'' میں نے جمو کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میری کہانی مختصر ہے۔ شیخوپورہ سے ابو یہیں آ گئے۔ آئے تھے روزگار کی تلاش میں اور یہیں کے ہو رہے اتفاقاً ایک دن آصفہ سے ملاقات ہو گئی اور میں اس کی دوست بن گئی۔ لیکن تم کیسے پہنچے؟''

میں جواب دینے ہی والا تھا کہ الماری والا چور دروازہ کھلا' وہ بھیانک چہرے والا سہیل داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں شام کا اخبار تھا۔ اس نے ہم سب پر نظر ڈالی پھر بولا۔

''مبارک ہو۔''

''کس بات کی؟''

''سولہ سال بعد ایک دوسرے کو پہچاننے کی۔''

''میرے خیال سے تم آنے سے پہلے ٹیپ ریکارڈ سن رہے تھے۔'' آصفہ نے سہیل سے کہا۔

''تم نے کیسے جانا؟''

''آج کل گرینڈک کے ٹیپ ریکارڈ کا استعمال آؤٹ آف ڈیٹ ہے جبکہ تمھاری الماری کے اوپر اسپول والا ریکارڈر رکھا تھا۔ میں دیکھ کر ہی سمجھ گئی تھی کہ کسی خاص مقصد کے لئے رکھا ہے۔ یقیناً اس کا مائک یہیں کہیں پوشیدہ ہوگا؟''

''تمھارے دماغ کو بار بار داد دینے کا دل چاہتا ہے شاداں!'' سہیل نے آصفہ سے کہا۔

''تعریف کے لئے شکریہ!''

''یہ لو'' سہیل نے شام کا اخبار بڑھایا۔ ''صبح والی خبر چھپ گئی ہے۔''

''آصفہ نے اخبار لے کر دیکھا۔ خبر کی ہیڈ لائن پر نظر پڑتے ہی چیخی۔ ''ارے!''

''کیا ہوا؟'' سب ایک ساتھ اخبار پر جھک آئے اور سرخی پڑتے ہی چونک پڑے۔

سہیل نے ان کی جانب سے نظریں ہٹا کر سگریٹ سلگائی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھرک رہی تھی۔

میں نے اخبار سے نگاہیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا پھر پوچھا۔ ''کیا یہ سچ ہے؟''

''نامہ نگار میرا دوست نہیں ہے۔ اس نے جو دیکھا وہی لکھا۔''

شگفتہ نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔ ''اس کا مطلب ہے آپ نے جو کہا تھا وہ سچ تھا۔ جیل میں میرے پاپا کی جگہ کوئی اور سزا بھگت رہا تھا؟''

''اخبار کی اطلاع تو یہی ہے کہ وہ کوئی اور تھا۔ اس کا پتا تب چلا جب اسے گولی لگی۔ لاش کا معائنہ کرنے کے بعد یہ راز کھلا کہ وہ تمہارے پاپا کی طرح گورا نہیں تھا۔ گندمی رنگت کو

نکھارنے کے لئے اس نے بلیچ کریم کا استعمال کیا اور سفید بالوں پر وِیگ لگا رکھی تھی۔ اس کی کلائی پر ایم جی لکھا تھا جبکہ تمھارے پاپا کی کلائی پر ایسا کچھ نہیں تھا۔ اس کی شکل ملتی جلتی ضرور تھی مگر وہ تمھارا پاپا نہیں تھا۔ اسی لئے اس نے داڑھی رکھ لی تھی۔'' سہیل نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

''اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ آپ کی ساری بات صحیح ہے آپ ہی سہیل انکل ہیں۔'' جمیلہ نے کہا۔

''لیکن میں آپ کی اس بکواس پر یقین نہیں کر سکتی کہ میری ممی پاپا کا قتل عثمانی انکل نے کیا تھا۔'' آصفہ نے کہا۔ ''ان کا قاتل غفار تھا جسے ہم نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔''

''وجہ!'' سہیل نے پوچھا۔

''انھیں میری ممی پاپا سے کیا دشمنی تھی۔ وہ تو ان کے سب سے قریبی دوست تھے۔''

''میں تمھارے ہر سوال کا جواب دینے کے لیے تیار ہوں مگر تمھیں ایک وعدہ کرنا ہوگا۔''

''کیسا وعدہ؟''

''اس راز سے پردہ اٹھانے سے پہلے میں التجا کرتا ہوں کہ تم اول تا آخر خاموش رہو کیوں کہ کئی راز ایسا بھی ہوگا کہ تم جوش و جذبات میں بپھر اٹھوگی۔ حیرت ہی نہیں غصے میں بھی......''

''میں آپ کی الجھی الجھی باتوں کو سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔'' آمنہ نے سہیل کی بات کاٹی۔

''تمھیں وعدہ کرنا ہوگا کہ میری ادھوری بات پر تم بھڑکو گی نہیں بلکہ آخر تک سننے کی کوشش کروگی۔''

''میں وعدہ کرتی ہوں۔'' آصفہ نے کہا۔

رابیل کی کہانی لمبی ہوتی جا رہی تھی اور مجھے گھر بھی جانا تھا پھر بیرا بھی بار بار ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ اتنی دیر سے ہم ٹیبل پر قبضہ کیے بیٹھے تھے اس لیے میں نے کہا کہ'' رابیل تمہاری کہانی دلچسپ بھی ہے اور پر تجسس بھی مگر میں کیا کروں کہ مجھے گھر بھی پہنچنا ہے اس لیے آج یہیں تک، پھر کسی دن میں باقی حصہ بھی سن لوں گا۔''

''کوئی بات نہیں میں آج پہلی بار اتنی تفصیل سے یہ روداد ستم سنا رہا تھا کہ آپ جیسا سامع مجھے پہلی بار ملا تھا ورنہ تو لوگ صرف میرا مذاق اڑاتے ہیں۔'' رابیل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ایسا کرتے ہیں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دیتا ہوں پھر میں واپس اپنے گھر چلا جاؤں گا۔''

''نہیں ایسی بھی جلدی نہیں ہے۔ میں چلا جاؤں گا۔'' وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔

''وہ میری بس آ رہی ہے میں چلا جاؤں گا۔''

میں وہاں سے سیدھا گھر آ گیا۔ دروازہ پار کرتے ہی میرے ذہن میں پھر وہی رات والی بات گونجنے لگی کہ ایسی کیا بات ہے جس کی وجہ سے موم میری شادی فہمیدہ سے کرانے پر تلی ہیں۔ ایک بھائی سے بہن کی شادی کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ ناممکن بات ہے یا پھر.....اس سے آگے میں کچھ سوچتا کہ فہمیدہ نے مجھے دیکھ لیا اور چیخی ''ارے جناب آپ تھے کہاں؟ میں کب سے آپ کی منتظر بیٹھی ہوں۔ مجھے ایک ضروری کام سے خالہ جانی کے یہاں جانا ہے۔''

''ارے پاگل لڑکی ابھی تو وہ اندر داخل بھی نہیں ہوا ہے اور تم نے شور مچانا شروع کر دیا۔'' موم نے اسے ڈانٹا۔

''کوئی بات نہیں، چلو میں تیار ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''بس دو منٹ میں کپڑے چینج کر کے آتی ہوں۔'' کہتی ہوئی فہمیدہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

''بیٹا چائے بناؤں؟ پیوگے؟'' موم نے پوچھا۔

''جی نہیں، میں چائے بہت کم پیتا ہوں۔'' ابھی میں نے جواب دیا تھا کہ فہمیدہ آ گئی اس نے موم کی طرف دیکھ کر پوچھا:

''کیا بات ہے، آپ نہیں جائیں گی؟''

''مجھے کون سے کپڑے بدلنے ہیں جو پہن رکھا ہے یہی بہت ہے۔''

گویا موم بھی جانا چاہ رہی تھیں اس لیے میں سوچ میں پڑ گیا کہ ایسی کیا بات ہے جو یہ بھی اتنی جلدی دوبارہ جانا چاہ رہی ہیں۔ مگر یہ سوچنے کا موقع نہیں تھا۔ وہ دونوں باہر نکل رہی تھیں اس لیے میں بھی ان کے ساتھ باہر آ گیا اور ان کو لے کر ڈیفنس جانے والی شاہراہ پر چل پڑا۔

خالہ جانی کے یہاں پہنچا تو عنبر مجھے دوبارہ دیکھ کر خوش ہو اٹھی۔ ''واہ آج تو قسمت کا ستارہ عروج پر ہے۔ جناب کی تشریف آوری دوبارہ غریب خانے پر.......زہے نصیب۔''

''ہم کیوں آئے ہیں یہ سنو گی تو اور بھی خوش ہو جاؤ گی۔'' موم نے کہا تو میرا دل دھڑک اٹھا مجھے لگا جیسے فہمیدہ نے بتا دیا ہے کہ عنبر میرے بارے میں پسندیدگی کا جذبہ رکھتی ہے۔

یہ سوچ کر ہی میرا دل خوش ہو اٹھا کہ موم نے اپنا ارادہ تبدیل کر کے عنبر کا رشتہ لے کر آئی ہیں۔

موم کی آواز سن کر خالہ جانی اپنے کمرے سے نکل آئیں ''ارے آپ وہ بھی اکیلے؟''

"اکیلے کہاں' میرا بیٹا بھی تو ساتھ ہے۔" موم نے پیار سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

عنبر گلاس میں شربت لے آئی تھی۔ موم کو تھما کر میری طرف دیکھتے ہوئے شوخی سے بولی "آپ کو تو شربت کی حاجت نہیں ہوگی۔ منہ تو ویسے ہی میٹھا ہو رہا ہوگا۔"

اس کی بات پر سب مسکرا دیئے۔ لاؤنج ہی میں سب بیٹھ گئے تھے۔ عنبر شربت کا گلاس لے آئی اور میری طرف بڑھاتے ہوئے آہستہ سے بولی "نظروں سے پینے کے بعد حاجت یوں بھی ختم ہو جاتی ہے۔"

میں مسکرا کر رہ گیا۔ خالہ جانی نے موم سے کہا "آپا آپ کا بیٹا ہندوستان جانا چاہ رہا ہے۔ باجی کی خواہش پر مشکور نے ان کے لیے وہاں جانے کا انتظام کر دیا۔ کہیں یہ حسرت لے کر وہ قبر تک نہ پہنچ جائیں اسی لیے۔"

"اچھا چلو یہ بھی اس ملک کو دیکھ لے گا۔" موم نے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے کہ وہاں سے آتے ہی اس کے لیے کوئی لڑکی دیکھ کر شادی کرا دیں۔"

"میں اسی سلسلے میں تو آئی ہوں' تمہارا خیال صحیح ہے کہ داؤد کے پیروں میں بیڑی ڈال ہی دینی چاہیے۔ ویسے جانے کا کیا پروگرام ہے؟" موم نے پوچھا۔

"مشکور جانے وہی سب انتظام کر رہا ہے۔ اس کی بیوی بھی اپنے بھولے بسرے رشتے داروں سے ملنا چاہ رہی ہے' وہ بھی ساتھ جائے گی۔ ویزا کے لیے اس نے کسی سے کہا ہے۔ ویزا ملتے ہی یہ لوگ چل دیں گے۔"

ابھی باتیں جاری تھیں کہ عنبر نے آواز دی "امی یک شد نہ دو شد چہار شد' رابیل بھائی اپنی زوجہ محترمہ کے ساتھ خراماں خراماں تشریف لا رہے ہیں۔"

مجھے ہنسی آ گئی' اس کی بات یا انداز پر نہیں' اس بات پر کہ اس کی مکمل کہانی سننا یقینی ہے۔ تبھی دروازہ کھلا اور رابیل اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک بھاری بدن کی لڑکی بھی تھی۔ اس کی بیوی کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا مگر وہ مجھے دیکھتے ہی بڑے تپاک سے مخاطب ہوئی "داؤد صاحب آپ' خاندان بھر میں اس وقت آپ ہی کے تذکرے ہیں۔"

میں مسکرا کر رہ گیا۔ رابیل نے میری طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "ارے بھائی داؤد یہاں کیا بیٹھے ہو۔ آؤ اوپر ٹیرس پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ بقیہ کہانی سنانا چاہتا ہے۔ یوں تو اس کی کہانی دلچسپ تھی مگر ابھی بہت

باقی بھی تھی اس لیے میں اس کے ساتھ ٹیرس پر کھلی ہوا میں آ گیا۔ وہاں بید کی کئی کرسیاں بچھی تھیں۔ شاید وہاں گھر والے بیٹھتے ہوں گے۔ ہم آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

وہ بولا "تو میں نے کہاں تک واقعہ سنایا تھا؟"

"سہیل اور آصفہ میں بحث ہو رہی تھی کہ وہ سہیل کی باتوں کے درمیان غصہ نہیں کرے گی۔" میں نے یاد دلایا۔

"تو آگے سنئے۔" رابیل نے کہا اور جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا پھر بولا "میں بتا رہا تھا کہ سہیل ہمیں پرانی باتیں یاد دلا رہا تھا اس نے جلی ہوئی اور ٹیڑھی میڑھی انگلیوں میں پھنسے سگریٹ کا لمبا کش لے کر کہا۔ "شاداں تم آصف علی کی بیٹی نہیں ہو مگر تمھاری ماں کا نام شاداں ہی ہے۔"

"نہیں!" بھیانک غراہٹ کے ساتھ آصفہ جھپٹی۔ اس نے کراٹے کا بھرپور وار کرنے کے لئے ہاتھ اٹھا لیا تھا کہ میں نے آگے بڑھ کر اسے پیچھے کھینچ لیا۔

"نہیں' میں اس کمینے کو زندہ نہیں چھوڑوں گی اس نے میری ماں پر الزام لگایا ہے۔ میری ماں کو آوارہ کہا ہے۔" آصفہ چیخے جا رہی تھی۔

"پہلا جملہ سنتے ہی تم اپنا وعدہ بھول گئی ہو شاداں۔" سہیل کے جھلسے ہوئے چہرے پر عجیب سا تناؤ تھا۔ "میں نے کہا تھا کہ ادھوری بات سنتے ہی جذبات پر قابو رکھو گی جملہ مکمل ہونے دو گی۔"

"وعدے کا یہ مطلب نہیں جو منہ میں آئے بکے جاؤ۔" آصفہ دھاڑی۔

سہیل نے اپنے بھیانک چہرے کو گھما کر ایک کے بعد ایک سب کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی پھر بولا۔ "میں ثبوت پیش کر سکتا ہوں۔"

"کیسا ثبوت؟" آصفہ نے دانت پیس کر کہا۔

"جو کہا ہے اس کا ثبوت۔" سہیل مسکرا کر بولا۔

"یعنی!" آصفہ کی آواز کانپ گئی۔ "تم ایسا ثبوت پیش کر سکتے ہو جس سے یہ ثابت ہو جائے کہ میں......" وہ بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو گئی۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی اور چہرہ بھی روہانسا ہو گیا تھا۔

"ہاں!" سہیل نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکالتے ہوئے کہا۔ لمحہ

کے انداز میں آصفہ نے وہ لفافہ اس کے ہاتھ سے اچک لیا اس لفافے سے تین فوٹو نکل کر بکھر گئے۔ دوالٹے گرے تھے ایک سیدھا سیدھے فوٹو میں شادو تھی اور عثمانی تھا۔ عثمان کا داہنا بازو شادو کی کمر میں لپٹا ہوا تھا اور شادو کا سر اس کے کندھے سے ٹکا تھا۔ دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اپنی ماں کو اتنی آسانی سے وہ اس لیے پہچان گئی تھی کہ اس کے پاس ماں کی جوانی کا ایک فوٹو تھا۔ عثمانی کی تصویر کو شگفتہ نے پہچانا تھا۔ اس تصویر کو دیکھ کر آصفہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا پھیل گیا۔

میں نے بقیہ تصویروں کو بھی الٹ دیا۔ ایک دوسری تصویر میں شادو عثمانی کی گود میں سر رکھے لیٹی تھی۔ تیسری تصویر بھی محبت کی نشانی تھی۔

آصفہ نے سر تھام لیا اور پھٹی پھٹی نظروں سے سہیل کو دیکھ رہی تھی۔

''بیٹی! میں نے اب تک یہ نہیں کہا کہ تمھاری ماں بدکردار تھی اور تم ان کی ناجائز اولاد ہو۔ شادو بھابی میری بہن کی طرح تھیں۔ میں ان پر الزام لگانے سے پہلے خود مر جاؤں گا۔''

''تو......تو کیا میرے ابو آصف علی سے ان کا کوئی رشتہ نہیں تھا؟'' آصفہ بولی۔

''آصف بھیا نے شادو بھابی سے اس وقت شادی کی تھی جب عثمانی لاہور میں ٹریننگ حاصل کر رہا تھا۔ اس کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کی شادی تو تب ہوئی تھی جب تم شادو بھابی کے پیٹ میں تھیں اور......'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ باہر والے دروازے پر دستک ہوئی۔ سہیل نے بتایا تھا کہ ادھر والا دروازہ بند رہتا ہے لیکن دستک اسی دروازے پر ہوئی تھی۔

''لگتا ہے وہ آگیا۔'' کہتے ہوئے سہیل اٹھ گیا۔ اس نے جا کر دروازہ کھولا۔ اندر آنے والے کو دیکھ کر ہم سب حیرت زدہ رہ گئے۔ اندر آنے والا میرا دوست کمال تھا۔ وہی کمال جس کی مدد سے میں نے آصفہ، جمیلہ اور صادقہ کو گرفتار کیا تھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

''کمال عرف کمالے!'' سہیل نے کہا۔ یہ ہیں تمھارے وہ دوست جن کی تمھیں تلاش تھی۔ اپنے بچپن کے ان دوستوں سے ملو۔ یہ آصفہ عرف شاداں ہے۔ یہ صادقہ عرف حوراں ہے۔ یہ شگفتہ عرف شگو ہے یہ جمیلہ عرف جمو ہے اور یہ رابیل عرف رابو ہے۔''

کمال مجھ سے لپٹ گیا۔ ''دوست ہم اتنے قریب رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے کتنے حیرت کی بات ہے۔''

''رابیل خدا کے لئے خاموش رہو۔'' آصفہ نے بھرائی آواز میں کہا۔ ''ہاں انکل آپ

بتا رہے تھے میرے پاپا آصف علی کی شادی ہوئی تھی۔''

''شادی کے ایک سال بعد ہی تمھاری امی اور ابو کے درمیان ایک نظر نہ آنے والی خلیج حائل ہوگئی تھی۔ دراصل تمھارے ابو میں کچھ کمی تھی۔ اس کی تصدیق لاہور کے ایک ڈاکٹر نے بھی کی تھی۔ کمی تمھارے ابو میں تھی اور تمھاری دادی کا الزام تمھاری امی پر تھا۔ وہ شادو بھابی کو طلاق دلوانے پر تل گئی تھیں۔ آصف بھیا عقل مند تھے۔ جو بھی آئے گی اسے یہ کمی کھلے گی۔ ہوسکتا ہے وہ اس راز کو طشت ازبام کر دے۔ پھر وہ بھابی کو دل و جان سے چاہتے بھی تھے۔ بھابی بھی انھیں چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں۔ صرف تنگ تھیں۔ اگر تمھاری دادی کے الزامات کی بوچھار نہ ہوتی تو شاید وہ کبھی اف بھی نہ کرتیں۔ تمھاری دادی کی وجہ سے دونوں مجبور ہوگئے۔ آصف بھیا نے بھابی کو مجبوراً طلاق دے دی۔ اسی دوران میں عثمانی شیخوپورہ آگیا۔ وہ نیا تھانے دار بن کر آیا تھا۔ اس کی دوستی مجھ سے ہوگئی۔'' سہیل کچھ دیر کے لئے رکا اور پھر بولا۔ ''شاید تمھیں یاد نہ ہو۔ میں وہاں شراب بیچنے کا دھندا کرتا تھا۔ اس وقت پابندی بھی نہیں تھی مگر پولیس والے بھتا لیتے تھے۔ عثمانی نے آتے ہی مجھ سے ملاقات کی تھی اور کہا تھا کہ اب کھل کر دھندا کرو اگر چاہو تو جوئے کا اڈہ بھی لگا سکتے ہو۔ میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا تو آمدنی بڑھ گئی۔ آصف بھیا میرے برابر والے مکان میں رہتے تھے۔ انھیں میرا دھندا پسند نہیں تھا لیکن......'' سہیل انکل پھر رک گئے۔

''پھر کیا ہوا انکل؟'' آصفہ نے پوچھا۔

''لیکن ہم بچپن کے دوست تھے اس لئے ملتے رہے۔ میں نے ہی ان کی ملاقات عثمانی سے کرائی تھی۔ عثمانی باتیں کرنے کا فن جانتا تھا۔ اس نے کچھ ہی دنوں میں انھیں اپنا معتقد بنا لیا۔ وہ ان کے گھر بھی جانے لگا۔ آصف بھیا نے اسے دوست سمجھ کے بتایا کہ میں نے غلطی سے بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ تم حلالہ کر دو۔ وہ راضی ہوگیا اور گھر آ کر خاموشی سے بیوی کو طلاق دے دی۔ ان کا منصوبہ تھا کہ اس طرح حلالہ ہو جائے گا اور ان کی دلی مراد بھی پوری ہو جائے گی۔ عثمانی کو اصل بات کا پتا نہیں تھا۔ وہ ہر روز رات میں ان کے گھر آ جاتا۔ لوگ سمجھتے کہ وہ اکیلا ہے اس لیے تھانے کے بجائے ان کے گھر میں سوتا ہے۔ آہستہ آہستہ ایک سال چھ ماہ گزر گئے مگر وہ طلاق دینے پر راضی نہ تھا۔ اس کی وجہ تمھاری پیدائش تھی۔ اس کے ماں باپ نے اس دوران میں اس کی شادی کرادی تھی پھر بھی وہ اپنی بیوی کو لانے گھر نہیں جا رہا تھا۔ آخر میں نے ہی درمیان میں پڑ کے معاملہ رفع دفع کروایا۔ عثمانی کو طلاق دینے پر مجبور کر دیا۔ عثمانی چاہتا تھا

کہ تمھیں بھی لے جائے مگر میں نے دھمکی دی کہ اگر تم نے زیادہ شور شرابا کیا تو میں ایس پی صاحب سے شکایت کروں گا۔ ان دنوں ایس پی کے ریڈر سے میری دوستی تھی اسی لئے وہ دباؤ میں آ گیا اور خاموش بیٹھ گیا میرے ہی زور دینے پر وہ اپنی بیوی کو لے آیا۔ اس کے گریز سے بیوی کے دل میں شک کی گرہ بڑھ گئی تھی وہ اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھنے لگی تھی۔'' سہیل نے رک کر گہری سانس لی۔

ہم سب ہمہ تن گوش تھے۔ کمال بھی پوری دلچسپی سے کہانی سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔
''پھر کیا ہوا؟''

''بیٹی شاداں، تمھاری امی کردار کی کتنی پختہ تھیں اس کا ثبوت یہ خط ہے۔'' انھوں نے جیب سے نکال کر خط بڑھایا۔

''آصفہ نے تیزی سے خط جھپٹ لیا۔ خط پر میں بھی جھک گیا۔ لکھا تھا۔ ''عثمانی صاحب! شادی شدہ عورت تب تک ادھوری رہتی ہے جب تک وہ ماں نہ بنے۔ ہر عورت کے دل میں سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ ماں بنے، تخلیق کے کرب ناک مراحل سے گزرے۔ اسی لیے میں نے اپنے شوہر کی بات مان لی تھی۔ جو آپ نے چاہا آپ کو مل گیا جو میں نے چاہا مجھے مل گیا۔ اب میری ایک ہی التجا ہے کہ ان باتوں کو بھول جائیے۔ مجھے بھلا دیجیے۔ اور شگفتہ کی پرورش پر دھیان دیجیے۔ ورنہ سب کی زندگی برباد ہو کر رہ جائے گی۔ یوں بھی آپ میرے کوئی نہیں ہیں۔ آپ سے شاداں کا رشتہ ہے، مجھ سے نہیں۔ فقط شادو۔''

خط باری باری سب نے پڑھا۔ سب کے چہرے پر عجیب سا تناؤ چھا گیا تھا۔ کمرے میں خاموشی طاری تھی۔ اس خاموشی کو سہیل نے توڑا۔ ''اس خط کی روشنی میں سوچو شادو بھابی کا کردار بے داغ تھا۔ وہ اولاد کی محبت میں عثمانی کے قریب گئی تھیں اور صحیح راستے پر بڑھی تھیں، انھوں نے جو کچھ کیا شرع کے مطابق کیا۔ گناہ نہیں کیا۔''

''لیکن انکل میرے پاپا نے شادو آنٹی اور آصف انکل کا قتل کیوں کیا؟'' شگفتہ بھی خاموش نہ رہ سکی۔

''اس کا جواب یہ خط ہے۔'' سہیل انکل نے دوسرا خط بڑھایا۔ ہم سب اس خط پر جھک گئے۔ لکھا تھا۔ ''عثمانی صاحب! اپنے خط میں آپ نے مجھے جی بھر کے گالیاں دی ہیں۔ گھٹیا درجے کی زبان استعمال کی ہے۔ مجھے اور میرے فرشتہ جیسے شوہر کو قتل کر دینے کی دھمکی بھی دی ہے

کہ میں اب گناہ کے راستے پر چلوں، آپ سن لیں۔ میں نے جو کچھ کیا وہ گناہ نہیں تھا۔ طلاق کے بعد عورت کسی بھی دوسرے مرد سے نکاح کر سکتی ہے۔ لیکن بغیر نکاح کے کسی کے پاس جانا گناہ عظیم ہے اور میں اسے گوارہ نہیں کر سکتی، اگر آپ نے زیادہ زور زبردستی کی یا پولیس والا حربہ استعمال کیا تو یاد رکھیے میں خودکشی کر لوں گی اور مرنے سے پہلے ایس پی صاحب کے نام ڈاک کے ذریعے خط بھیج دوں گی کہ آپ کے ظلم سے تنگ آ کر میں نے خودکشی کر لی ہے۔''

خط پڑھ کر میں نے کہا۔ ''ان خطوط سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ آنٹی کا کردار بے داغ تھا مگر انھوں نے قتل کیوں کیا اس کا راز تو ہنوز مخفی ہے؟'' شگفتہ بولی۔

''آگے کی کہانی خود ثبوت پیش کرے گی۔ عثمانی نے اپنا جرم قبول کر لیا ہے۔''

''کب اور کیسے؟''

جواب دینے سے پہلے سہیل انکل نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلا اور گلا صاف کرنے کے لئے کھنکارنے تبھی جمیلہ نے کہا۔ ''انکل یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ جب عثمانی انکل نے آصفہ کو پہچان لیا تھا تو پھر اس کی زندگی سے کھیلنے کی تیاری کیوں کرنے لگے۔ انھیں جب معلوم ہو چکا تھا کہ آصفہ کی شادی رابیل سے ہو چکی ہے تو پھر انھوں نے شگفتہ کے ساتھ شادی کیوں کرانی چاہی۔ کیا اس طرح دونوں کی زندگی برباد نہ ہو جاتی۔ کیا دونوں کا نکاح فسخ نہ ہو جاتا۔''

''نکاح فسخ نہیں ہوتا۔'' سہیل انکل بولے۔

''دو بہنیں ایک ہی شخص کے نکاح میں کیسے رہ سکتی ہیں؟''

''وہ بہنیں نہیں ہیں۔ شگفتہ عثمانی کی بیٹی نہیں ہے۔'' سہیل انکل نے گہری سانس لی۔
''وہ میری بیٹی ہے۔''

''آپ کی بیٹی ہوں؟'' شگفتہ اچھل پڑی۔

صرف وہ ہی نہیں، ہم سب بھی خیریت زدہ رہ گئے تھے۔ عقل حیران تھی کہ ایسے ایسے راز سے پردہ اٹھ رہا ہے جو دماغ کی چولیں ہلائے دے رہے ہیں۔

سہیل انکل نے جیب سے ایک دوسرا لفافہ نکالا۔ اس میں سے کچھ کاغذات نکال کر دیتے ہوئے بولے۔ ''یہ ہے وہ ثبوت شیخوپورہ کے اسپتال کا بنا ہوا برتھ سرٹیفکیٹ۔''

باری باری سے ہم سب نے دیکھا۔

میری اور عثمان کی بیوی کو

جنم لیا۔ تمھیں جنم دیتے وقت تمھاری ماں مرگئی اور عثمان کی بیوی کو مرا ہوا بچہ پیدا ہوا۔ تمھاری ماں کے مرجانے سے تمھاری پرورش میرے لئے مسئلہ بن گئی تھی۔ ادھر عثمان اپنی بیوی کی وجہ سے پریشان تھا۔ وہ تو پہلے ہی کمزور تھی اگر اسے یہ خبر مل جاتی کہ اسے مرا ہوا بچہ پیدا ہوا ہے تو وہ بھی مر جاتی۔ آصف بھیا کے سمجھانے پر میں نے تمھیں لے جا کر عثمانی کی بے ہوش بیوی کے پہلو میں سلا دیا۔ ڈاکٹروں نے اعتراض کیا تو ہم نے لکھ کر اسپتال میں دے دیا۔ برتھ سرٹیفکیٹ کے ساتھ وہ ایگریمنٹ بھی ہے۔"

ہم سب نے ایگریمنٹ بھی پڑھا۔ سب کچھ صاف لکھا تھا۔

"لیکن اب بھی یہ بات صاف نہیں ہوئی کہ میری ممی پاپا کا قتل عثمانی انکل نے کیا۔"

"جس طرح میں نے یہ ثبوت اکٹھا کیا ہے اسی طرح وہ ثبوت بھی ہے۔" سہیل انکل مسکرائے۔ "کیوں کہ یہ میری زندگی اور موت کا سوال تھا۔ اپنی ہستی کو بچانے کے لئے مجھے ان ثبوت کو حاصل کرنا ہی تھا۔"

"آپ کی ہستی خطرے میں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں! کیوں عثمانی ترقی کرتے کرتے لکھ پتی بن گیا تو میں بھی جرم کے راستے پر بڑھتے بڑھتے ہیروئن کنگ بن گیا۔ میں ہی شیر خان ہوں۔ شیر خان' کنگ آف انڈر ورلڈ۔"

ہم سب اچھل پڑے اور سہیل انکل کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگے۔ چہرے خوف سے سیاہ پڑ گئے تھے۔" رابیل ابھی اور کچھ بتاتا کہ عنبر نے آ کر کہا۔

"چلیے سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ کچھ کھا پی لیں تو باتوں میں مزہ بھی آئے گا۔"

ہم نہ چاہتے ہوئے بھی نیچے آ گئے۔ خالو جان اور تحسین خالہ جانی کے ساتھ رضیہ خالہ بھی بیٹھی تھیں۔ موم کے چہرے پر مشفق مسکراہٹ تھی۔ وہ محبت پاش نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ رابیل نے کہا "خالہ جان ایسے تو نہ دیکھیں' بے چارے کو نظر لگ جائے گی۔"

"بیٹا! ماں کی نظر بچوں کے لیے اکسیر ہوتی ہے۔ میرا بیٹا اتنے عرصہ بعد آیا ہے۔ میں اس کا ہر لحہ اپنی آنکھوں میں قید کر لینا چاہتی ہوں۔" موم کا لہجہ مٹھاس میں ڈوبا ہوا تھا۔

"ارے بڑی خالہ کبھی ہم جیسے قسمت کے ماروں پر بھی نظر ڈال لیا کریں۔" عنبر ہنستے ہوئے بولی۔

"ارے بیٹا یہی تو دنیا ہے۔ بیٹا اور وہ بھی اتنی دور سے آیا ہو اور مہمان بھی ہو تو اس

کے آرام آسائش کا خیال رکھنا ہی پڑتا ہے۔" موم نے کہا۔

"اے رابیل تم تو بیچ میں مت بولو۔" رضیہ خالہ بولیں۔

"کیوں' ان کے بولنے پر پابندی ہے کیا؟" عنبر نے رضیہ خالہ کو چھیڑا۔

"آ گئیں حمایتی' تمہیں دخل دینے کے لیے کس نے دعوت دی ہے۔" رضیہ خالہ نے جل کر جواب دیا۔

"ارے خالہ میں نہیں بولوں گی تو پھر بھابی بولیں گی اور وہ جب بولیں گی تو آپ کو بھاگتے راستہ نہیں ملے گا۔" عنبر نے منہ دبا کر کہا تو رابیل کی بیوی بھی ہنسنے لگی۔

"اے عنبر کی بچی میرے منہ مت لگیو۔" رضیہ خالہ چیخیں۔

"کہاں ہے؟" عنبر بولی۔

"کون؟" رضیہ خالہ نے پوچھا۔

"میری بچی!" عنبر نے کہا۔

"کون بچی؟"

"ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ عنبر کی بچی' کہاں ہے وہ؟ میں بھی تو اسے دیکھوں کیسی ہے وہ۔"

"بے شرم کہیں کی۔" خالہ نے جلے بھنے انداز میں کہا۔

"اس میں بے شرمی کی بات کیا ہے' میں بھی تو دیکھوں میری بچی ہے کہاں' ابھی تو میری شادی بھی نہیں ہوئی اور بچی بھی آ گئی۔ اسی لیے تو میں دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"اسی کو کہتے ہیں دیدے کا پانی مرجانا۔ ذرا بھی حیا شرم نہیں ہے۔ کس بے شرمی سے میری بچی میری بچی کہے جا رہی ہے۔ یہ کنواریوں کے لچھن ہیں۔ ابھی چل تو رہی ہو۔ دیکھ لینا کیسے ادب آداب والی سرزمین پر ہم جا رہے ہیں۔ جہاں کنواری لڑکیاں سر نہیں اٹھاتیں۔" رضیہ خالہ کا ریکارڈ بجنے لگا۔ بات لمبی نہ ہو جائے اس لیے موم نے جلدی سے کہا:

"چھوڑیئے بھی آپا آپ بھی کس کی باتوں میں آ گئیں۔ یہ تو آپ کو چھیڑتی ہی رہے گی۔" پھر میری طرف مڑ کر بولیں تم تو کھاؤ' اور اے عنبر تیرے ڈیڈ کہاں ہیں۔ ان کو بھی تو بلاؤ۔"

"خالہ وہ جائے نہ جائے' مشکور سے میں کہنے والا ہوں کہ وہ میرا ویزا بھی لگوا

دے۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔''

''باپ رے باپ' آپ بھی جائیں گے؟ تب تو میں نہیں جانے والی۔ آپ ہر ہر قدم پر ٹوکیں گے' یہ کرو وہ نہ کرو۔''

''یہ تو ہوگا۔'' رابیل ہنس کر بولا۔

تبھی خالو جو کافی دیر پہلے اٹھ کر چلے گئے تھے۔ کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی کہا۔ ''داؤد میاں تیاری کرلو کل ہی مشکور پنڈی جا رہا ہے۔''

''مجھے تیاری کیا کرنا ہے۔ سب کچھ ریڈی ہے۔ میں برٹش نیشنل ہوں اس لیے مجھے ویزا کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ائر پورٹ پر اترتے ہی ویزا کی مہر لگ جائے گی۔''

''میں بھی جا رہا ہوں۔ رات میں اپنا پاسپورٹ دے جاؤں گا۔ مشکور سے کہیے گا وہ اس پر بھی ویزا لے لے۔''

''تم اکیلے جاؤ گے یا بیوی بھی جائے گی۔''

''نہیں میں اکیلا جاؤں گا۔''

''یہ اچھا بھی رہے گا کیوں کہ داؤد اکیلا آپا کو اور مشکور کی بیوی کو سنبھال نہیں پائے گا۔ تم ساتھ رہو گے تو آرام رہے گا۔''

''یہی سوچ کر تو میں نے پروگرام بنالیا ہے۔'' رابیل نے جواب دیا۔

''باتوں کے ساتھ کھاتے بھی جاؤ۔'' تحسین خالہ نے ٹوکا تو میں نے چمچے کی رفتار بڑھا دی۔ پاکستانی کھانے مجھے اچھے لگتے تھے اس لیے کچھ زیادہ ہی کھالیا پھر اٹھ کر رضیہ خالہ کے کمرے میں آگئے جہاں پہلے سے ہی سب جمع تھے یعنی فہمیدہ' عنبر اور رابیل۔ عنبر بار بار رضیہ خالہ کو چھیڑ رہی تھی اور وہ جز بز تھیں۔ ہنسی ٹھٹھول میں وقت کا پتا ہی نہیں چلا اور شام گھر آئی۔

''داؤد اب گھر بھی چلنا ہیں۔ تمہارے ڈیڈی آگئے ہوں گے۔'' موم نے کہا تو محفل برخاست ہوئی۔ ہم لوٹ آئے۔

وہاں سے آنے کے چوتھے روز خبر آگئی کہ ان لوگوں کی تیاری مکمل ہوگئی ہے۔ ویزا بھی مل گیا ہے۔ تحسین خالہ کے بیٹے مشکور نے اپنی بیوی سلمیٰ کو بھی ساتھ کر دیا تھا۔ جبکہ مشکور کا بیٹا ابھی صرف سوا سال کا تھا۔ دراصل سلمیٰ بھابی کے بھی کچھ رشتے دار انڈیا میں رہتے تھے۔ وہ بھی ان لوگوں سے ملنے کو بے چین ہوگئی تھیں۔ عنبر تو ساتھ تھی ہی۔

ہم سب بذریعہ ہوائی جہاز دہلی کے پالم ایئر پورٹ پر اترے اور پھر وہاں سے نئی دلی جنکشن پہنچے۔

اس عظیم الشان اسٹیشن کے ایئر کنڈیشنڈ ویٹنگ روم میں چار گھنٹے رکے' نہا دھو کر تازہ دم ہوئے اور پھر راج دھانی ایکسپریس سے پٹنہ کے لئے چل پڑے۔ کیونکہ راج دھانی ایکسپریس سیدھی نکل جاتی تھی جب کہ ہمیں صاحب گنج لوپ لائن کی گاڑی پکڑنی تھی۔ رات بارہ بجے تک میں کھڑکی سے لگا بیٹھا رہا پھر سو گیا۔ صبح آٹھ بجے ہم مغل سرائے کے اسٹیشن پر پہنچے۔ یہاں کافی دیر گاڑی کو رکنا تھا۔ اب تک اسے الیکٹرک انجن چلا رہا تھا مگر اب اس میں کوئلے کا انجن جوڑا جا رہا تھا۔ یہاں سے اسے لوپ لائن پر مڑنا تھا اور اس لائن پر الیکٹرک انجن چل نہیں سکتی تھی کیوں کہ اب تک اس ٹریک پر تار نہیں لگایا گیا تھا۔ میں نے یہاں اتر کر رابیل کے کہنے پر پہلی بار پان کھایا۔ خالہ نے اتنی بار تعریف کی تھی کہ بنارس کے پان کا کیا کہنا۔ حلوا ہوتا ہے حلوا اور میں نے کھالیا تھا۔

جو پان کے عادی ہوں گے انھیں ضرور اچھا لگتا ہوگا مگر میرا تو منہ کڑوا ہو کر رہ گیا۔ خیر وہاں سے گاڑی چلی تو آرا' بکسر' دانا پور ہوتی ہوئی پٹنہ پہنچی۔ خالہ نے بتایا کہ یہ شہر مغلوں کے دور میں عظیم آباد کہلاتا تھا۔ اس سے پہلے پاٹلی پترا اور اب پٹنہ کہلاتا ہے۔ یہیں سکھ مذہب کے چھٹے گرو گوبند سنگھ کی سمادھی ہے اس وجہ سے اسے سکھ مذہب والے بہت اہمیت دیتے ہیں۔

پٹنہ میں ہی شام ہوگئی تھی۔ اس لیے ہم سب پٹنہ جنکشن سے رکشا کے ذریعہ سبزی باغ آئے اور پٹنہ لاجنگ میں ایک رات کے لیے رک گئے۔ ہمارے پاس کافی وقت تھا کیونکہ بھاگل پور کی جانب جانے والی ٹرین صبح کو ملتی۔ میں نے نوابوں کے اس حسین شہر کی سیر کا پروگرام بنایا اور سب کو لے کر چل پڑا۔ ہماری اصل رہبر خالہ تھیں۔ ان پر تو جیسے جوانی آگئی تھی۔

ہم نے باہر کھڑے سائیکل رکشوں کی قطار میں سے دو رکشے لئے اور ان پر سوار ہو کر بانکی پور کی رنگینی دیکھنے چل پڑے۔ گاندھی میدان' الفسٹن' مراد پور غرض کہ ہر اس جگہ کی سیر کر ڈالی جسے دوبارہ دیکھنے کی خالہ کو حسرت تھی۔ اس سیر سپاٹے میں بارہ بج گئے۔ کھانا ہم نے سبزی باغ کے ایک صاف ستھرے ہوٹل میں کھایا تھا اور اب پٹنہ لاجنگ کی جانب لوٹ رہے تھے۔

پٹنہ لاجنگ میں لوٹے تو سب تھکن سے چور تھے۔ سلمیٰ نے کہا'' بھئی میں تو چلی سونے

اور وہ کمرے میں چلی گئی۔ خالہ کچھ دیر تک تو اپنی راگنی الاپتی رہیں کہ یہ بہت پرانا شہر ہے۔ حضرت عیسٰی سے بھی قبل یہ شہر آباد تھا۔ سمراٹ اشوک کے دادا نے اس شہر کی بنیاد رکھی تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہ بھی سونے چلی گئیں۔ اب ٹیرس پر صرف میں اور رابیل باقی رہ گئے تھے۔ بازار میں اب تک چہل پہل باقی تھی۔ لوگ آجا رہے تھے۔ سائیکل رکشا کی گھنٹی رہ رہ کر بج رہی تھی۔ میں نے نیچے دیکھتے ہوئے کہا ''رابیل صاحب ایسا کریں کہ اس دن آپ نے جہاں سے کہانی چھوڑی تھی وہیں سے سنادیں۔''

''گویا آپ کو میری آپ بیتی اچھی لگی ہے؟'' رابیل بولا۔

''تجسس ہی اتنا ہے اس کہانی میں کہ میرے جیسا آدمی جو کہانی قصے میں دل نہیں لگاتا وہ بھی دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا۔''

''تو سنیں' جیسے ہی اس نے کہا کہ میں ہی شیر خان ہوں تو ہم سب پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ کمرے میں ایسی گہری خاموشی طاری ہو گئی تھی کہ اگر سوئی بھی گرتی تو اس کی آواز دور تک سنائی دیتی۔

اس خاموشی کو کمال نے توڑا۔ ''شیر خان! تم نے ہمیں قیدی بنایا ہے؟''

''نہیں بیٹے! میں دنیا والوں کے لئے شیر خان ہوں مگر تم لوگوں کے لئے وہی سہیل ہوں میرے بچو! تم تو مجھ سے نفرت نہ کرو۔''

''تم سے نفرت کیسے نہ کروں؟ تم نے مجھے اور شگفتہ کو ہیروئن کا عادی بنایا۔ وہ تو جیل کی سختی اور ہماری قوت ارادی تھی کہ ہم نے اس لت کو چھوڑ دیا۔''

''یقین کرو بیٹے! میں نے تمھیں ہیرونچی بنایا نہ شگفتہ کو۔ یقیناً یہ شوشہ عثمانی نے چھوڑا ہوگا کیونکہ اب......'' سہیل بولتے بولتے خاموش ہو گئے۔

''اب کیا؟ بولو ناں؟'' شگفتہ کا نفرت بھرا جملہ گونجا۔

''میں تمھیں ابتداء سے بتاتا ہوں۔ مجھے خود پتا نہیں چلا کہ میں کیسے ترقی کی منازل طے کرتا ہوا شیر خان بن گیا۔ دراصل جب مجھے خبر ملی کہ عثمانی بہت بڑا تاجر بن گیا ہے اور اسی شہر میں ہے تو میں عقل کا دامن چھوڑ بیٹھا اور اس سے ملنے پہنچ گیا۔ کئی سال پہلے سنا تھا کہ اسے رشوت لینے کے جرم میں محکمے نے نکال باہر کیا ہے۔ پھر اس کی خبر نہیں ملی۔ وہ منظر سے بالکل غائب ہو گیا تھا۔ شاید اس لیے بھی مجھے خبر نہیں ملی کہ میں خود بھی مصروف زندگی گزار رہا تھا۔ وہ تو اتفاقاً اس

کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا اسی لئے صبر نہ کر سکا اور اس کے بنگلے پر پہنچ گیا۔''

''آپ ہمارے بنگلے پر پہنچے تھے؟''

شگفتہ کا سوال سن کر سہیل خیالوں میں کھو گئے۔ جیسے گزرے ہوئے واقعات کو اپنے ذہن میں ترتیب دے رہے ہوں۔ پھر یوں بتانے لگے۔

''میں تمھارے اسی بنگلے پر پہنچا تھا جہاں تم رہتی ہو۔ وہاں پہنچ کر خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی۔ واقعی اس نے بہت ترقی کر لی تھی۔ بڑے سے گیٹ پر باوردی چوکیدار موجود تھا۔ میں نے اپنا کارڈ نکال کر اسے دیا۔ کارڈ لے کر اس نے دیکھا پھر ایک نوکر کے ساتھ مجھے اندر بھجوا دیا۔ عثمانی فائلوں کے انبار میں کھویا ہوا تھا۔ میں نے کمرے میں قدم رکھتے ہی کہا ''جیو بادشاہ! خوب ترقی کی ہے۔''

بے تکلف جملہ سن کر وہ چونک گیا اور سر اٹھا کر میری جانب دیکھنے لگا۔

اس کی آنکھوں میں شناسائی کی جھلک نمودار ہوئی اور وہ بول اٹھا ''تم؟''

میں نے اسے بے تکلفی سے کہا ''بڑا بے مروت آدمی ہے تو۔ پندرہ سال بعد مل رہا ہوں اور تو دیکھنے کے بعد بھی بیٹھا ہوا ہے۔ گلے تو لگ جا ظالم!''

اس کے چہرے پر ہنوز حیرت طاری تھی۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولا ''تم سہیل ہی ہو نا؟''

میں نے جھڑکا۔ ''کیا تم تم لگا رکھی ہے ویسے ہی بول ناں جیسے پندرہ سال پہلے بولتا تھا۔ اسی تھانے دار کے اکھڑ لہجے میں۔''

وہ فوراً ہی اٹھ گیا اور میرے سینے سے لگتے ہوئے بولا۔ ''واقعی تو سہیل ہے مگر مجھے تو اب بھی یقین نہیں ہو رہا ہے۔'' وہ مجھے ساتھ لے کر صوفے کی جانب بڑھا مگر میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کے لہجے میں وہ جوش نہیں ہے جو اس کا خاصہ تھا۔ وہ صرف رسم نبھانے کے لئے بول رہا تھا۔ ''تو اب تک کہاں تھا؟''

میں یہ سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھے اپنے سے کمتر سمجھ رہا ہے اسی لیے میں وہ غلطی کر بیٹھا۔ ''تو بہت بڑا تاجر بن گیا ہے تو میں بھی تجھ سے پیچھے نہیں ہوں۔ میں بھی کنگ آف انڈر ورلڈ بن گیا ہوں۔ شیر خان میرا ہی خفیہ نام ہے۔''

وہ اچھل سا گیا ''کیا.....تو شیر خان ہے؟''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہاں اگر تجھے شک ہے تو چل میرے ساتھ۔ میں تجھے

اپنی طاقت دکھاتا ہوں۔"

اس دن میں شیخی بھگارنے میں اتنا آگے بڑھ گیا تھا کہ عقل کوسوں پیچھے چھوٹ گئی تھی۔ اس نے جب پوچھا تو اتنا بڑا مجرم کیسے بن گیا تو میں نے سینہ پھیلا کر کہا تھا "تو بھول رہا ہے عثمانی کہ تیرا یہ یار اس کھیل میں تبھی سے ماہر ہے جب شیخوپورہ میں معمولی سا شراب بیچنے والا تھا۔"

میرے جواب سے اسے تسلی نہ ہوئی اور وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ تو اتنی بڑی تنظیم کا سربراہ کیسے بن گیا۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے کسی نے سربراہ بنایا نہیں ہے بلکہ میں نے خود اس تنظیم کی بنیاد رکھی ہے۔ پوری کہانی تو بہت لمبی ہے۔ اختصار میں سن لو۔ میں نے اس شہر میں دھندا شروع کیا تو کئی لوگ آڑے آئے جنھیں میں نے ٹھنڈا کر دیا۔ میرے مقابل چھوٹی چھوٹی کئی تنظیمیں تھیں۔ ایک دن میں نے سوچا کہ اگر ان تنظیموں کو یکجا کر کے میں باس بن جاؤں تو میری طاقت کئی گنا بڑھ جائے گی۔ اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے میں نے خاں سینڈیکیٹ کی بنیاد رکھی اور پھر ایک نئے حلیے میں خوف کی علامت بن کر ان پر چھا گیا۔ آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے گروا اپنا تشخص ختم کر کے میرے ساتھ شامل ہونے لگے اور خان سنڈیکیٹ ملک کا ایک بڑا گروہ بن گیا۔

عثمانی نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا کہ سنڈیکیٹ کا ہیڈ آفس کہاں ہے؟ میں نے جواب میں محل وقوع بتا دیا۔ دوستی کی تجدید کے نام پر ہم نے اس شام ڈھیروں باتیں کیں۔ وہ جو جو پوچھتا گیا میں بتاتا گیا۔ پتا نہیں اس دن میری عقل کو کیا ہو گیا تھا کہ میں نے اسے ایسی ایسی بات بتا دی جو خود میرے لیے پھانسی کا پھندا بن سکتی تھی۔ شاید یہ شراب کا اثر تھا۔ وہ پلاتا گیا اور میں پیتا گیا۔ رات گئے گھر لوٹا تو خود اپنا ہوش نہ تھا۔ رات میں تو میں ہوش سے بے گانا رہا مگر جب صبح اٹھا اور رات کی باتوں پر غور کیا تو اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ میں نے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ قانون کی نظر میں' میں مجرم تھا لیکن اسے ثابت کرنا مشکل تھا' وہ قانون کی مدد لے کر میرا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ مگر میرے گروہ کو توڑ سکتا تھا۔ جس دن وہ میرا راز کھول دیتا 'میری جان کے لالے پڑ جاتے۔ اپنی اس غلطی کو چھپانے کے لئے اسے مٹھی میں رکھنا ضروری تھا۔ مجھے اس کی کمزوری تلاش کرنا تھی سو میں اس کی تلاش میں جت گیا۔ ایک دن میں اس کے گھر میں چور بن کر گھسا اور تجوری کی تلاشی لی تو یہ خطوط اور تصویریں ملیں میں سمجھ گیا کہ یہ وہی احسان فراموش ہے جس نے دوستی کو ڈسا ہے۔" سہیل اتنا بتا کر رک گئے۔ وہ خاموش ہو کر دیوار کو تک رہے

تھے ایسے گویا وہاں سینما کا پردہ ہو اور اس پر سین نظر آ رہا ہو۔

انھیں خاموش دیکھ کر آصفہ نے پوچھا "پھر کیا ہوا؟"

"ان خطوط کو حاصل کرنے کے بعد میں اگلے روز اس سے ملنے پہنچا۔ وہ اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ میں اندر گھس گیا۔ مجھے اپنے بیڈروم میں دیکھ کر وہ چونک گیا۔ "کیسے آنا ہوا" اس نے پوچھا۔

جواب میں میں نے تصویر بڑھا دی اور بولا "یہ بتانے آیا ہوں کہ اب تمھارا راز کھل گیا ہے اگر اس راز کو چھپائے رکھنا چاہتے ہو تو اپنا منہ بند رکھنا۔"

وہ بڑے زور سے ہنسا تھا اور اٹھ کر یوں میرے قریب آیا گویا سینے سے لگا لے گا مگر نزدیک پہنچتے ہی اس نے ٹی وی پر رکھا گلدان اٹھایا اور سرعت سے میرے سر پر دے مارا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ میرا ذہن اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا۔ پتا نہیں کتنی دیر تک میں بے ہوش رہا۔ ہوش آیا تو میں عجیب حالت میں لٹکا ہوا تھا۔ میرے پیر رسی سے بندھے تھے اور رسی چھت کے کنڈے میں پھنسی ہوئی تھی۔ میرا سر زمین سے دو ڈھائی فٹ نیچے ہو گا۔ عثمانی میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے صرف پیر نظر آ رہے تھے یا پھر آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ پوچھ رہا تھا کہ لفافہ کہاں چھپایا ہے۔ میں جانتا تھا اسی لفافے میں میری جان ہے اگر لفافہ اسے دے دیا تو وہ مجھے جان سے مار دے گا۔ میں نے بتانے سے انکار کر دیا۔ وہ بھی کم نہ تھا اس نے میرے سر کے نیچے آگ دہکا دی۔ میرے بال جلنے لگے' چہرہ جھلسنے لگا لیکن میں نے کچھ نہیں بتایا۔ اذیت کی انتہا نے خود ہی مجھے اذیت سے نجات دلا دی۔ میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ دوبارہ جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک کھلی جگہ میں پڑا تھا۔ میرے چہرے پر شدید جلن ہو رہی تھی۔ شاید اس نے مردہ سمجھ کر مجھے پھینک دیا تھا۔ میں شہر میں ہوں یا شہر کے باہر مجھے خبر نہ تھی۔ کیوں کہ مجھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ تبھی میری سماعت سے پیروں کی آہٹ ٹکرائی اور میں سہم گیا۔ میں سانس روکے دبکا پڑا تھا کہ کسی بچے کی آواز آئی۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا کہ ایک آدمی پڑا ہے' پھر ایک بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ قدموں کی آہٹ میرے نزدیک آ کر رک گئی۔ وہ میرے بدن کو ٹٹولنے لگا پھر بڑبڑایا۔ ارے یہ تو زندہ ہے' شاید اسے مجھ پر رحم آ گیا تھا۔ اس نے مجھے گود میں اٹھا لیا اور اپنی جھونپڑی میں لے آیا۔ میں نے اس کی جھونپڑی میں کئی دن گزارے۔ اسی نے میرا الٹا سیدھا علاج کیا جس سے اتنا فائدہ ہوا کہ آہستہ آہستہ میرے چہرے کی جلن کم ہو گئی' مگر زخم اب بھی باقی تھے۔ میں

آنکھیں کھولنے کے قابل ہوگیا تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ آنکھیں سلامت تھیں۔ تقریباً ایک ماہ بعد میں اس قابل ہوگیا کہ اٹھ کر چہل قدمی کرسکوں۔ مجھے حیرت تھی کی عثمانی نے مجھے حب کے علاقے میں کیوں پھینکا لیکن پوچھتا تو کس سے! اس لیے کہ میرا گلا بیٹھ گیا تھا۔ گلے سے آواز نہیں نکلتی تھی۔ مجھے یقین تھا ایسا جلنے سے نہیں ہوا ہوگا۔ غنودگی کی حالت میں میں نے عثمانی سے پانی مانگا تھا یقیناً اس نے پانی میں کچھ ملا کر مجھے پلا دیا تھا۔ اس طرح میری آخری امید بھی دم توڑ گئی تھی۔ میرے گروہ کے لوگ مجھے میری آواز ہی سے پہچانتے تھے۔ ان سے رابطے کا ذریعہ میری آواز ہی تھی۔ اب یہ رابطہ ہی ختم ہوگیا تھا۔ جوانی کی اہمیت بڑھاپے میں ہوتی ہے۔ آواز کی اہمیت گونگے بن جانے پر ہوتی تھی۔ میں مکمل طور پر گونگا نہیں ہوا تھا۔ آواز بھرا گئی تھی۔ خاصا زور لگانے کے بعد گلے سے بہ مشکل پھنسی پھنسی سی آواز نکلتی تھی۔ خود مجھے اپنی آواز پہچانی نہیں جاتی تھی۔ جب میں کچھ بہتر ہوا تو میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب اس غریب پر بوجھ نہ ڈالوں۔ پھر ایک روز میں واپس شہر آ گیا۔ شہر کی گہما گہمی وہی تھی۔ رونق میں کمی نہ تھی صرف مجھ میں کمی آئی تھی۔ میرے اندر کتنی کمی آچکی تھی یہ دیکھنے کے لئے ایک سیلون میں جا پہنچا۔ آئینہ دیکھتے ہی میں بے ساختہ چیخ پڑا۔ یہ تو اچھا ہوا اس غریب کے گھر آئینہ نہ تھا یا تھا بھی تو اس نے چھپا کر رکھ دیا تھا۔ وہ جھوٹ بولا کرتا تھا مگر آئینہ کیسے بولتا۔ سیلون میں ہر طرف لگے آئینے نے مجھے سچائی بتادی۔ مجھے جتا دیا کہ میں اب کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوں۔ میری گردن پر زندگی بھر کے اعمال کا عذاب چہرے کی صورت میں نمایاں ہوگیا ہے۔ اپنی مکروہ صورت دیکھ دیکھ کر عثمانی پر سخت تاؤ آ رہا تھا۔ میں نے عہد کرلیا تھا کہ عثمانی سے بھرپور انتقام لوں گا اسے اس کی اوقات بتانا ہے۔ میں اس کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ وہاں میں عثمانی سے مقابلہ کرنے نہیں گیا تھا۔ خطوط اور تصویر لینے گیا تھا۔ میں نے خطوط اور تصویر کو اپنے گھر میں یا ہیڈ کوارٹر میں چھپانے کے بجائے اسی کے لان میں چھپایا تھا۔ بنگلے کے پیچھے والی دیوار میں مجھے ایک سوراخ نظر آیا تو اسے دیکھ کر ایک خیال سوجھا۔ یہ ان چیزوں کو چھپانے کی بہترین جگہ تھی۔ عثمانی کبھی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ اس کی خفیہ چیزیں اسی کے گھر میں پوشیدہ ہیں۔ میں نے اس سوراخ کو مزید بڑا کیا اور اس میں خطوط وغیرہ رکھ کر گیلی مٹی کا پلستر لگا دیا تھا۔

میں ابھی لفافہ نکال ہی رہا تھا کہ عثمانی نظر آیا۔ وہ اپنی کار پر بیٹھا کہیں جا رہا تھا۔ میں دیوار پھلانگ کر تیزی سے سڑک پر پہنچا۔ میری جیب میں اس وقت کل ڈھائی سو روپے تھے۔ جو

میں نے اس محسن کے گھر سے چوری کیے تھے۔ جس نے مجھے پناہ دی تھی' میرا علاج کرایا تھا۔ اتنے روپے ٹیکسی کے لئے کافی تھے۔ میں نے ایک اشارے سے ٹیکسی کو روکا اور اس کا تعاقب کرنے لگا۔ جب وہ چورنگی سے دائیں جانب مڑا تو میری حیرت ہی انتہا نہ رہی۔ یہ راستہ میرے ہیڈ کوارٹر کی طرف جاتا تھا۔ کچھ دیر بعد تصدیق بھی ہوگئی۔ اس نے اپنی کار کو اس بلڈنگ کی پشت پر روکا تھا جس میں میرا ہیڈ کوارٹر تھا۔ اس وقت تو میں اچھل پڑا جب وہ خفیہ دروازے کی سمت بڑھا۔ وہ ایک عام سا دروازہ تھا مگر برابر والے گھر کا خفیہ راستہ اسی گھر کے اندر سے تھا۔ میں نے ٹیکسی والے کو فارغ کیا اور اسی دروازے پر پہنچ گیا۔ خفیہ بٹن دبا کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ کوریڈور پار کیا۔ اندر کمرے میں پہنچا۔ یہ وہی کمرا تھا جس میں میں کبھی آرام کیا کرتا تھا اس کے بعد ایک اور کمرا تھا۔ وہ کمرا سب سے اہم تھا۔ ایک سو ساٹھ گز کے اس کمرے کو ہال کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اس ہال کا دروازہ دوسری جانب مین گیٹ کی طرف کھلتا تھا۔ عام کارکن ادھر سے ہی آتے تھے۔ ہال میں یہاں سے وہاں تک قطار در قطار صوفے بچھے تھے۔ اس پر کارکن بیٹھتے تھے۔ ان کا رخ اس کمرے کی جانب ہوتا تھا۔ اس کمرے آ بعد والا حصہ ہال کا ہی حصہ تھا۔ درمیان میں فائر پروف شیشے کی دیوار تھی۔ شیشہ دھندلا تھا تاکہ شیر خان کو کوئی پہچان نہ لے۔ میں شیشے کے اس پار سفید داڑھی مونچھیں اور ہرا کنٹیکٹ لینس لگا کر بیٹھتا تھا اور مائک پر اپنے کارکنوں سے مخاطب ہوتا تھا' انھیں حکم دیتا تھا' لیکن اس دن میری خاص کرسی پر عثمانی بیٹھا تھا اس نے اندر جاتے ہی میک اپ کرلیا تھا اور میرے مخصوص کرخت قبائلی لہجے میں کارکنوں کو حکم دے رہا تھا۔ میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ میرے سارے پتے پٹ گئے تھے۔ میری برسوں کی محنت پر اس نے قبضہ کرلیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ آج انسپکٹر رابیل نے ترپ چال چلی ہے۔ میں نے جیمس اینڈ جیولر کو دیکھا ہے وہاں کوئی کیمرا نہیں ہے۔ یقیناً لڑکیوں کو پھانسنے کے لئے اس نے رپورٹر کمال کے ساتھ مل کر چال چلی ہے۔ اسے ناکام کرنا ضروری ہے۔ میں چودھری کو یہ ڈیوٹی سونپتا ہوں کہ وہ ان لڑکیوں کو رابیل کے چنگل سے چھڑا لائے۔ ایسی عقل مند لڑکیوں کی ہمیں ضرورت ہے۔ سنڈیکیٹ کو میں کئی دوسرے ممالک میں بھی پھیلانا چاہتا ہوں۔ اس کام میں یہ لڑکیاں اہم کردار ادا کریں گی۔'' سہیل بولتے بولتے رکے اور میری جانب دیکھتے ہوئے بولے۔ ''تمھیں یاد ہوگا رابیل کہ اس دن، ایک گمنام فون آیا تھا؟''

''ہاں!'' میں نے کہا۔ ''کسی نے فون پر اطلاع دی تھی کہ شیر خان کو شبہ ہے کہ لڑکیاں

تم سے ملنے تمہارے بنگلے پر آئیں گی۔ وہ انھیں اپنے قبضے میں کرنا چاہتا ہے۔ تم ہوشیار رہنا۔"

وہ میں ہی تھا۔ جب تم نے چودھری کو گرفتار کرلیا تو میں نے پھر عثمانی کا تعاقب کیا تھا اور ہیڈ کوارٹر کے اسپیشل روم تک پہنچ گیا تھا۔ وہاں اس نے اپنے خاص آدمی اشفاق سے کہا تھا کہ وہ خود چودھری کو چھڑانے جائے گا۔ میں نے اپنے دور میں کبھی کسی مشن کو خود انجام نہیں دیا مگر وہ زعم میں نکل پڑا۔ وہ بھی اس کے پیچھے تھا اسے ناکام کرنے کے لئے میں نے ہی شگفتہ کو بھیجا تھا۔"

"آپ نے مجھے حکم دیا تھا؟" شگفتہ نے قطع کلامی کی۔

"ہاں میں نے لیکن تمہیں فون آصف نے کیا تھا۔ آصف سنڈیکیٹ کا خاص آدمی ہے۔ میں نے اس کی بیوی بچوں کو ریوالور کی زد پہ لے کر تھانے فون کرنے کو کہا تھا۔ جب اس نے رابیل سے بات کر لی تو میں نے دوسرا فون شگفتہ کو کرایا تھا۔ شگفتہ کو ہیروئن کی عادت کالج سے لگی تھی۔ بعد میں وہ آصف سے خریدنے لگی۔ عثمانی تو میری طرح پردے میں تھا اس لیے آصف جان نہ سکا کہ وہ اپنے چیف کی بیٹی کو ہیروئن سپلائی کر رہا ہے۔ مفت ہیروئن کی لالچ میں شگفتہ تیار ہوگئی۔ میں نے آصف کے ذریعے اسے وہ مکالمے بھی بتا دیے جو اس نے تھانے میں کہا تھا۔ اس مکالمہ کو سنتے ہی عثمانی پاگل ہوا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں نے شگفتہ کو اس کے کالے کرتوت بتا دیے ہیں۔ وہ جلد بازی میں اپنا پلان بھول گیا اور پستول کے زور پر چودھری کو لے بھاگا کیوں کہ اس وقت لڑکیوں سے زیادہ اسے چودھری ہی اہم نظر آیا تھا۔ یوں بھی وہ سنڈیکیٹ کا اہم رکن تھا۔ وہ بھاگ کر کہاں چھپا تھا۔ میں نے جلد ہی پتا لگا لیا اور اسے گرفتار کروا دیا۔"

"لیکن انکل!" آصفہ نے کہا۔ "عثمانی کی جگہ وہ کون تھا جو جیل میں سزا کاٹنے پر تیار ہوگیا تھا۔ جسے آپ نے جیل کے دروازے پر گولی ماردی تھی؟"

"بیٹی۔ وہ سنڈیکیٹ کا ایک پیادہ تھا۔ میں نے اپنے گروہ میں چن چن کر لوگ جمع کیے تھے۔ ان میں ایک غنی بھی تھا۔ غنی کے بارے میں مجھے اطلاع ملی کہ وہ آج عثمانی سے ملنے ہسپتال جائے گا۔ عثمانی بیمار بن کر اسپتال آگیا تھا۔ مجھے شک ہوا کہ وہ فرار ہونا چاہتا ہے۔"

"لیکن یہ اطلاع آپ کو ملتی کیسے تھی؟" صادقہ نے پوچھا۔

"گروہ میں ایک شخص ایسا بھی ہے جسے میں نے احسانوں تلے دبا رکھا ہے۔ ابھی صرف اسے پتا ہے کہ عثمانی نقلی باس بن کر بیٹھا ہے۔ میں نے وہ احسان اسے یاد دلا کر بتایا تھا کہ اصل باس میں ہوں۔ اسے تاکید بھی کر رکھی ہے کہ وہ کسی سے بات نہ کہے۔"

"پھر کیا ہوا؟" نجمہ نے پوچھا۔

"غنی سنڈیکیٹ میں آنے سے پہلے اسٹیج آرٹسٹ تھا۔ ایک منجھا ہوا ایکٹر وہ ہر ایک کی کامیاب نقل اتار لیتا تھا اس کا قد کاٹھ بھی عثمانی جیسا تھا۔ اس نے سر پر ہیٹ لگا رکھا تھا جس کا کونا جھکا ہوا تھا' آدھا چہرہ ڈھکا تھا وہ ڈاکٹر کے بہروپ میں اسپتال پہنچا۔ اس کے تعاقب میں میں خود تھا لیکن مجھے اسپیشل وارڈ کے اندر گھسنے کا موقع نہیں ملا۔ اسپیشل وارڈ میں ایک سپاہی کی ڈیوٹی تھی۔ پتا نہیں کس چال بازی سے اسے بھی باہر کر دیا گیا تھا۔ وہ دروازے کے باہر بیٹھا تھا۔ دروازے کے باہر میں بھی تھا مگر دور دور۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد غنی باہر نکلا۔ ڈاکٹروں والا بیگ اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ تیز قدموں سے باہر آگیا میں پھر اس کے تعاقب میں لگ گیا۔ وہ سیدھا ہیڈ کوارٹر کے پیچھے کی طرف پہنچا اور خفیہ دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ میں بھی دبے پاؤں تعاقب میں تھا۔ مجھے حیرت بھی تھی کہ ایک عام کارکن کو اس دروازے کا پتا کیسے چلا؟ لیکن اندر کا منظر دیکھتے ہی ساری بات سمجھ میں آگئی۔" وہ عثمانی تھا۔ یقیناً غنی نے اپنا میک اپ اس پر کر دیا تھا۔ یعنی خود تو اندر رہ گیا اور اسے اپنے کپڑے پہنا کر بھیج دیا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر کسی کا دھیان نہیں جاتا اور یہی چھوٹی چھوٹی باتیں بڑے جرم کو جنم دیتی ہیں۔ جیل میں واپس لے جاتے وقت کسی نے خیال بھی نہ کیا ہوگا کہ یہ داڑھی نقلی ہے۔ داڑھی کے پیچھے جو چہرہ ہے اسے بلیچ کریم کے ذریعے گورا کیا گیا ہے اور سر پر جو ٹوپی ہے وہ چہرے کے خدوخال تبدیل کرنے کے لیے پہنی گئی ہے۔ اگر کوئی بغور دیکھتا تو غنی کو پکڑ لیتا لیکن وہاں تو تعداد دیکھی جاتی ہے' خدوخال نہیں۔" سہیل سانس لینے کو رکے۔ جلدی جلدی بولنے سے انکی سانس رکنے لگی تھی۔ وہ رک کر سانسیں درست کرنے لگے۔

"لیکن میں نے تو غور کیا تھا۔ وہ عثمانی ہی تھا۔" میں نے کہا۔

"دراصل تم اسے ایک زمانے تک دیکھتے رہے ہو۔ ہلکی سی جو تبدیلی آئی اس پر تم نے توجہ نہ دی۔ تم نے غور کیا ہوگا تمھارا ایک دوست جو دن بدن صحت مند ہو رہا ہے اس کی تبدیلی تم محسوس نہیں کر سکتے۔ کیونکہ تمھارا لاشعور بھی اس کی تبدیلی کو اسی طرح قبول کرتا رہتا ہے۔ اسی لیے تم نے بھی اس کی تبدیلی محسوس نہیں کی۔"

"ہاں یہ ممکن ہے۔" آصفہ نے کہا۔ "لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ ہم میں دلچسپی کیوں لے رہا ہے۔"

"بات یہ ہے بیٹے!" سہیل بولے۔ "تمام نشیلی ادویات کی ماں افیون ہے اور افیون

کی کاشت صوبہ سرحد کے پار ہوتی ہے۔اس کام پر مافیا کی اجارہ داری ہے۔شیر خان سنڈیکیٹ کو افیون خریدنے کے لئے مافیا کو منہ مانگی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔یہ پلان میرا ہی تھا کہ کسی طرح وہاں کی مافیا کو شکست دے دی جائے۔کسان ہم سے براہ راست سودا کریں لیکن یہ کام آسان نہیں۔اس کے لئے تو دماغ لڑانے کی ضرورت ہے۔شاید اس نے سوچا ہو کہ وہ تم چھ جیالوں سے وہ کام لے گا۔''

''اور آپ کا مشن کیا ہے؟'' آصفہ نے چبھتا ہوا سوال کیا۔

''میرا مشن اپنا عہدہ واپس لینا ہے۔'' سہیل مسکرائے۔

''دیکھئے، انکل ہم پیشہ ور مجرم نہیں ہیں۔جرم کرتے ہی ایڈونچر کے لئے تھے اور آپ پیشہ ور مجرم ہیں۔پھر آپ قوم کو ناکارہ کرنے کے لئے زہر بانٹ رہے ہیں۔'' آصفہ کی بات میرے دل کو لگی میں نے بھی تائید کرتے ہوئے کہا۔ہمارا یہ ملک بہت قیمتی ہے۔پوی دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں۔ایک بھی ملک ایسا نہیں ملے گا اس ملک کے لئے جتنی قربانیاں دی گئی ہیں کسی اور ملک کے لئے نہیں۔تاریخ اٹھا کر دیکھیں ایک دو نہیں لاکھوں کی تعداد میں لاشیں گری تھیں، معصوموں کے خون سے گارا بنا کر اس ملک کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ہزاروں بہنوں کی عزت کے بدلے ہمیں یہ وطن ملا ہے اور اس کی قیمت ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کو آج بھی چکانا پڑ رہی ہے۔ہم یہ کبھی نہیں چاہیں گے کہ اس ملک کے نوجوان ناکارہ ہو جائیں۔''

''بیٹے! تم جوش کے عالم میں ہو۔بغور دیکھو۔ملک کے اس کونے سے اس کونے تک کیا ہو رہا ہے۔ملک کے لئے کون سوچ رہا ہے۔سب اپنی بلڈنگ بنانے کی فکر میں ہیں۔''

''انکل یہ سراسر غلط ہے۔غلط بات جلدی نظر آ جاتی ہے۔اس ملک میں وطن پرستوں کی تعداد زیادہ ہے لیکن وہ خاموش مجاہدین ہیں۔خاموش رہ کر وطن کی خدمت کرتے ہیں۔غداروں کا کام کالا ہوتا ہے اور سیاہی جلدی نظر آ جاتی ہے۔''

''اور ایسے ہی مفاد پرستوں کو ہم آلہ کار بناتے ہیں۔'' سہیل مسکرائے۔

''لیکن ہم مفاد پرست نہیں ہیں۔'' صادقہ جھنجلائی۔

''یہ بحث بعد میں ہوگی۔فی الحال تم سب مجرم ہو۔قانون سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے ہمارا ساتھ دو۔بعد میں اگر چاہو تو الگ ہو جانا۔''

''ہاں یہ ممکن ہے۔'' میں نے کہا۔

''یوں بھی ہمیں پرانا حساب چکتا کرنا ہے۔'' کمال نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

''اسی لیے تو میں نے تم لوگوں کو چنا ہے۔عثمانی صرف میرا ہی نہیں تم لوگوں کا بھی دشمن ہے۔''

''ہاں وہ ہم سب کا دشمن ہے اس کی بوٹیاں نوچوں گی میں۔'' نجمہ کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

''انکل! کیا عثمانی جانتا ہے کہ ہم آپ کے ساتھ مل گئے ہیں؟'' صادقہ نے پوچھا۔

''اگر نہیں جانتا ہوگا تو اب جان جائے گا۔تمھیں یہاں پہنچا کر میں ہیڈ کوارٹر کے اسی خاص کمرے میں گیا تھا۔عثمانی نہیں تھا۔اس کے لئے خط چھوڑ آیا ہوں۔''

''کیسا خط؟'' شگفتہ بولی۔

''اس کی ایک فوٹو کاپی یہ رہی۔'' سہیل نے خط بڑھایا۔

ہم سب ایک ساتھ جھک گئے۔خط پڑھتے ہی شگفتہ نے کہا۔اس کا مطلب ہے آپ شیر خان سے ملے ہوئے ہیں؟ اس کے چہرے پر غصے کی جھلک تھی۔

''کیسے؟'' سہیل مسکرائے۔

''اس طرح کہ آپ شیر خان کو مخاطب کر کے لکھا ہے کہ آپ اسے بہت جلد عثمانی کی لاش دیں گے یعنی عثمانی شیر خان نہیں ہے کوئی اور ہے۔''

''اس کا ایک مطلب اور ہے۔'' کمال بولا ''عثمانی ہماری مدد سے سنڈیکیٹ کو ختم کرنا چاہتا ہے۔مسٹر سہیل شیر خان سے ملے ہوئے ہیں۔اسے اطلاع دے رہے ہیں کہ وہ فکر نہ کرے اور سہیل وغیرہ میرے قبضے میں ہے۔''

سہیل کے ہونٹوں پر پر اسرار مسکراہٹ چھائی رہی انھوں نے کچھ توقف کے بعد پوچھا۔''کیا سب کا خیال یہی ہے؟''

''نہیں۔'' آصفہ نے کہا۔''میں اس خط کا راز جان چکی ہوں۔''

''اور میں بھی؟'' میں نے جواب دیا۔

''تب انھیں بتا دو۔'' سہیل بولے۔

میں نے قلم نکالا اور اس خط پر نشان لگانے لگا۔

شیر خان!

پہلے کی طرح پریشان ہو گئے۔

لیکن یقین رکھو ہم بہت طاقت ور ہیں۔
اب تو یہ چھ جاں باز بھی میرے قبضے میں ہیں۔
اب وہ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔
سمجھ سکتے ہو کہ اب میں جلدی تمہیں
عثمانی کی لاش دوں گا۔ سوچ رہا تھا کہ
تمہیں مار کر اپنی ریاست واپس لے لوں گا۔ اب وہ خود ہمارے جال میں پھنس گیا ہے۔
تم جانتے ہو کہ یہ چھ جان باز چاہیں تو تمہاری سنڈیکیٹ میں چار چاند لگا سکتے ہیں اور دشمن کی ریاست جلا کر خاک کر سکتے ہیں۔
تمہارا خیر خواہ
موت کا ہرکارہ

"بہت خوب!" سہیل نے تعریفی نظروں سے مجھے دیکھا۔

اس میں حیرت انگیز تو کچھ نہیں ہے۔ ایسے خطوط تو عام طور سے بچے ایک دوسرے کو لکھتے ہیں۔" آصفہ نے کہا۔ "ایک ایک سطر چھوڑ کر پڑھتے چلے جایئے۔"

"تمہاری بات سچ ہے۔ ایسے خطوط نوجوانی میں ایک دوسرے کو لکھتے تھے۔ عثمانی کو خاص شوق تھا۔ اتنے سال بعد ہم نے پھر اسی شوق کو دھمکی کے لیے استعمال کیا ہے۔"

"اب یقیناً تمہاری تلاش شروع ہو گئی ہوگی؟" آصفہ نے مسکرا کر کہا۔

"صرف میری نہیں تمہارے ساتھیوں کی بھی۔" سہیل مسکرائے۔

"آپ نے ایک بہت بڑی غلطی کر دی ہے انکل۔" میں نے کہا۔

"غلطی؟ کیسی غلطی؟"

"اب آپ اس کمرہ خاص میں کبھی نہیں جا سکیں گے اگر کبھی کوشش کی تو وہ آپ کا آخری دن ہوگا۔"

"واقعی میں نے اس پوائنٹ پر سوچا ہی نہیں تھا۔" سہیل کا چہرہ بجھ سا گیا۔ "اب کیا کروں تم لوگ ہی بتاؤ۔"

"اس کا حل ڈائریکٹ ایکشن ہے اور ایکشن کے لئے ہیڈ کوارٹر کا مکمل جغرافیہ معلوم ہونا ضروری ہے۔"

"ہیڈ کوارٹر چائنیز ہوٹل کی عمارت کے نیچے ہے اور اس کا راستہ کچن سے ہو کر گزرتا ہے وہ ایک بارہ بائی بارہ کا کمرا ہے ظاہر میں وہ ایک اسٹور روم ہے اور اس میں کاٹھ کباڑ بھرا رہتا ہے لیکن وہ ایک بڑی سی لفٹ ہے۔ ہیڈ کوارٹر میں جانے والے کو کچن سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ کچن میں کام کرنے والے شیر خان سنڈیکیٹ کے سکیورٹی آفیسر ہیں۔ اس دستے میں تقریباً بائیس افراد ہیں۔ ان کے سربراہ کا نام جاگیر خان ہے۔ یہ نام بھی شیر خان کی طرح فرضی ہے سکیورٹی دستے کے افراد سنڈیکیٹ کے ہر ممبر کو پہچانتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ پوری طرح چیک کرنے کے بعد ہی میٹنگ ہال میں جانے کی اجازت دیتے ہیں۔ نیچے کی جانب ٹی وی اسکرین ہے۔ جس پر ہر وقت ایک آدمی نظر رکھے رہتا ہے کہ اب کسے نیچے جانے کا اشارہ ملا۔ اشارہ دیتا ہے جاگیر خان۔ وہ دانتوں میں ل کرتا ہے۔ ٹی وی کے سامنے بیٹھا شخص لفٹ کا بٹن دبا دیتا ہے۔"

"لفٹ رکتی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بیس فٹ نیچے۔ لفٹ رکتے ہی ممبر خود کو گیلری میں پاتا ہے۔ گیلری دو فٹ چوڑی اور تیس فٹ لمبی ہے۔ وہاں گارڈ کھڑے رہتے ہیں۔ لفٹ سے باہر آنے والے کی تلاشی لی جاتی ہے۔ جیب خالی ہونے کے بعد ہی وہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔ گیلری کے آخری کونے پر ایک کمپیوٹر ہے۔ اسے میں نے خاص آرڈر پر جاپان سے بنوا کر منگوایا ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔"

کمپیوٹر اجازت کیسے دیتا ہے؟"

"وہ کمپیوٹر کسی دروازے کی طرح گیلری کے آخری سرے پر فکس ہے۔ سنڈیکیٹ کا ایک بھی ایسا ممبر نہیں ہے جس کا بائیو ڈیٹا اس کمپیوٹر میں فیڈ نہ ہو۔ کمپیوٹر کے آگے فرش پر دو بائی دو کا ایک فولادی چبوترا ہے۔ ٹھیک ویسا جیسا وزن کرنے والی مشین کا ہوتا ہے۔ اندر جانے والے کو اس پر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ کمپیوٹر خود چیک کر کے سبز بلب جلا دیتا ہے اور اگر سرخ بلب جل جائے تو گیلری میں کھڑا گارڈ فوراً اسے حراست میں لے لے گا۔"

"کمپیوٹر کے کام کرنے کا طریقہ؟"

"جس طرح ہر انسان کی فنگر پرنٹ، رائٹنگ وغیرہ جدا ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر انسان کے دل کی دھڑکنوں کے درمیان بھی فرق ہوتا ہے، رفتار میں بھی فرق ہوتا ہے۔ کمپیوٹر اس فرق کو فوراً پکڑ لیتا ہے۔ اگر وہی شخص ہے جس کے کوائف فیڈ کیے گئے ہیں وہ آتا ہے۔ تبھی سبز بلب جلتا

ہے اور خود کار دروازہ کھل جاتا ہے۔ وہ دروازہ میٹنگ ہال میں کھلتا ہے لیکن یہ راستہ عام ممبر کے لئے ہے۔ میرے لئے دوسرا راستہ ہے۔“

”دوسرا راستہ کدھر ہے؟“

”ہوٹل میں چار ٹوائلٹ ہیں۔ ہر ٹوائلٹ میں دو حصے بنے ہیں۔ پہلے حصے میں باتھ ہے اور دوسرے حصے میں یورینل۔ ٹوائلٹ نمبر ٹو کے باتھ ٹب کے نیچے ایک ایسا ٹائلز ہے جسے فرش سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ ٹائلز کے نیچے گڑھے میں ہاتھ ڈال کے ایک سوئچ کو اوپر کی طرف کھینچنے سے ٹوائلٹ کا سیکنڈ پارٹ یعنی یورینل والا حصہ کسی قسم کی آواز پیدا کیے بغیر لفٹ کی طرف چھ چھ فٹ اوپر اٹھ جاتا ہے۔ نیچے سیڑھیاں ہیں۔ ٹائلز کے اس کی جگہ فٹ کر دیجئے اور سیڑھیوں کے ذریعے نیچے اترتے چلے جائیے۔ جیسے ہی نچلی سیڑھی پر قدم پڑتا ہے یورینل والا حصہ اپنی جگہ آ جاتا ہے اور اوپر باتھ روم کے دروازے کا لاک بھی کھل جاتا ہے۔“

”سیڑھیاں کہاں پہنچ کر ختم ہوتی ہیں؟“

”میٹنگ ہال کی پشت پر ایک پرائیویٹ کمرا ہے۔ اس کے بعد ایک اور کمرا ہے جو درا صل ہال کا ایک حصہ ہے۔ اسے میں نے خاص طور پر فائر پروف شیشے کی مدد سے بنوایا ہے۔ اس شیشے کی دوسری جانب عام ممبر پچھلی طرف اور خاص ممبر سامنے کی قطار میں بیٹھے رہتے ہیں۔“

”یہ عام اور خاص کا مطلب کیا ہوا؟“

”سنڈیکیٹ کئی اکائی میں بٹا ہوا ہے۔ سب سے نچلی اکائی میں فیلڈ ورکر ہیں۔ اس سے اوپر سیکورٹی دستہ تیسرے نمبر پر کمانڈو دستہ۔ اس دستے میں خونخوار قسم کے لڑاکے ہیں۔ ان سے اوپر خونی دستہ ہے۔ یہ دستہ جب ایکشن میں آتا ہے تو صرف قتل کرتا ہے۔ کمانڈو دستے کے چیف کا نام مشتاق ہے۔ خونی دستے کا چیف رانا ہے۔ ان سب دستوں کے اوپر ہے کمیٹی۔“

”کمیٹی یہ کیا بلا ہے؟“ کمال نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”سنڈیکیٹ کی بنیاد میں نے چھوٹے چھوٹے جرائم پیشہ گروپ کو ملا کر رکھی تھی۔ یہ سب الگ الگ منشیات کا دھندہ کرتے تھے۔ کل ملا کر بیس گروپ تھے۔ ہر گروپ کا سربراہ اب کمیٹی کا ممبر ہے۔ ان میں سے ایک اشفاق بھی ہے جو آج کل عثمانی کے بہت قریب ہے۔“

”کمیٹی کا کام کیا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے میٹنگ ہوتی ہے۔ کمیٹی لائحہ عمل تیار کرتی ہے۔ اس

پلان میں مہر ثبت میں کیا کرتا تھا۔“

”یعنی اگر کمیٹی آپ کو شیر خان مان لیتی ہے تو باقی لوگ بھی مان لیں گے؟“

”یقیناً“

آصفہ سر جھکا کر سوچنے لگی پھر اس نے کہا۔ ”ذرا قلم دیجئے گا۔“

سہیل نے قلم دے دیا۔ وہیں رکھے پیڈ پر اس نے کچھ لکھا اور پھر اسے ان کی طرف بڑھا کر بولی۔ ”دیکھئے تو آپ اس خط کو سمجھ سکتے ہیں یا نہیں؟“

سہیل نے خط لے کر دھیان سے دیکھا پھر مایوسی بھرے لہجے میں بولے ”مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا ہے صرف حرف پر اعداد نظر آ رہے ہیں۔“

کاغذ واپس لے کر اس نے ہماری طرف بڑھایا اور بولی۔ ”تم سب بھی کوشش کرو شاید سمجھ جاؤ۔“

ہم سب خط پر جھک گئے۔ خط کا مضمون تقریباً وہی تھا جو سہیل نے عثمانی کو لکھ کر اپنے ہیڈ کوارٹر میں چھوڑ دیا تھا۔ البتہ اس خط میں آصفہ نے ہر لفظ پر حروف تہجی کے اعتبار سے نمبر ڈالے ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے خط ایک معمہ بن گیا تھا۔

باری باری سب نے خط پڑھا لیکن کسی کے چہرے سے ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ سمجھ چکے ہیں۔ جب کہ میں نے خط میں چھپے پیغام کو سمجھ لیا تھا۔

صادقہ نے جھنجلا کر کہا۔ ”بھئی پہیلیاں بجھانا چھوڑو اور بتاؤ کہ کیا لکھا ہے۔“

”کل بتاؤں گی۔“ آصفہ مسکراتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔

”کل؟“ نجمہ بڑبڑائی۔

”ہاں کل جب میں مکمل لائحہ عمل تیار کر لوں گی۔“ وہ کمرے سے باہر نکل گئی ہم سب بھی اٹھ کر اپنے اپنے کمرے میں چلے آئے۔

گھڑی نے رات کے دو بجنے کا گجر بجایا۔ دور گھنٹا گھر سے آتی ہوئی آواز سن کر میں اٹھ بیٹھا اور دبے پاؤں باہر نکلا۔ کمال کے کمرے میں جا کر اسے اٹھایا پھر سرگوشی میں ہدایت دی کہ وہ آصفہ کے کمرے میں پہنچے۔ اس کے بعد نجمہ کے کمرے میں پہنچا۔ شاید وہ جاگ رہی تھی۔ آہٹ سنتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے فوراً ہی ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ دیا پھر دبی آواز میں بولا تم شگفتہ اور صادقہ کو لے کر آصفہ کے کمرے میں پہنچو۔ خبردار ہلکی سی بھی

آہٹ نہ ہو۔ ہم اس ملاقات کو سہیل سے خفیہ رکھنا چاہتے ہیں۔"

وہ اٹھ کر ان کے کمرے کی جانب بڑھی اور میں سہیل کے کمرے کی جانب چل پڑا۔ دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ وہ بستر پر سر جھکائے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔

میں نے آہستہ سے بغیر آواز پیدا کیے باہر سے کنڈی لگا دی۔ اور آصفہ کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ کروٹ کے بل لیٹی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی دوپٹا درست کرتے ہوئے اٹھ بیٹھی اور بولی۔ "آؤ!"

"شش، شی!" میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ دیا۔ "آہستہ؟"

"کیوں؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہماری آواز ٹیپ ہو سکتی ہے۔"

"نہیں ہوگی۔ میں نے کنکشن کاٹ دیا ہے۔ مائیک اس گلدستے میں تھا۔"

تب تک سب پہنچ چکے تھے۔ انھیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے آصفہ نزدیک پہنچ گئی۔

"مجھے خوشی ہے رابی کہ تو بھی ٹیپ سے ہوشیار تھا۔"

"مجھے تبھی شک ہو گیا تھا جب تم نے سہیل سے کہا تھا کہ تم نے ہماری بات چیت ٹیپ پر سن لی ہوگی۔ اسی لیے میں اپنے کمرے میں پہنچتے ہی مائیک کی تلاش میں لگ گیا تھا۔ میری کوشش بار آور ثابت ہوئی تھی۔ ڈسٹ بن میں مائیک چھپا ہوا تھا پھر میں نے نجمہ، صادقہ اور کمال کے کمرے کا بھی مائیک نکال لیا تھا۔"

"بھئی مجھے نیند آ رہی ہے۔ فٹافٹ بتاؤ اس میٹنگ کا مقصد کیا ہے؟" صادقہ نے جماہی لی۔

"جب آصفہ نے وقت دیا ہے تو کچھ سوچ کر ہی دیا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"کب وقت دیا تھا؟" کمال نے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"میاں تم کیسے صحافی ہو الفاظ کی گہرائی نہیں سمجھتے؟" میں نے طنز کیا۔

"کون بے وقوف صحافی ہے۔ میں تو پیٹ کا جہنم بھرنے کے لئے اس لائن میں آیا تھا۔ اگر اس لائن میں بھی روٹی نہ ملتی تو بھٹے بھونتا۔" کمال کا لہجہ تلملایا ہوا تھا۔

"شام کو ہی آصفہ نے خط لکھنے کے دوران پیغام دے دیا تھا۔"

"تم نے کیسے سمجھ لیا؟"

"بچوں جیسی باتیں نہ کرو۔ اتنا سیدھا پیغام تھا یقیناً ایسا پیغام لکھنے کا خیال سہیل والے خط سے آیا ہوگا۔ میں نے ان حرف پر جو اعداد تھے انھیں ترتیب سے جمع کیا تو پیغام تھا آج رات دو بجے میرے کمرے میں ملو۔"

"واقعی تمہارا ذہن میرے دماغ تک پہنچ رہا ہے۔" آصفہ نے مسکرا دیا۔

"آخر تمہارا شوہر ہوں، بھلے ہی سہاگ رات نہ منائی ہو۔"

"چپل کھینچ ماروں گی۔" آصفہ کا پیار جتانا بھی خطرناک تھا۔ اگر اس کے تراشیدہ لبوں پر مسکراہٹ نہ رہتی تو میں دبک جاتا مگر مسکراتے دیکھ کر بولا۔ "کیا یہ غلط ہے؟"

"بکواس نہیں، غور سے سنو! مجھے سہیل پر شک بھی ہے اور نہیں بھی۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" صادقہ بولی۔ "اس پر شک بھی ہے اور نہیں بھی؟"

"نہیں! اس لیے کہ شک کی کوئی ایسی وجہ سامنے نہیں ہے جسے پیش کر سکوں۔ اس کی کہانی سچی اور ٹھوس اس لیے لگتی ہے کہ اس نے ٹھوس ثبوت بھی پیش کیے ہیں لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل بھی کہہ رہا ہے کہ کہیں نہ کہیں ہم سے بھول ہو رہی ہے۔ وہ غلطی کیا ہے ابھی اس کی جانب عقل نے اشارہ نہیں کیا ہے۔ اس لیے پوری طرح اسے عقل کی کسوٹی پر جانچے بغیر اندھا اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔"

اس کی بات غلط نہیں تھی۔ سب کے ساتھ میں بھی سوچ میں ڈوب گیا۔ یکایک میرے دماغ میں ایک نیا پہلو ابھرا اور میں نے سر اٹھا کر کہا۔ "سہیل نے سب سے دھماکے دار بات یہ بتائی ہے کہ شیر خان عثمانی ہے۔ اگر ہم یہ پتا لگا لیں کہ واقعی وہ شیر خان ہے تو سہیل سچا ہے اور اگر شیر خان کوئی دوسرا ہے تو سمجھ لو سہیل ایک بہت بڑا شاطر اور سازشی ہے۔"

"بالکل صحیح لائن پر ہو۔" آصفہ نے تعریفی نظروں سے مجھے دیکھا۔

"تو شیر خان کی اصلیت معلوم کرنے کے لئے کون سی چال چلی جائے۔" کمال نے کہا۔

"میں سوچ چکی ہوں۔" آصفہ کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

"ہم بھی سنیں۔"

رابیل کہانی کے اہم موڑ پر پہنچا تھا کہ بیرے نے آ کر کہا۔ "صاحب اب آپ لوگ اپنے کمرے میں چلے جائیں، لائٹ بند کی جائے گی۔"

لاجنگ کے بیرے کا حکم تھا ہمیں ماننا پڑا۔ ہم اٹھ کر کمرے میں آ گئے۔ کمرے میں

پہنچتے ہی میں بستر پر ڈھے سا گیا۔ رابیل بھی اپنے بستر پر جالیٹا۔ یکا یک کمرے کی تمام لائٹس بجھ گئیں اور خود ہی نائٹ بلب جل اٹھے۔ میں سمجھ گیا کہ سسٹم کہیں باہر ہے۔ بل میں کمی کے لیے ایسا انتظام کیا گیا ہوگا۔ لائٹ بند ہونے کے بعد نیند خود بخود آنکھوں میں اتر آئی۔ پھر احساس ہی نہیں ہوا کہ کب میں سوگیا۔

صبح آنکھ کھلی تو خالہ جاگ رہی تھیں۔ شاید انہیں نیند ہی نہیں آئی تھی۔ مجھے اٹھتے دیکھ کر وہ بولیں۔ ''دیکھو اسے کہتے ہیں شہر۔ کتنا سویرے سب جاگ جاتے ہیں۔ ایک کراچی کے لوگ ہیں کہ دس بجے سے پہلے اٹھتے ہی نہیں۔''

ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوتے ہوتے آٹھ بج گئے۔ نو بجے ہم نے ہوٹل چھوڑ دیا۔ سائیکل رکشا پر سوار ہو کر ہم اسٹیشن کے لیے نکل پڑے۔

رکشا جب شہر کے بیچوں بیچ بنے بڑے سے میدان کے سامنے سے گزرنے لگا تو خالہ کا چرخہ پھر سے چل پڑا کہ یہ وہی میدان ہے جہاں مسلم لیگ کا جلسہ ہوا تھا۔ اسی میدان میں کانگرس نے جلسہ کیا تھا۔ اسی کے برابر وہ ہال ہے جہاں پہلی بار قیام پاکستان کی ضرورت پر آواز بلند کی گئی تھی۔ یہیں عبدالرب نشتر نے جلسہ گاہ میں کسی شہید مسلمان کی کٹی ہوئی انگلی دکھا کر مسلمانوں کی حمیت کو للکارا تھا۔

جیسے تیسے ہم ان کی تاریخ دانی سنتے سنتے اسٹیشن پر پہنچے۔ سامان رکشے سے اتارا اور دو قلیوں کے سروں پر اسے لاد کر پلیٹ فارم پر آئے۔ ہر طرف شور وغل، طرح طرح کے لوگوں کا اژدہام۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے ایک کونے کی جانب اشارہ کیا۔ قلی نے سامان اتار کر رکھ دیا۔ ہم سب وہیں پہ چادر بچھا کر بیٹھ گئے۔

برابر میں ہی برقعے میں ملبوس ایک عورت اور دو جوان لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ وہ ہمیں دیکھ کر کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ ان میں دو جوان لڑکیاں اور ایک بوڑھی خاتون تھی۔ ان کے ساتھ ایک سولہ سترہ سال کا لڑکا بھی تھا جو کبھی ان کے لیے پانی لاتا اور کبھی بھنے چنے تو کبھی اناناس کا پورا ٹکڑا۔ وقت گزرتا رہا اور بارہ بج گئے مگر ٹرین کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ ہم نے اب تک دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ بھوک مجھے بھی لگ رہی تھی پر ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ سب کو اکیلے سارے سامان کے ساتھ چھوڑ کر اسٹیشن کی دکان سے کچھ لے کر آؤں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ خاتون کھسک کر خالہ کے قریب آ گئی اور انتہائی اپنائیت سے بولی۔ ''بہن آپ کہاں جائیں گی؟''

وہ تو جیسے کھل اٹھیں اور خوش ہوتے ہوئے بولیں۔ ''بہن میں پاکستان سے آئی ہوں اور بھاگل پور جانا ہے۔ وہاں ایک قصبہ ہے سیورو ہیں میرے بھائی کے بچے اور بہت سے رشتے دار رہتے ہیں۔''

''اچھا۔ اچھا بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ میں بھی بھاگل پور جا رہی ہوں۔'' وہ نہایت گرم جوشی سے خالہ کا ہاتھ دباتی ہوئی بولی۔ ''یہ آپکی بیٹی ہیں؟'' انہوں نے سلمٰی کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں، نہیں میری بہو ہے، لیکن میں اسے سگی بیٹیوں جیسا چاہتی ہوں۔'' انہوں نے پیار سے سلمٰی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ پھر بولیں۔ ''آپ نے کچھ کھایا پیا یا یونہی بیٹھی ہیں۔''

تب خالہ نے بتایا۔ ''دل تو چاہتا ہے کہ کچھ کھاؤں پر بہو کو اکیلے چھوڑ کر کیسے ہٹوں۔ یہ میرا بھانجا لندن سے آیا ہے۔ یہ والا بھی پہلی بار ہندوستان آیا ہے۔ انہیں تو ہندوستان کی تہذیب کا بھی پتا نہیں اسی لیے میں باہر نہیں بھیج رہی ہوں۔''

وہ ہنس پڑی۔ ''تمہارا یہ مسئلہ میں حل کر دیتی ہوں۔'' پھر انہوں نے لڑکے کو آواز دی۔

''حمیدا۔ حمیدا دھر آؤ بیٹا۔''

وہ لڑکا قریب آ گیا۔

''بیٹا ذرا انہیں کھانے پینے کا سامان تو لا دو۔''

میں نے اسے سو کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ ''جو کچھ ملے لے آؤ ہاں! چائے ضرور لانا۔ سر دکھ رہا ہے۔''

لڑکے نے نوٹ میرے ہاتھ سے لیا اور دس منٹ کے اندر ہی پوری، کچوری اور مٹی کے کلڑھ میں چائے لے کر آ گیا اور نوے روپے میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔ میں حیران رہ گیا۔ صرف دس روپے میں اتنی چیزیں؟

''لو بہو!'' خالہ چہکیں۔ ''دیکھا یہاں کتنی فراوانی ہے۔ ہر چیز سستی ہے۔ صرف دس روپے میں کئی بندے پیٹ بھر کر کھانا کھا لیں۔''

سلمٰی حیرت سے پندرہ پوریوں، کچوریوں اور چائے کو دیکھنے لگی۔

''لو کھاؤ!'' خالہ نے تمام چیزیں اس کی جانب کھسکائیں اور بعد اصرار ان کی دونوں

بیٹیوں اور خاتون کو بھی شریک کرلیا۔

خاتون کا نام زلیخا تھا۔ان کی بیٹیوں کا نام کلثوم اور انعم تھا۔یہ لڑکا حمید ان کی بہن کا بیٹا تھا۔ان کی بہن پٹنہ میں رہتی تھیں۔حمید انہیں اسٹیشن چھوڑنے آیا تھا۔

ہم سب کھانے کے درمیان میں خوش گپیاں بھی کر رہے تھے۔زلیخا بیگم ایک زندہ دل عورت تھیں۔ان کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا۔بڑی عسرت بھری زندگی گزار رہی تھیں۔پاکستان سے بڑی عقیدت رکھتی تھیں۔کرید کرید کر پاکستان کے بارے میں پوچھ رہی تھیں جب کہ میں ہندوستان کے بارے میں سننا چاہتا تھا۔یہاں کی تبدیلیوں سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔

ان کی لڑکیاں بھی سلمٰی سے پاکستان کے بارے میں معلومات لے رہی تھیں۔سلمٰی اکتا کر بولی۔''دور کے ڈھول سہانے۔وہاں اتنی مہنگائی ہے کہ آپ اندازہ نہیں کرسکتیں۔''

''ہاں اور کیا۔'' خالہ نے بات اچک لی''سو کا نوٹ موا ایک کے برابر ہے۔جیسے نکالو فوراً خرچ۔اتنے بداخلاق لوگ کہ توبہ!پڑوسی کو پڑوسی کی خبر نہیں بھلے ہی کوئی مار کر ڈال جائے لیکن وہ مدد کو نہ آئیں گے۔ایسے متکبر اور بد دماغ لوگ ہیں کہ اللہ کی پناہ!'' انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

وہ سب انہیں حیرت سے دیکھنے لگیں۔گویا ان کو خالہ کی بات کا یقین نہ آیا ہو۔

''بہن!اچھے برے لوگ ہر جگہ ہیں۔یہاں خود ہندوستان میں مسلمانوں کو کون سا سکھ ہے؟ ہمارا تو جینا دوبھر ہے۔اس قدر تعصب ہے کہ ہم اپنی جانوں سے بے زار ہیں۔جوان لڑکیوں کا ساتھ ہے۔رات رات بھر جاگتے گزرتی ہے۔'' وہ یاس بھرے لہجے میں بولیں۔''ہر علاقے،ہر گاؤں،قصبوں میں یہی حالت ہے۔ہماری بدقسمتی کہ ہم پاکستان نہ جاسکے۔کاش!ہمارے بزرگوں کو عقل ہوتی تو آج ہم بھی اسلامی ملک پاکستان میں جا بیٹھے ہوتے۔مسلمانوں کو ڈھنگ کی نوکری ملتی ہے نہ کوئی عزت!تف ہے ایسی زندگی پر۔'' وہ سخت دل گرفتہ ہوگئی تھیں۔

خالہ اندر ہی اندر تپ گئیں۔''ناشکری نہ کریں۔کم از کم اپنے رشتے داروں کے درمیان تو رہ رہی ہیں۔ہمیں دیکھیں!ہم اپنوں کو دیکھنے کو بھی ترس گئے ہیں۔بزرگوں کی قبروں پر فاتحہ تک نہیں پڑھ سکتے۔''

اسی وقت حمید آگیا۔''خالہ!دانا پور فاسٹ پیسنجر کا کچھ پتا نہیں کب آئے آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔''

''لو اور مصیبت!'' زلیخا بڑبڑائی۔

میں بھی کوفت محسوس کرنے لگا تھا۔

ایک بجے گاڑی آئی۔ہم لوگ جلدی جلدی سوار ہوئے۔حمید ہمیں سوار کرکے اپنے گھر چلا گیا۔زلیخا کی نظریں دور تک اس کی بلائیں لیتی رہیں۔

ہمیں بڑی اچھی جگہ ملی تھی۔بالکل کھڑکی کے پاس،زلیخا کے سامنے خالہ بیٹھ گئیں اور اس کی دونوں بیٹیاں دوسری کھڑکی کے پاس۔گاڑی پٹنہ جنکشن سے روانہ ہوئی۔سلمٰی بولی۔

''خالہ کیا آپ پاکستان جانے سے پہلے اسی راستے آتی جاتی تھیں؟''

وہ خوش ہو کر بولیں۔''ہاں بیٹی جیسے جیسے گاڑی چلے گی میں تمہیں یہاں کے علاقوں سے آگاہ کرتی جاؤں گی۔''

زلیخا ہنس کر بولی۔''ارے اتنی پرانی باتیں کیا آپ کو اب بھی یاد ہیں؟''

خالہ افسردہ ہوگئیں۔''لو بھلا میری روح تو یہیں پر تھی۔خالی جسم کا پنجر پاکستان میں تھا۔جب دل ہی مرجائے تو خالی پنجر کس کام کا۔'' گاڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔

میں نے زلیخا کی وجہ سے الٹی طرف کی سیٹ منتخب کی تھی۔میرے ساتھ رابیل آگیا تھا۔ہم آمنے سامنے کی سیٹ پر بیٹھے کہ رابیل نے کہا''اس طرف بیٹھنے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ خالہ کی بک بک سے نجات رہے گی۔''

اس کے انداز کلام پر میں مسکرا اٹھا اور بولا''ایسا کرو تم اپنی بک بک شروع کردو۔''

رابیل بھی ہنس پڑا اس نے کہا۔''تو سنیں''

''ہم سب رات کے اندھیرے میں آصفہ کے کمرے میں میٹنگ کر رہے تھے۔

آصفہ نے سب کو اپنی طرف دیکھتے پا کر کہا''سہیل نے عہدہ واپس پانے کے لئے ہماری مدد مانگی ہے۔میں عہدے دے کی واپسی کے لئے ایک منصوبہ بتاؤں گی۔اس منصوبے کی ایک خوبی یہ ہوگی کہ اسے عہدہ بعد میں ملے گا پہلے ہمیں پتا چلے گا کہ شیر خان کون ہے۔''

''وہ منصوبہ بھی بتادو۔'' شگفتہ بولی۔

''صبح بتادوں گی۔اب تم لوگ جا کر سو جاؤ اور تم......'' اس نے میری جانب اشارہ کیا۔''واپسی کے وقت سہیل انکل کا دروازہ کھول دینا۔''

صبح فریج سے کھانے کی اشیا نکال کر سہیل نے دیں۔آصفہ اور شگفتہ نے مل کر جلدی جلدی ناشتہ تیار کرلیا۔ناشتے کی ٹیبل پر ہم سب ساتھ بیٹھے تھے کہ سہیل نے پوچھا۔''کیوں تم

لوگوں نے کچھ سوچا؟"

"جی ہاں!" آصفہ نے کہا۔"اپنی اسکیم بتانے سے پہلے میں چند سوال کروں گی۔"

"پوچھو۔"

"آپ اس بات سے باخبر ہیں کہ نجمہ آواز کی نقل میں سب سے آگے ہے کیا اس کے ذریعے آپ اپنے گروہ پر قبضہ نہیں کر سکتے؟"

"صرف شیر خان کی آواز سے کام نہیں چل سکتا۔ شیر خان کا میک اپ کر کے میں مائک کے سامنے کھڑا ہوتا تھا۔ شیشے کی دوسرے جانب بیٹھے تمام ممبران کی نگاہیں میرا احاطہ کیے رہتی تھیں۔ میں اگر نجمہ کے سر پر سفید بالوں کا وگ لگا دوں' سفید داڑھی مونچھیں بھی لگا دوں اور سفید سوٹ میں اسے مائک کے سامنے کھڑا کر دوں پھر بھی ممبران کو یقین نہیں آئے گا۔ اس لیے نہیں آئے گا کہ نجمہ کے قد کاٹھ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔"

آصفہ نے سر جھکا لیا اور سوچنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے سوال کیا۔"اشفاق کیسا آدمی ہے؟ یعنی وہ سنڈیکیٹ کا وفادار ہے یا شیر خان کا؟"

"سنڈیکیٹ کا۔"

"اتنی جلدی نہیں' اچھی طرح سوچ لیجیے۔ اسی سوال پر میرے منصوبے کی بنیاد ہے۔ آپ ہی کے مطابق وہ عثمانی کے کافی قریب ہے' کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ سنڈیکیٹ کے بجائے عثمانی کا وفادار ہو۔"

"میں اشفاق کو عثمانی سے بہتر جانتا ہوں۔" سہیل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔"وہ اس وقت عثمانی کے لئے جان دے سکتا ہے جب تک اسے یہ یقین ہے کہ عثمانی ہی شیر خان ہے۔ ٹھیک اسی طرح وہ عثمانی کی جان لے لے گا جس وقت یہ یقین ہو جائے گا کہ وہ شیر خان نہیں ہے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا عثمانی نے آپ کے خط کے بارے میں اشفاق سے بات کی ہوگی؟"

"اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"کیوں؟"

"عثمانی بہت چالاک ہے۔ وہ مقابل کو اتنا ہی بتاتا ہے جتنا بتانے میں اسے فائدہ ہے'

اگر خط کے بارے میں اشفاق کو بتانے سے اسے اپنا کوئی فائدہ نظر آئے گا تو ضرور بتائے گا۔

"آپ کے پاس اس کا فون نمبر ہے؟"

"ہے مگر فائدہ؟"

"میں چاہتی ہوں کہ اسے گڑبڑ کا احساس ہو جائے۔"

"لیکن یہ جاننا کیسے ممکن ہے؟"

"ناممکن کو ممکن میں بتاؤں گی آپ نمبر دیجیے۔" سہیل نے نمبر دے دیا۔

"نجمہ تم شیر خان کی ایسی بھاری آواز نکالو کہ سہیل کو یقین آجائے۔" آصفہ نے کہا۔

"میں شیر خان بول رہا ہوں۔" نجمہ نے بھاری آواز میں کہا۔

"کچھ اور بھاری آواز میں قبائلی لہجہ ہونا چاہیے۔" سہیل نے کہا۔

دو تین بار کے بعد سہیل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ آصفہ نے پیغام لکھ کر اس کے سامنے بڑھا دیا۔ نجمہ نے نمبر ملایا پھر بولی۔"اشفاق میں شیر خان بول رہا ہوں۔"

"آپ سر......کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"اسی وقت ہیڈ کوارٹر پہنچو' مجھے خیر خواہ کا خط ملا ہے۔"

"خیر خواہ کا خط!" اشفاق کی حیرت بھری آواز سنائی دی۔"مگر اس خط کے بارے میں آپ بتا چکے ہیں سر!"

"میں پہلے نہیں دوسرے خط کی بات کر رہا ہوں فوراً ہیڈ کوارٹر پہنچو۔"

"میں پہنچ رہا ہوں سر!" اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

"وقت کم ہے' تم اس کے گھر پہنچ جاؤ۔ سہیل پہنچا دیں گے۔" آصفہ نے مجھ سے کہا۔

"لیکن پولیس میری تلاش میں ہوگی۔ جیل سے فرار کی خبر ہر تھانے میں پہنچا دی گئی ہوگی۔"

"ایک منٹ سے بھی کم وقت میں اپنے سر کو کمال سے منڈوالو۔" پھر آصفہ نے سہیل کی جانب مڑ کر کہا۔"انکل قینچی اور سیفٹی ریزر ہو تو دیجیے۔"

"ابھی لایا۔" کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔ کچھ دیر بعد لوٹے تو ان کے ہاتھ میں کپڑے کاٹنے والی قینچی تھی اور ایک سیفٹی ریزر۔

"واش روم میں لے جا کر اپنا کام شروع کر دو۔" آصفہ نے کمال کو حکم دیا۔

جب میں باہر نکلا تو سر منڈا ہوا تھا۔

"انکل اپنی نقلی داڑھی اسے لگا دیں اور چشمہ دے دیں۔"

آصفہ کے حکم پر انھوں نے میرے چہرے پر داڑھی چپکا دی۔ میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ چشمہ لگانے کے بعد میرا حلیہ مکمل طور پر بدل گیا تھا۔ میرے دوست بھی دیکھ کر نہ پہچان پاتے۔ اتنی خوبصورتی سے داڑھی چپکائی گئی تھی کہ کسی رخ سے بھی نقلی نہیں لگ رہی تھی۔

"چلو بھئی دیر ہو رہی ہے۔" سہیل نے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

سہیل کی ڈرائیونگ قابل تعریف تھی۔ کچھ ہی دیر میں ہم اشفاق کے گھر پہنچ گئے۔

"ابھی تک وہ نکلا نہیں ہے۔" سہیل نے ایک بنگلے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ اس کی کار کھڑی ہے۔"

سہیل کی کار سے نکل کر میں اشفاق کی کار کے نزدیک پہنچا۔ اتفاق تھا کہ کار لاک نہیں تھی۔ میں نے پچھلا دروازہ کھولا اور پائیدان پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد کار کا دروازہ پھر کھلا۔ اگنیشن میں چابی گھومی۔ انجن غرایا اور پھر کار چل پڑی کچھ دیر بعد میں اٹھ کر بیٹھ گیا پھر پستول کی نال کو اس کی گردن پر رکھ کر غرایا "کار موڑ لو۔"

"کو......کون ہو تم؟" وہ ہکلایا۔

"تمہاری موت! جدھر میں کہہ رہا ہوں ادھر موڑو۔" میرے کڑے لہجے نے اسے مرعوب کر دیا۔ وہ میرا حکم ماننے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے میرے حکم پر کار موڑ لی۔ آہستہ آہستہ ہم شہر سے باہر نکل آئے۔ سنسان سڑک دیکھتے ہی میں نے کہا۔ "کار روک لو۔"

کار رکتے ہی میں نے سرعت سے پستول کے دستے کو اس کی گدی پر مارا۔ وہ اوق کی آواز نکالتا ہوا لڑھک گیا۔ میں اچھک کر اگلی سیٹ پر آ گیا اور ڈرائیونگ سیٹ سے اسے ہٹا کر کار کا رخ شہر کی جانب موڑ لیا۔

سہیل کے بنگلے پر پہنچا تو اس کی کار کھڑی تھی۔ میں اشفاق کو کندھے پر لاد کر اندر لے گیا وہ سب میرے منتظر تھے۔ میں نے اشفاق کو کرسی پر بٹھا کر رسی سے باندھ دیا۔ نجمہ دوڑ کر پانی سے بھرا جگ لے آئی۔ میں نے اشفاق کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے وہ کچھ دیر کی کوشش کے بعد ہوش میں آیا۔ اس نے آنکھیں کھولتے ہی سوال کیا۔ "تم لوگ کون ہو؟"

"ہم وہی ہیں جس کی خاطر سنڈیکیٹ نے جیل کی دیواریں توڑنا چاہی تھیں۔"

"تم لوگ غلط ہاتھوں میں پڑ گئے ہو۔ تمہارے لئے سنڈیکیٹ کے پاس ایک ایسا منصوبہ ہے جو تمہیں راتوں رات جرائم کی دنیا کی بلندی پر پہنچا دے گا۔ یاد رکھو سنڈیکیٹ اگر مدد نہ دیتی تو تم سب کبھی بھی جیل سے فرار نہ ہو سکتے۔"

آصفہ نے نزدیک پہنچ کر نرم لہجے میں پوچھا۔ "سنڈیکیٹ نے ہمارے لیے کیسا منصوبہ سوچ رکھا ہے؟"

اشفاق نے افیون کی کھیتی سے شروع ہو کر مافیا کا صفایا کرنے تک کا منصوبہ سمجھا دیا۔

اس کی بات ختم ہوتے ہی آصفہ نے مڑ کر مجھ سے کہا۔ "یہ تو وہی گا رہا ہے جو خیر خواہ گاتا رہا ہے۔ اس لیے ایکشن نمبر ٹو اپناؤ۔"

میں نے سرعت سے اپنا رخ سہیل کی جانب پھیرا اور بولا۔ "انکل ہم اشفاق سے کچھ خفیہ بات پوچھنا چاہتے ہیں۔ پلیز آپ باہر چلے جائیں۔"

"آں!" ان کے چہرے پر حیرت چھا گئی۔ تب تک کمال ان کی پشت پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ "سوری انکل ہم مجبور ہیں۔"

میرا اشارہ پاتے ہی کمال نے ان کی گردن پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا وہ چکرا کر گر پڑے۔

"ہاں اب تم بھی شروع ہو جاؤ۔"

"میں......میں کیا بتاؤں۔" اشفاق نے باری باری سب کا چہرہ دیکھا۔

سچ سچ بتاؤ تم کس کے آدمی ہو؟" کمال نے کڑک کر پوچھا۔

اشفاق کی نگاہیں ادھر سے ادھر چکرا رہی تھیں وہ ایک ایک کا چہرہ دیکھ رہا تھا شاید وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے۔ تبھی صادقہ جنگلی بلی کی طرح اچھلی اور ایک پیر پر کھڑی ہو کر آدھا دائرہ بناتے ہوئے گھومی۔ دوسرا پیر خط مستقیم کی طرح سیدھا تھا جو پوری قوت سے اشفاق کے چہرے سے ٹکرایا تھا وہ "ہا" کی آواز نکالتا ہوا الٹ گیا تھا اور اس کے منہ سے "ہائے" بھی پورا نکل نہیں پایا تھا۔ کرسی بھی اس کے ساتھ گری تھی۔ یقیناً اس کے سر میں شدید چوٹ لگی تھی اور آنکھوں کے آگے اندھیرا بھی پھیل گیا ہوگا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور پھر بولا۔ "بیٹے ہم بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ فٹافٹ بتاتے چلے جاؤ ورنہ تمہاری خیر نہیں۔"

اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا، خون کی بوندیں ٹپکنے لگی تھیں۔ چہرے پر کرب کے آثار ابھر آئے تھے۔ وہ خونخوار نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں نے جو کچھ کیا ہے اسی

حرامزادے کے کہنے پر کیا ہے۔" اس کا اشارہ سہیل کی طرف تھا جو ہنوز بے ہوش پڑے تھے۔

"یعنی تم قبول کرتے ہو کہ اس کے آدمی ہو؟" آصفہ نے انگلی سے سہیل کی جانب اشارہ کیا۔

"ہاں! اس نے مجھے ٹیپ شدہ آواز سنائی تھی کہ اسی آواز میں فون آئے گا۔ فون کرنے والا ہیڈ کوارٹر پہنچنے کے لئے کہے گا۔ میں احترام بھرے لہجے میں پوچھوں کہ کیا کوئی خاص بات ہے سر۔ تب دوسری جانب والا کسی خط کے بارے میں ذکر کرے گا۔ اس طرح اس نے مجھے ایک ایک بات سے آگاہ کردیا تھا کہ وہ کیا کہے گا۔ اور جواب میں مجھے کیا کہنا ہے۔"

"یعنی تم نے جو کیا اس کے حکم پر کیا؟" نجمہ نے اس کی بات کاٹی۔

"جی ہاں اس نے پانچ ہزار روپے بطور معاوضہ ادا کرنے کی بات کی تھی۔" اشفاق کے خون آلود ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"یہ حکم اس نے تمہیں کب دیا تھا؟"

"کل رات۔"

اس کے جواب نے ہم سب کو چونکا دیا۔ ہم بھونچکا سارہ گئے تھے۔ صرف آصفہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"کمینے جھوٹ بولتا ہے۔" صادقہ نے کرارا ہاتھ رسید کیا۔

"نہیں صادقہ' مار پیٹ کی ضرورت نہیں ہے۔' ہمارا پہلا تیر نشانے پر لگا ہے۔ شک بے بنیاد تھا اور یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ یہ وہی ہے جو انکل نے اس کے بارے میں کہا ہے۔ عثمانی کا رازدار۔"

"نہیں!" اشفاق چیخ پڑا۔ "میں اس کا ساتھی ہوں۔" اس نے سہیل کی جانب اشارہ کیا۔

"اگر اس کے ساتھی ہوتے تو یہ کبھی نہ کہتے کہ ہدایت تمہیں کل رات ملی ہے۔ اس بے چارے کو تو کل رات خود بھی نہیں پتا تھا کہ ہم اسے کیا ہدایت دینے والے ہیں۔" آصفہ نے رک کر سب کی جانب دیکھا اور مڑ کر اشفاق سے بولی۔ "ویسے تمہارے دماغ کی داد دینی پڑے گی اشفاق۔ ہمارے تیوروں سے تم نے بھانپ لیا کہ ابھی تک ہم نے انکل کی باتوں پر یقین نہیں کیا ہے۔ موقع کا فائدہ اٹھا کر تم نے فوراً اس کا ساتھی ہونا قبول کرلیا۔ اس کی وجہ بھی یہی ہوگی کہ ہمارا شک یقین میں بدل جائے۔"

"تب تو ہم نے انکل کے ساتھ بہت برا برتاؤ کیا ہے۔" شگفتہ بولی۔

"ہم معافی مانگ لیں گے۔ تسلی بھی تو ضروری تھی۔" آصفہ نے سمجھایا۔

"اب کیا کیا جائے؟" کمال نے پوچھا۔

"انتظار!" صادقہ نے مسکرا کر کہا۔

ہم سب انکل کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگے۔ شگفتہ پانی کے چھینٹے مار کر انکل کو ہوش میں لائی۔ پھر میں نے ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے حقیقت بتادی۔ انکل نے اس حرکت کو برا نہیں مانا۔ ہم سب کے دل کی آواز آصفہ کی زبان سے ادا ہوئی۔ "اب ہم بغیر شک و شبہ کے آپ کا ساتھ دیں گے۔"

انکل کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آئی۔ لیکن وہ کچھ بولے نہیں۔ آہستہ آہستہ اشفاق کے پاس پہنچے اور نرم لہجے میں بولے۔ "حالات کی ڈور میں باندھ کر ہم تمہیں ضرور لائے ہیں اشفاق' مگر ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ تم تو میرے بچے ہو۔ ایسے بچے جن پر میں فخر کرسکتا ہوں۔"

"تمھاری آواز کا جادو مجھ پر نہیں چلے گا۔ مجھے چیف نے سب کچھ بتا دیا ہے۔" اشفاق غرایا۔

"اس نے جو کچھ بھی بتایا ہے وہ جھوٹ ہے بیٹے۔"

اشفاق نے طنز کیا۔ "اور جو تم کہہ رہے ہو وہ سچ ہے؟"

"ہاں یہ سچ ہے۔ ہم تمہیں سچائی سے آگاہ کرنے کے لئے ہی لائے ہیں۔ جسے تم شیر خان سمجھ رہے ہو وہ نقلی ہے۔"

"اوہ! تو اصلی شیر خان آپ ہیں؟" اشفاق طنز کرنے سے باز نہ آیا۔

"سچ یہی ہے۔"

"اس سچ کی پڑیا بنا کر اپنی جیب میں رکھیں۔ مجھے اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش نہ کریں۔ پورے سنڈیکیٹ میں واحد آدمی ہوں جو چیف کے اصل نام اور چہرہ سے واقف ہے۔"

"تم غلط سمت بڑھ رہے ہو۔ اصلی شیر خان میں ہوں' اس نے دھوکے سے میرا چہرہ خراب کیا اور پھر سندور کھلا کر میرا گلہ بھی خراب کردیا۔ میری دوستی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اس نے سنڈیکیٹ کا راز معلوم کیا پھر میری کرسی پر آ کر جم گیا۔ اب میرے پاس وہ چہرہ ہے اور نہ وہ آواز'

جس کے ذریعے میں تم لوگوں پر اپنا جادو قائم رکھتا تھا۔"

"اور کچھ کہنا ہے؟" اس نے جماہی لے کر انکل کی جانب دیکھا۔

"مجھے کہنا ہے۔" آصفہ آگے بڑھی۔

"تم کیا کہو گی تم خود اس دھوکے باز کے جال میں جکڑی ہوئی ہو۔" اشفاق طنز کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"یہ فیصلہ ابھی ہو جاتا ہے کہ کون جال میں پھنسا ہوا ہے۔"

"یہ بات تو تم فون پر اپنی چالاکی سے جان چکی ہو۔"

"خط میں انکل کا جملہ تھا کہ تمہیں مار کر جلد ہی اپنی ریاست واپس لے لوں گا۔ کیا تم نے اس جملے پر غور کیا۔ انھوں نے سنڈیکیٹ کے لئے لفظ اپنی ریاست کا استعمال کیوں کیا؟"

اشفاق خاموش رہا۔ اس کے چہرے پر آئی تبدیلی نے بتا دیا تھا کہ وہ مخمصے میں پڑ گیا ہے پھر بھی وہ کھوکھلے لہجے میں بولے بغیر نہ رہ سکا۔ "کیا سنڈیکیٹ کو اپنا لکھ دینے سے وہ اس کی ملکیت ہو گئی؟"

"میں صرف اتنا سوچنے کی التجا کر رہی ہوں کہ انھوں نے ایسا کیوں لکھا؟"

"اس لئے لکھا کہ تم اس جملے کو بطور ہتھیار استعمال کر سکو۔ مجھ جیسے لوگوں کو سنڈیکیٹ سے غداری پر اکسا سکو۔"

"مطلب؟"

"خط اس نے لکھا۔" اشفاق نے انگلی سے انکل کی جانب اشارہ کیا۔ "لیکن الفاظ تمہارے تھے۔ تم نے جان بوجھ کر خط میں لفظ اپنی ریاست کا استعمال کیا ہے۔"

"یہ تمہارا خیال خام ہے۔ سچائی نام کو بھی نہیں۔ درحقیقت وہ خط انھوں نے ہم سے مشورہ کیے بغیر لکھا اور اس پرائیویٹ روم میں رکھ آئے تھے۔"

"ثبوت؟"

"ثبوت کچھ دیر پہلے کا واقعہ ہے۔" آصفہ کہتی چلی گئی۔ "تم نے دیکھا کہ ہم نے اس پر مکمل اعتماد اس وقت تک نہیں کیا تھا جب تک حقیقت کا پتا نہیں لگا لیا اور یقین دلایا تم نے، تمہاری باتوں نے۔"

"وہ واقعہ ڈرامہ بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"ڈرامہ اس لئے نہیں ہو سکتا کہ ہمیں تمھارے جواب کے مطلق خبر نہیں تھی۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ تم کس سوال کا کیا جواب دو گے۔" اشفاق لاجواب ہو گیا۔

"میں یہ نہیں کہتی تم میری باتوں پر سو فیصد یقین کرو لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ جس طرح اپنی کوشش سے ہم نے سچائی تلاش کی ہے تم بھی کوشش کرو۔"

"اس بدشکل آدمی کے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ اصلی شیر خان ہے؟"

"میرے بیٹے!" انکل نے شیریں لہجے میں کہا۔ "اگر میرے پاس ٹھوس ثبوت ہوتا تو اب تک میں کمیٹی سے سامنے پیش کر کے دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیتا۔ ہاں کچھ ایسی باتیں ضرور کہوں گا جو تمھیں سوچنے پر مجبور کر دیں گے۔"

"بکو۔" اشفاق نے ناگوار لہجے میں کہا۔

"میں پہلا اور آخری شخص ہوں جس کی لاش پر انعام رکھا ہے۔ یہ انعام کمیٹی نے نہیں شیر خان نے رکھا ہے۔ دماغ پر زور دے کر سوچو کہ ایسا میں نے کیا کر دیا ہے جس کی موت کا انعام مقرر کیا گیا؟ اس نے تمھیں یہ کیوں نہیں بتایا کہ اس کی مجھ سے کیا دشمنی ہے؟ اسے اپنا چہرہ تمھیں دکھانے کی ضرورت کیوں پڑی جبکہ تم بہت اہم ممبر بھی نہیں ہو۔"

اشفاق سوچ میں پڑ گیا۔

"اگر تمھیں یقین آجائے کہ وہ نقلی شیر خان ہے تب تم کیا کرو گے؟"

"ان کا حق دلانے کی کوشش کروں گا۔"

"بیٹے! اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میرے ہاتھ پیروں میں اب وہ خم نہیں ہے جس کی بدولت میں نے چھوٹے چھوٹے گروہوں کو خوفزدہ کر کے سنڈیکیٹ کے جھنڈے تلے جمع کیا تھا اسی لیے تم سب کا سہارا لے رہا ہوں مگر یاد رکھو۔ جسم کی قوت ختم ہوتی ہے تو عقل تیز ہو جاتی ہے۔" انکل نے میٹھے لہجے میں دھمکی دی۔

"یہ تو وقت بتائے گا۔ فی الحال میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟" اشفاق نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"شاید آخری بار تمھیں بے یقینی کا سامنا کرنا پڑے۔ ہم نہیں چاہتے ہیں کہ تم ہمارے اڈے کو پہچان سکو اس لئے تمھاری آنکھوں پر پٹی باندھ رہے ہیں۔" آصفہ نے کہا اور میں نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔

اشفاق کی رہائی کا چوتھا دن تھا۔ میں نے اسے فون کیا۔ فون اسی نے ریسیو کیا تھا۔ میں نے ہیلو کے جواب میں کہا۔

"شاید تم سے کوئی غلطی ہوگئی ہے۔"

"کیسی غلطی؟" اشفاق کے لہجے میں تجسس تھا۔

"اگر تم سے غلطی نہیں ہوئی ہے تو سنڈیکیٹ کے لوگ تمھاری نگرانی کیوں کر رہے ہیں۔؟ انکل نے نگرانی کرنے والوں کو پہچان لیا ہے۔"

"لیکن میں نے تو ایسا محسوس نہیں کیا۔"

"دھیان نہیں دیا ہوگا۔ خیر یہ بتاؤ سچائی جاننے کے لئے تم نے کچھ کیا؟"

"ہاں کیا۔"

"کس نتیجے پر پہنچے؟"

"فون پر بتا نہیں سکتا۔ آمنے سامنے بیٹھ کر بتاؤں گا۔"

لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔ چوبیس گھنٹے تمھاری نگرانی ہو رہی ہے۔ سچائی جاننے کے لئے جو کچھ تم نے کیا ہے اسی پر باریکی سے غور کرو۔ کہیں نہ کہیں تم سے چوک ضرور ہوئی ہے۔ اگر نہ ہوئی ہوتی تو سنڈیکیٹ کے لوگ تمھاری نگرانی کیوں کرتے۔ ممکن ہے تمھاری کسی بات پر اس دھوکے باز کو شک ہوگیا ہو کہ تم اصلیت جاننے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"مجھے تو ایسا کچھ نہیں لگتا پھر بھی چیک کروں گا۔"

"او کے راستہ نکال کر ملاقات کروں گا۔" کہتے ہوئے میں نے فون بند کر دیا اور بوتھ سے نکل کر ٹیکسی اسٹینڈ پہنچا۔

آصفہ نے صبح بتا دیا تھا کہ مجھے شام میں عثمانی کو چیک کرنا ہے اور موقع پا کر اسے موت کی دھمکی دینا ہے۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر میں سیدھا عثمانی کے گھر پہنچا۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد وہ اپنے بنگلے کی جانب نہیں گیا تھا۔ اس نے ایک نیا مکان حاصل کر لیا تھا۔ میں اس مکان کے سامنے ٹیکسی سے اترا تھا کہ اس کی کار باہر نکلتی نظر آئی۔ میں دوبارہ اسی ٹیکسی میں سوار ہوگیا اور پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اس کی کار جائز ہوٹل کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ وہ نیچے اترا' میں نے بھی ٹیکسی چھوڑ دی اور اس کا تعاقب کرتے ہوئے اس عمارت کے کمرا خاص میں داخل ہوگیا۔ اندر گہرا اندھیرا تھا۔ اسی وقت ایک پھنکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "گولی ماردوں گا' خبردار ہلنا مت۔" مجھے ایسا لگا کہ

عثمانی پر سکتہ سا طاری ہوگیا ہے۔ اس کے ہیولے کے برابر کسی اور کا بھی ہیولا نظر آیا۔ ساتھ ہی ساتھ ایک بے ساختہ قسم کی چیخ بھی سنائی دی۔ اور پھر عثمانی کا جسم اُلٹا لٹکا ہوا محسوس ہوا کیوں کہ اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

"کو...... کون ہو تم۔" عثمانی کی آواز میں لرزہ تھا۔

تبھی چٹ کی آواز ہوئی اور کمرا روشن ہوگیا۔ واقعی عثمانی الٹا لٹکا ہوا تھا اور اس کا پیر رسی کے ذریعے چھت کے کنڈے میں بندھا ہوا تھا۔ یقیناً پہلے سے ہی پھندہ تیار تھا۔ دوسرے شخص نے جس کے ہاتھ میں پستول تھا ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا" کہو شیر خان کیسا لگ رہا ہے۔"

"کمینے ذلیل تیری یہ ہمت کہ تو مجھ پر ہاتھ ڈالے۔"

"زبان کو لگام دو شیر خان! ورنہ گولی نرخرے کے پار ہوگی۔"

"دو ٹکے کا ہرکارہ تیری یہ ہمت کہ مجھے دھمکی دے۔"

"الٹا لٹکنے کے بعد بھی عقل سیدھی نہ ہوئی۔ تجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ کمرا ساؤنڈ پروف ہے۔ یہاں سے تمھاری چیخ باہر نہیں جائے گی پھر نیچے آج میری ڈیوٹی تھی۔ صبح تک کوئی بھی نیچے نہیں آئے گا۔"

اس کی باتوں سے میں نے سمجھ لیا کہ وہ شیر خان کے سکیورٹی اسٹاف میں سے ہے۔

"تم...... تم کیا چاہتے ہو؟" عثمانی کی آواز میں تکلیف ہی تکلیف تھی۔ وہ ایک پیر پر الٹا لٹکا ہوا تھا۔

"پہلے یہ پوچھ کہ میں کون ہوں؟"

"کو...... کون ہو تم؟"

"میں رحمت علی کا بیٹا ہوں' جسے تم نے رحمت سمجھ کر گولی ماردی تھی۔ اس کا جرم صرف اتنا تھا کہ اس نے تیری ایسی تصویر کھینچ لی تھی جس میں تم بغیر وگ اور داڑھی میں تھے۔ یاد آیا؟"

"وہ...... وہ میں نہیں تھا۔ یقین...... کرو...... وہ دوسرا شیر خان تھا۔ مجھے سیدھا کر دو میں سب...... بتا دوں گا۔"

"تجھے آزاد کردوں تاکہ تو گھنٹی بجا کر خطرے کا اعلان کردے۔ نہیں ایسا کبھی نہیں کروں گا۔ تو اسی حالت میں سچائی بتا ورنہ......" اس نے گراری دار چاقو نکالا' کڑکڑاہٹ کی آواز سے کمرا گونج اٹھا۔ "میں اسی چاقو سے تیری کھال اتاروں گا۔ یاد ہے تو نے بھی میرے ابا کی کھال

اتاری تھی۔ انھیں اس وقت تک اذیت دیتا رہا تھا جب تک انھوں نے فوٹو کی نشاندہی نہیں کر دی تھی۔ آج وہی ڈرامہ میں تیرے ساتھ کھیلوں گا۔"

"یقین کرو راحت میں بے قصور ہوں۔ شیر خان بن کر اپنا انتقام لے رہا ہوں۔"

"کیسا انتقام؟" راحت نے چھری کی دھار پر انگلی پھیری۔

"میں بھی تمہاری طرح انتقام کی آگ میں جلا کرتا تھا۔ میں نے عقل کا استعمال کیا اور موقع ملتے ہی شیر خان کو دبوچ لیا اور پہاڑی علاقے کی ایک جھگی میں لے گیا اور اپنی بیٹی کے ہیروئنچی بننے کا انتقام لے لیا۔ اسے اتنا ٹارچر کیا کہ وہ معذور ہو گیا۔ اس کی آواز چھین لی' جلا کر اس کا چہرہ بھی بگاڑ دیا۔ میں نے اسے مردہ سمجھ کر پھینک دیا تھا مگر وہ سخت جان نکلا۔ زندہ رہ گیا اور دوبارہ میرے مقابل آ گیا ہے۔"

"اس کا اصل نام؟"

"سہیل...... سہیل اختر!"

"ثبوت؟"

اس الماری میں وہ البم ہے۔ اتفاق کہو کہ اب تک میں نے اسے ضائع نہیں کیا ہے اس میں وہ تصویر بھی ہو گی جسے یقیناً تمہارے ابا نے کھینچی ہو گی۔ اگر پہچان سکتے ہو تو پہچان لو۔"

راحت اس الماری کی جانب بڑھا۔ دراز کھولی اور ایک البم نکال کر اس میں رکھی تصویر دیکھی۔ فوٹو دیکھنے کے بعد بولا۔ "ہاں' یہ تصویر میرے ابا نے کھینچی ہے۔ ان کے کیمرے کے لینس پر ہلکا سا بال تھا جس کا عکس تصویر میں بھی نظر آتا تھا۔ وہی عکس اس تصویر میں بھی ہے۔ پھر اس نے صفحہ پلٹا۔ مختلف سن کی متعدد تصاویر تھیں۔ ہر تصویر کے پیچھے لکھا تھا شیر خان سن...... میں...... شاید یہ سربراہ کی شناخت تھی۔

"اب تو مجھے سیدھا کر دو۔" عثمانی گڑبڑایا۔ راحت نے البم بند کر کے کہا۔

"نہیں فی الحال یہ ناممکن ہے۔"

"نہیں' ایسا نہیں ہو گا۔ ہم دونوں سہیل کے خلاف ایک ہی آگ میں جل رہے ہیں۔ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔ اس حساب سے ہم دوست ہوئے۔ یقین رکھو میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔" عثمانی اٹک اٹک کر بولا۔

"جو اتنے سارے راز جان چکا ہے اسے تم زندہ نہیں چھوڑ سکتے لیکن میں ایک فوجی

ہوں۔"

"تم فوجی ہو؟" عثمانی نے اس کی بات کاٹی۔

"ہاں میں ایک فوجی ہوں۔ جس وقت میں جان کی بازی لگا کر دشمن کو پیچھے دھکیل رہا تھا۔ اپنے ہم وطنوں کی حفاظت میں سینہ سپر تھا۔ انہی دنوں مجھے خبر ملی تھی کہ میرے ہی کسی ہم وطن نے میرے گھر کو اجاڑ دیا ہے۔ لیکن اس وقت وطن کی حفاظت مقدم تھی۔ اس لیے برف پوش پہاڑوں سے نیچے نہیں اترا۔ اب لوٹا ہوں تو قاتلوں سے دو دو ہاتھ کیے بغیر چین نہیں ملے گا۔ اسی لیے تو میں جرم کی دنیا میں آیا۔ لیکن تم بے فکر رہو۔ میں فوجی ہوں۔ زبان کا دھنی' میں تمہاری جان نہیں لوں گا۔ جاتے وقت یہ چاقو دے جاؤں گا۔ تمہارے ہاتھ آزاد ہیں۔ جھولتے ہوئے آگے بڑھ کر اٹھا لینا پھر کمر موڑ کر اسے کاٹ لینا تب تک میں تصویر کے ساتھ باہر نکل چکا ہوں گا۔"

"اس کا کیا کرو گے؟"

"یہ میری ضمانت ہے۔ جب تک میرے پاس رہے گی تم پر خوف طاری رہے گا کہ میں کمیٹی کو تصویر دکھا کر یقین دلا سکتا ہوں۔ پھر اسی کے سہارے تو میں اسے تلاش کروں گا۔"

"مگر اب تو اس کی شکل بدل چکی ہے۔"

"اس تصویر کے سامنے دو تصویریں اور بھی تھیں ایک میں عورت بھی ساتھ ہے۔ یقیناً یہ اس کی بیوی ہو گی۔ یا پھر کوئی ایسی عورت جسے وہ دنیا والوں کی نظروں سے چھپائے رکھنا چاہتا ہو گا۔ حفاظت کا یہاں معقول انتظام بھی تو ہے۔"

"ہاں وہ اس کی بیوی ہے۔"

"تو یقیناً اس کے لئے یہ تصویر کافی قیمتی ہے۔ میں اخبار میں اشتہار دوں گا۔ اخبار میں اس کی تصویر ہو گی کہ یہ تصویر دوسری تصاویر کے ساتھ مجھے راہ چلتے پڑی ملی ہے جن صاحب کی ہے آ کر لے جائیں۔ وہ دوڑتا ہوا پہنچے گا اور میں اسے مرضی کے مطابق سزا دوں گا۔"

پھر اس نے چاقو زمین پر رکھا اور باہر نکل آیا۔ وہ اندر والے دروازے سے باہر گیا تھا میں باہر والے دروازے سے نکل کر سڑک پر پہنچ گیا۔

میرے دماغ میں طوفان سا مچا تھا۔ میں نے اس جنونی کے تیور دیکھے تھے۔ وہ فوجی تھا۔ زبان کا پکا تھا۔ اس نے قسم کھائی ہے تو سہیل انکل کو ختم کر کے ہی چین سے بیٹھے گا۔ میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ ایسی حالت میں انکل کو بتانا صحیح ہے بھی کہ نہیں۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

اِسی اُلجھن میں گھر بنگلے پر پہنچا تو آصفہ' کمال اور صادقہ تیار بیٹھے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی آصفہ نے کہا۔ "بڑی دیر لگادی' ہم آج ہی اشفاق سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"مل آؤ" میں نے جواب دیا۔

"پہلے ایک بندہ گرانا ہے۔ کلاشن کوف تیار ہے۔ انکل چلائیں گے تم صرف کور دینا"

ہم باہر نکل آئے۔ کار تیار تھی۔ انکل پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ صادقہ تھی۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ آصفہ میرے برابر بیٹھ گئی۔ اشارہ ملتے ہی میں نے انکل کی اسپیشل وین کے اگنیشن میں چابی گھمائی' غراتے ہوئے انجن جاگ اٹھا اور پھر وین کمان سے نکلے تیر کی طرح سڑک پر دوڑتی چلی گئی۔ میں نے جان بوجھ کر اسپیڈ بڑھادی تھی۔ جگہ جگہ پولیس والے گاڑیوں کو روک کر تلاشی لیتے تھے۔ کہیں کسی موبائل نے روک لیا تو کیا ہوگا۔ وین اسپیڈ میں رہی تو رکتے رکتے بھی کئی فرلانگ دور رکے گی۔ اتنی دور آ کر چیک کرنا بعض وقت ان کے لیے ناممکن ہوتا ہے ایسی حالت میں دو ہی باتیں ہوتی ہیں۔ یا تو جانے کی اجازت دے دیتے ہیں یا پھر غصہ اتارنے کے لئے ایک ایک انچ کی تلاشی لیتے ہیں۔ اگر تلاشی کی نوبت آجائے تو بھاگنے کا راستہ کھلا رہے یہی سوچ کر میں نے اسپیڈ بڑھائی تھی۔ اتفاق کی بات ہے راستے میں کہیں بھی موبائل سے ٹکراؤ نہیں ہوا۔ اور ہم اشفاق کے محلے میں پہنچ گئے۔ اس کے گھر میں چند قدم کے فاصلے پر ایک آم کا پیڑ تھا۔ اس پیڑ کے نیچے ایک شخص کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھوں میں غبارے تھام رکھے تھے۔ دور سے ہی وہ غبارہ بیچنے والا نظر آرہا تھا۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر اسپیڈ کم کی۔ اسی وقت انکل نے کلاشن کوف کی نال کھڑکی سے باہر نکالی۔ رٹ رٹ کی مخصوص آواز ابھری اور غبارے والا لڑھک گیا۔ آس پاس کی زمین خون سے سرخ ہوگئی۔ میں نے پھر اسپیڈ تیز کردی۔ کافی آگے نکلنے کے بعد دوسرے راستے پر مڑا اور پھر واپس ہولیا۔ اشفاق والی گلی کے دوسرے سرے پر پہنچ کر وین روکی اور ہم سب اتر پڑے۔ انکل نے سیٹ کے نیچے کلاشن کوف چھپائی اور ہمارے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ گلی کے آخری سرے پر اشفاق کا مکان تھا۔ اس کے دروازے پر پہنچ کر میں نے دستک دی۔ دروازہ کھل گیا۔ سامنے ہی اشفاق کھڑا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی مسکرا اٹھا۔ ہم اندر داخل ہوئے۔

اس نے دروازہ بند کیا اور بولا۔ "کہیے کیسے آنا ہوا؟"

"بس چلے آئے اپنی سناؤ!"

پھر صادقہ بولی "ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔"

"لیکن باہر تو سنڈیکیٹ کے لوگ ہوں گے۔"

"تم فکر نہ کرو۔ ایک بندہ تھا جو اب جنت میں بیٹھا جلدی آنے کا مقصد یاد کر رہا ہوگا۔"

"اوہ...... چلیے۔"

اشفاق کی آنکھوں پر ہم نے پٹی باندھ دی۔ اسی حالت میں ساتھ لے کر ہم بنگلے پر پہنچے۔

پٹی کھلتے ہی اشفاق نے کہا۔ "راستے میں تو میں نے کچھ کہا نہیں مگر اب کہنا چاہتا ہوں۔"

"آصفہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"لگتا ہے ابھی تک آپ لوگوں نے مجھ پر یقین نہیں کیا۔"

جھوٹ نہیں بولوں گی اشفاق!" آصفہ نے کہا۔ "تم پر پورا بھروسہ نہیں کر پائے ہیں اور سچ پوچھو تو ابھی تک بھروسے جیسی بات بھی سامنے نہیں آئی ہے بلکہ تم کچھ اور ہی نظر آرہے ہو۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"ہم سائنسی دور میں سانس لے رہے ہیں۔ الیکٹرونکس کے سامان عام ہیں۔ ایسی ایسی چیزیں بہ آسانی مل جاتی ہیں جسے پہلے لوگ جادو سمجھتے تھے۔ اب یہیں دیکھو......" کہتے ہوئے اس نے اشفاق کے کوٹ کا کالر پچھلی جانب الٹ دیا۔ وہاں کاکروچ سے کچھ چھوٹا ایک کیڑا چپکا ہوا تھا۔ اسے نکال کر آصفہ نے ہتھیلی پر رکھا پھر بولی۔ "اسے پہچانتے ہو؟"

"یہ کیا ہے؟" اشفاق نے پوچھا۔

"الیکٹرونکس کا کمال' یہ ایک ایسا مائک ہے۔ جس کے ذریعے دو ڈھائی کیلومیٹر کی رینج میں ایک خاص سیٹ پر تمھاری باتیں سنی جاسکتی ہیں۔ ایسا آلہ جاپان کی ایک مشہور کمپنی نے تیار کر کے مارکیٹ میں بھیجا ہے۔ اس کی خریداری صرف حکومتی سطح پر ہوتی ہے۔ پھر بھی ہم نے حاصل کر لیا ہے۔ اس کے ذریعے کیچ کی گئی باتیں سنو گے؟ لو سنو۔" کہتے ہوئے آصفہ نے ٹیپ ریکارڈ آن کردیا۔

مجھے بھی حیرت کا شدید جھٹکا لگا' اتنی اہم بات مجھ سے چھپائی گئی تھی۔ پھر بھی میں نے کچھ نہیں کہا اور ہمہ تن گوش ہوگیا۔ ٹیپ ریکارڈ سے پہلی آواز اشفاق کی سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"سہیل کا امتحان لینے کے لئے میں نے دو سال پرانے واقعے کا ذکر کیا۔ اس واقعہ کا جب پشاور

کے نواحی علاقے میں پولیس آپ کے پیچھے لگ گئی تھی اور آپ کا داہنا پیر گولی سے زخمی ہو گیا تھا۔ میں نے اس سے داہنا پیر دکھانے کو کہا تو وہ بغلیں جھانکنے لگا۔"

دوسری آواز اُبھری۔ "لیکن سر وہ بہت چالاک ہے۔ اس نے فوراً ہی تاویل پیش کر دی۔ کہنے لگا وہ نشان تو میں نے پلاسٹک سرجری کے ذریعے ختم کرا دیا تھا۔ اسی وقت جب میں شیر خان تھا۔"

"حیرت ہے، پشاور کی باتیں اسے کیسے معلوم ہو گئیں؟"

"ہو سکتا ہے، اسے یہ بات آپ نے بتائی ہو۔ یاد کیجیے۔"

"ہاں یاد آ گیا۔ میں نے ایک روز اسے بتایا تھا لیکن تمھیں اس بات کا ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"میں اسے پھانسنا چاہتا ہوں۔"

"کیسے؟"

"کچھ دن بعد وہ خود مجھ سے یہ جاننے کے لئے رابطہ کرے گا کہ سچائی جاننے کی میری کوشش کا نتیجہ کیا نکلا۔ میں ان کی ہاں میں ہاں ملا دوں گا۔ کہوں گا کہ اپنی کوشش کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شیر خان نقلی ہے۔"

"کوئی خاص اسکیم ہے کیا؟"

"بڑی سیدھی اسکیم ہے۔ انھیں یقین دلا کر ان کے ساتھ شامل ہو جاؤں گا اور انھیں پرسنل راستے کے ذریعے پرائیویٹ روم تک لاؤں گا۔ اسی راستے سے جس کے بارے میں آپ نے مجھ پر یقین کر کے بتایا تھا۔ اگر انھوں نے مجھ پر یقین کر لیا تو یقیناً پھنس جائیں گے۔"

"آصفہ نامی لڑکی بڑی ذہین ہے مجھے یقین نہیں ہے کہ وہ آسانی سے پھنسے گی۔"

"میری گھڑی ہوئی کہانی اور اداکاری اسے یقین دلا دے گی۔"

"یہ اسکیم خطرناک ہے تمہاری جان بھی جا سکتی ہے۔"

سنڈیکیٹ کے لوگوں کو ہنستے ہوئے مرنے کی تعلیم آپ ہی نے دی ہے سر!"

"ایک اسکیم اور ہے۔ تم کسی طرح شگفتہ کو بتا دو کہ شیر خان میں ہوں۔ وہ میری بیٹی ہے۔ میرا نام سنتے ہی وہ سر دھڑ کی بازی لگا دے گی۔ یہ میرا دعویٰ ہے کہ اب تک سہیل نے انھیں جو کچھ پڑھایا ہو گا سب بھس ہو جائے گا۔ شگفتہ انھیں رام کر لے گی۔"

"ٹھیک ہے میں انھیں یہ انفارمیشن دے دوں گا۔ آپ اس پر شگفتہ پہ سختی کریں تا کہ وہ اس کے گروہ سے نکل آئے۔"

"دراصل سنڈیکیٹ کے دشمن کو میں اپنا دشمن سمجھتا ہوں، وہ میری بیٹی ہے تو کیا ہوا سنڈیکیٹ کے خلاف ہے اسی لیے میں نے اس پر اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا ہے۔"

"ایک سوال پوچھوں؟"

"بولو؟"

"سہیل کا چکر کیا ہے؟"

"اگر تم یہ پتا لگانے کی کوشش کر رہے ہو کہ اصلی شیر خان کون ہے۔ میں یا سہیل تو میں اپنا داہنا پیر دکھاؤں جہاں گولی لگی تھی؟"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں سر اگر ایسی بات ہوتی تو میں ان سے ملاقات کی بات بتاتا؟"

"ٹھیک ہے جاؤ۔"

اس کے بعد ہوا کی سائیں سائیں اور موٹر گاڑیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

آصفہ نے ٹیپ ریکارڈ بند کر دیا پھر بولی۔ "اب بولو؟"

"یہ...... یہ تو میں اس کا امتحان لے رہا تھا۔"

انکل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اشفاق نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیوں چیف میں غلط کہہ رہا ہوں۔"

"چیف؟" صادقہ نے کہا۔ "کیا تم انھیں چیف مان چکے ہو؟"

"مان نہیں، جان چکا ہوں کہ شیر خان یہی ہیں۔"

"کیسے جانا؟"

"کئی دن تک اس الجھن میں رہا کہ سچائی کیسے جانوں اور میں نے عثمانی سے ایسے بہت سے سوال کیے جن کا سرا کسی نہ کسی پرانے واقعے سے ملتا تھا۔ مجھے ہر سوال کا صحیح جواب ملا۔"

"یہ سب میری بے وقوفی کا پھل ہے۔"

"میں خاموش نہیں بیٹھا۔ سچ کی تلاش میں لگا رہا۔ تبھی مجھے پرسنل روم کا خیال آیا۔ مجھے کئی سال پہلے کا ایک جملہ یاد آ گیا تھا جو ایک بار آپ نے اپنی تقریر میں کہا تھا اسی جملے نے میری رہنمائی کی اور میں جان پر کھیل کر اس کمرے میں داخل ہو گیا۔" اس وقت اشفاق کی

آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو شکاری کا خاصہ ہے۔ چوہے کو دوڑا دوڑا کر تھکا مارتے وقت ویسی ہی چمک بلی کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ چہرے پر عیاری کا طمع تھا۔ اس نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

"وہاں مجھے ایک ڈائری بھی نظر آئی ہے۔ اس ڈائری میں وہ تمام باتیں تشریح کے ساتھ لکھی ہیں کہ اس نے کب اور کیسے آپ کو بے وقوف بنایا۔ آپ پر کیا کیا ستم ڈھائے۔"

"وہ ڈائری کہاں ہے؟"

"اسے ہٹا کر اپنی موت کو دعوت دیتا۔ وہیں چھوڑ آیا ہوں۔"

"بے وقوف! اسے لے کر آنا چاہیے تھا۔" کمال نے جھڑکا۔

"اس ڈائری کو حاصل کرنا ضروری ہے۔" آصفہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

"آپ منصوبہ بتائیں مدد میں دوں گا۔" اشفاق بولا۔

آصفہ کچھ دیر تک سر جھکائے سوچتی رہی پھر چٹکی بجا کر بولی۔ "خاکہ بن رہا ہے۔ شاید بتاتے بتاتے پورا منصوبہ تیار ہو جائے۔ دراصل کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے جسے مسئلہ کہا جائے یعنی جس کا حل نہ ہو۔"

"مطلب؟"

"پہلے ایک سوال اشفاق سے، کمیٹی کی میٹنگ کا کیا سسٹم ہے اشفاق!"

"ہر مہینے کی پچیس تاریخ کو میٹنگ ہوتی ہے۔"

"آج دس تاریخ ہے۔ ہم پندرہ دن انتظار نہیں کر سکتے۔ ایمرجنسی میٹنگ بھی تو ہوتی ہوگی۔"

"ایسی میٹنگ صرف شیر خان بلا سکتا ہے۔"

"مان لو ہیڈ کوارٹر میں عجیب عجیب سی واردات ہونے لگے تب؟"

"مثلاً؟"

"بالکونی میں رکھی کرسی اچانک ہال میں جا گرے، پانی سے بھرا غبارہ اچانک گارڈ کے چہرے پر کہیں سے آ کر گرے کسی اندھیرے گوشے سے گزرتے ہوئے گارڈ کو گھونسا لگے۔ اور مارنے والا نظر نہ آئے۔ کبھی کسی حصے کی لائٹ گل ہو جائے کبھی کسی حصے کی اور پھر اچانک کسی کونے میں کسی پیادے کی لاش ملے تب؟"

"اس طرح تو ہیڈ کوارٹر میں زلزلہ آ جائے گا۔" اشفاق مسکرا اٹھا مگر اس کی مسکراہٹ

میں طنز بھی تھا۔

"میٹنگ کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں بچے گا۔" انکل بڑبڑائے۔

"ہمیں اندر پہنچا سکو گے اشفاق!" آصفہ نے پوچھا۔

"اکیلا میں؟" اشفاق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"کام اتنا مشکل بھی نہیں ہے جتنا نظر آ رہا ہے۔ صرف ایک بار پہرے داروں کو بوکھلا دینا ہے۔ یہ اتنا مشکل بھی نہیں ہے۔ انھیں مزید بوکھلا دینے کے لئے انکل کا ایک پرچہ کافی ہوگا۔ اس پرچے میں لکھا ہوگا کہ میں ہیڈ کوارٹر میں داخل ہو چکا ہوں۔ یہ جملہ پڑھتے ہی عثمانی کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔"

"یقیناً وہ گھبرا کر میٹنگ بلا لے گا۔" اشفاق نے کہا۔

"میٹنگ کی اطلاع ہمیں فون پر دے دینا۔ ہم صحیح وقت پر چائنیز ہوٹل میں پہنچ جائیں گے۔ جیسے ہی میٹنگ شروع ہوگی تم ٹوائلٹ کے بہانے سے اٹھو گے۔ سیدھے پرسنل راستے سے متعلقہ ٹی وی کے سامنے بیٹھے گارڈ کے پاس پہنچو گے اور اسے وہاں سے ہٹا کر کسی دوسری جگہ بھیجو گے۔"

"کوئی وقت نہیں۔"

"اسی راستے سے باہر آ کر ہمیں اندر لے جاؤ گے۔"

"ٹھیک ہے۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔" اشفاق کھڑا ہو گیا۔

اس کے باہر جاتے ہی شگفتہ نے پوچھا۔ بگ یعنی ڈکٹافون اس کے کوٹ میں لگایا کہ نہیں "ہاں لگا دیا ہے مگر کوٹ میں نہیں اس کے پینٹ کی پچھلی جیب میں لگایا ہے۔ آؤ سیٹ پر سنتے ہیں۔" آصفہ نے دوسرے کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

اس کمرے میں ایک چھوٹا سا ریسیونگ سیٹ تھا۔ اسے آن کر کے وہ سب بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک تو گاڑیوں کا شور سنائی دیا پھر اشفاق کے سلام کرنے کی آواز سنائی دی۔ انکل کو کچھ یاد آ گیا تھا۔ وہ اٹھ کر باہر نکل گئے۔ ہم سب انھیں جاتے دیکھ کر بھی کچھ نہ بولے۔ پوری توجہ سیٹ پر لگی ہوئی تھی۔ تبھی کچھ دیر پہلے کی آواز سنائی دی۔ وہی باتیں جو وہ کر چکے تھے۔

"لگتا ہے بد بخت سب کچھ ٹیپ کر کے لے گیا ہے۔" صادقہ بڑبڑائی۔

"ٹھیک ہے اب مجھے اجازت دیجئے۔" کی آواز کے ساتھ چٹ کی آواز سنائی دی۔

شاید ٹیپ کا بٹن دبا تھا۔ پھر اشفاق کی آواز سنائی دی۔ ''اب تو آپ کو یقین آیا کہ وہ ہمارے جال میں پھنس چکے ہیں؟''

''مجھے یقین نہیں آرہا ہے اشفاق کہ وہ اتنی آسانی سے ہمارے جال میں پھنس رہے ہیں۔'' عثمانی کی آواز سنائی دی۔ ''لیکن وہ اتنے معصوم تو نہیں ہیں؟''

''میرا بھی یہی خیال ہے کہ ان کا منصوبہ کچھ اور ہے۔''

''خیر جو ہوگا دیکھا جائے گا کل یا پرسوں انھیں اطلاع دے دو کہ میٹنگ ہے۔''

''ان کا ایک منصوبہ افراتفری پھیلانا بھی تو ہے۔''

''اسے بھول جاؤ۔ میں خود ہی سب کو بلالوں گا۔''

''میٹنگ بلانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔''

''ہے' سہیل کے پاس ہر ممبر کا فون نمبر ہے۔ وہ کسی بھی ممبر کو فون کر کے پوچھ سکتا ہے۔ آواز بدلنے والی بھی تو اس کے ساتھ ہے۔ وہ کسی بھی ٹیکنک سے معلوم کرلے گی۔''

''او کے' جیسا آپ مناسب سمجھیں۔'' اشفاق کی آواز سنائی دی۔

میں نے آگے بڑھ کر ریسیونگ سیٹ بند کر دیا پھر پوچھا۔ ''اب کیا ارادہ ہے؟''

''ہم ہر حال میں وہاں جائیں گے۔'' آصفہ نے حتمی لہجے میں کہا۔

ہم نے جتنا مشکل سمجھا تھا ہوٹل سے میٹنگ ہال میں داخل ہونا اتنا ہی آسان ثابت ہوا۔ اشفاق کے ذریعے میٹنگ کی اطلاع ملتے ہی ہم نے تیاری شروع کر دی تھی۔ اور یہاں پوری تیاری سے پہنچے تھے۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمیں پھانسنے کے لئے رکاوٹیں ہٹائی گئی ہیں؟'' شگفتہ نے خیال ظاہر کیا۔ ''میرے منصوبے میں یہی بات شامل ہے۔'' آصفہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ہم سب گلیارے میں بڑھتے جارہے تھے۔ ہمارے ہاتھوں میں ماؤزر تھے۔ آنکھوں میں چیتے کی سی چوبندی تھی۔ ہم ہر طرح سے ہوشیار تھے۔ مگر ساری ہوشیاری دھری رہ گئی۔ کچھ آگے بڑھتے ہی راستہ خود بہ خود بند ہوگیا' ہم سب گلیارے میں ہی مقید ہوگئے تھے۔ تبھی آواز گونجی۔ ''خوش آمدید میرے دشمنو!'' اور پھر گلیارہ سفید دھوے سے بھرتا چلا گیا۔ پہلے شگفتہ گری پھر صادقہ! یکے بعد دیگرے سب گرتے چلے گئے۔

جب مجھے ہوش آیا تو ہم ہول میں پڑے تھے۔ ہمارے چاروں جانب لوگ کھڑے

تھے۔ ان کے چہرے ڈھکے ہوئے تھے۔ اسی وقت ایک نے بلند آواز میں پوچھا۔

''یہ کون ہے شیر خان!''

''اس تنظیم کے دشمن۔'' عثمانی نے جواب دیا۔ میں نے اسے آواز سے پہچانا تھا۔

''تو انھیں یہاں کیوں لایا گیا؟''

''تم ہوش میں تو ہو مسٹر تھری! کس لہجے میں مجھ سے بات کر رہے ہو؟''

مسٹر تھری جس کے سیاہ لبادے پر تین لکھا تھا اسی لہجے میں بولا۔ ''اکڑ مت کھاؤ' صاف صاف بتاؤ' انھیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟''

''گارڈ! اس گستاخ کو پکڑلو۔'' عثمانی بولا۔

''خبردار! یہ کمیٹی کا حکم ہے۔ جب تک مشترکہ حکم نہ ہو کوئی بھی گارڈ آگے نہیں بڑھے گا۔'' ایک ساتھ کئی آوازیں سنائی دیں۔

''یہ...... یہ سب کیا ہو رہا ہے اشفاق؟'' عثمانی کی آواز سنائی دی۔

''پتا نہیں پاپا کی آواز اتنی پھنسی پھنسی کیوں ہے۔'' شگفتہ کی سرگوشی سنائی دی۔

''خاموشی سے پڑے رہو۔'' میں نے دھیرے سے ڈانٹا اور پھر ان کی جانب متوجہ ہوگیا۔ اشفاق کہہ رہا تھا۔ ''سب جان چکے ہیں مسٹر عثمانی کہ تم شیر خان نہیں ہو۔''

''یہ...... بکواس ہے میں ہی شیر خان ہوں۔''

ایک شخص نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''مسٹر عثمانی! تنظیم جس وقت بنی تھی تو باس نے کہا تھا کہ اس مخصوص کمرے کی تلاشی باس کے مرنے کے بعد لی جائے۔ وہاں ایسی شہادت موجود ہوگی جو بتائے گی کہ شیر خان کی اصل شکل کون سی تھی۔ نیا باس پرانے باس کی جگہ ہر سال اپنی ایک تصویر لگائے گا تاکہ کسی ممبر کے دل میں بے ایمانی آجائے تو وہ ثابت کر سکے۔ اس البم میں بھی شیر خان کی سات تصویریں ہیں۔ سات سال کی سات تصویریں۔ کیا تم اپنی شکل سے تصویروں موازنہ کرو گے؟''

''یہ...... یہ البم تمھیں کہاں سے ملا؟'' عثمانی کی آواز میں لرزہ تھا۔

''مجھ سے سنو! اشفاق نے کہا۔'' آصفہ کی تاویلوں نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے تمھیں آزمانے کے لئے جھوٹا پولیس مقابلے کا قصہ سنایا اور تم نے یقین کر لیا جبکہ شیر خان جب باہر جاتا ہے تو اکیلا جاتا ہے۔ ہم جیسے معمولی ممبر کو ساتھ کیوں لے جائے گا۔'' اس نے رک

کر قہقہہ لگایا پھر بولا۔ ''میں سب کچھ سمجھ چکا تھا پھر بھی خاموش رہا۔ صرف اس لئے کہ اگر زبان کھول دیتا تو زندہ نہ بچتا۔ عقل مندی کا تقاضا تھا کہ تم سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا رہوں اور یقین دلاتا رہوں کہ میں اب بھی تمہیں شیر خان سمجھ رہا ہوں۔ اسی دوران میں نے کمیٹی کی خفیہ میٹنگ بلائی اور اس کے سامنے حقیقت رکھی۔ تمام ممبران مخمصے میں پڑ گئے۔ کوئی بھی میری بات پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ تب میں نے سب کو اعتماد میں لے کر راحت والا ڈراما کھیلا۔ تاکہ خفیہ سیف سے البم نکال سکوں۔ اس کی خبر تو سب کو تھی کہ اصلی شیر خان کی تصویر محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ ہم دیکھنا چاہتے تھے کہ تصویر کا راز تمہیں معلوم ہے بھی یا نہیں۔ تمہیں سن کر حیرت ہوگی کہ شیر خان نے کبھی کسی فوٹو گرافر کا قتل نہیں کیا۔ خود کو الزام سے بچانے کے لئے تم نے اپنے ہاتھوں پھانسی کا پھندا پہن لیا یعنی البم مجھے سونپ دیا۔'' اس نے رک کر سب کے چہرے کا جائزہ لیا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''البم دیکھ کر سب کو یقین آ گیا۔ حالانکہ تمہیں البم کو ضائع کر دینا چاہئے تھا یا پھر البم کی تصویر بدل دینی چاہیے تھی لیکن اگر انسان غلطی نہ کرے تو انسان نہ رہے کچھ اور بن جائے۔ تم نے البم دے کر اپنی حقیقت بتا دی تو میں نے پھر میٹنگ بلوائی اور آج کے ڈرامے کو اسٹیج کیا۔''

''کیا...... کیا یہ سب قیدی نہیں ہیں؟'' عثمانی بڑبڑایا۔

''لو ثبوت حاضر ہے۔'' انکل نے کھڑے ہو کر انگڑائی لی۔ ''لو دیکھو ہم آزاد ہیں۔'' پھر ہماری جانب مڑ کر بولے۔ ''عثمانی تو ہماری حقیقت جان ہی گیا' آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ اب یہاں جو کچھ ہوگا میرے حکم سے ہوگا۔''

''ہم نے تو آپ کو کھویا ہوا عہدہ دلا کر اپنا وعدہ پورا کر دیا' اب آپ بھی اپنا وعدہ پورا کریں۔'' آصفہ نے کہا۔

''کون سا وعدہ؟''

''اپنے ماں باپ کے قتل کا بدلہ مجھے انہی ہاتھوں سے لینا ہے۔'' آصفہ نے دانت پیس کر کہا۔ اس کا چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا اور انتقام کی پکار کرتی خون میں سنی نگاہیں عثمانی پر ٹکی ہوئی تھیں۔ دونوں پنجوں کو کھولتی بند کرتی وہ عثمانی کی طرف بڑھی۔

''ہمارے درمیان کوئی نہیں آئے گا۔ آج میں اس سے اپنے ماں باپ کے قتل کا بدلہ لوں گی۔''

''سمجھنے کی کوشش کرو بیٹی...... شگفتہ تم اسے سمجھاؤ۔'' عثمانی گڑگڑایا۔

''تمہاری اصلیت جان گئی ہوں عثمانی تم میرے باپ نہیں ہو۔'' شگفتہ دھاڑی۔

''اس کا مطلب ہے اس سہیل کے بچے نے تمہیں کوئی الٹی سیدھی کہانی سنائی ہے۔ اس نے اب تک وہ بات نہیں بتائی ہے۔ جسے بتانا چاہیے۔'' وہ پیچھے ہٹتا ہوا بولا۔

''ایسی کون سی بات تھی ذرا میں بھی سنوں۔'' میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

عثمانی پیچھے ہٹتا جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کی پرتیں جمی تھیں اور سہیل انکل مسکرا رہے تھے جیسے وہ اس کی چال سمجھ گئے ہوں۔

رابیل اپنی روداد سنا ہی رہا تھا کہ گاڑی آہستہ ہونے لگی۔ شاید کوئی اسٹیشن آ رہا تھا۔

رابیل بھی رک گیا تھا اور کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔

شام کی لالی نمودار ہو گئی تھی، ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چہرے سے ٹکرا رہے تھے۔ ہرے ہرے کھیتوں کی ہریالی آنکھوں کو بھلی لگ رہی تھی۔

گاڑی جنکشن سے روانہ ہو کر ستی اسٹیشن ہوتے ہوئے بختیار پور کے اسٹیشن پہنچی، یہاں بڑے بڑے باغات دور سے ہی نظر آتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے مکانات، ہنستے کھیلتے بچے، خالہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ کب سے ان مناظر کو دیکھنے کے لیے ترس رہی تھیں۔

''ارے لڑکیو! جانتی ہو یہ اسٹیشن بختیار خلجی کے نام پر ہے۔ یہاں سے ایک لائن بہار شریف جاتی ہے جہاں مخدوم شاہ محو خواب ہیں۔ اس کے آگے نالندہ ہے جہاں سمراٹ اشوک کے وقت میں ایک یونیورسٹی بنائی گئی تھی۔ حضرت عیسیٰ کی آمد سے بھی بہت پہلے۔ جو کھدائی کے بعد مسلم نکل آئی ہے۔ وہاں کئی سو طالب علم تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہاں کے کھویا بھرے لڈو بڑے مشہور ہیں۔'' کہہ کر انہوں نے ایک خوانچہ والے کو آواز دی۔ وہ لڈو بیچ رہا تھا۔ خالہ نے پچاس روپے کے لڈو لے لیے۔ خود بھی کھایا مجھے بھی کھلایا۔ باقی لوگوں کو کیسا لگا مجھے نہیں معلوم مگر مجھے تو اچھا نہیں لگا۔ کیول اسٹیشن جب آیا تو میں نے چائے والے کو اشارے سے بلایا اور سب کے لیے چائے لی۔

''اماں یہ کیول کیا ہے؟'' سلمیٰ نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! یہ مسلمان زمینداروں کی آبادی ہے۔ یہاں سے جو ندی گزرتی ہے اس کا نام کیول ہے۔''

تب زلیخا کی لڑکی کھسک کر خالہ کے قریب آ گئی اور بولی۔ ''خالہ جی! آپ ہندوستان کے بارے میں اتنا کچھ جانتی ہیں۔ مجھے تو بڑی حیرت ہو رہی ہے۔''

کلثوم حیرانی سے آنکھیں بڑی کرتے ہوئے بولی۔ ''میں تو اب غور سے سنوں گی۔ میری معلومات میں بھی اضافہ ہوگا۔''

خالہ خوش ہو گئیں ''کیوں نہیں بچیو! غور سے سنو میری تو ایک ایک سانس اس مٹی کی خوشبو میں بسی ہوئی ہے۔'' پھر جیسے جیسے گاڑی آگے بڑھتی گئی وہ انہیں علاقے کے بارے میں بتاتی رہیں۔

اب شام گہری ہو گئی تھی۔ سبھی کو بھوک ستانے لگی تھی۔ تب زلیخا نے کہا۔ ''جمال پور آنے ہی والا ہے وہاں سے کچھ کھانے کو لے لیں گے لیکن میری توجہ اس کی جانب نہ تھی۔ میں تو کچے پکے مکانوں، کھیتوں، کھلیانوں پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ ریلوے لائن کے کنارے کنارے رنگ برنگی ساڑھیاں باندھے، سروں پر کنڈوں کی ٹوکریاں رکھے عورتیں جاتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ لڑکے بالے کھیتوں میں دوڑتے بھاگتے نظر آ رہے تھے۔

دور سے جمال پور کا اسٹیشن قریب آتا ہوا دکھائی دیا اور میں نے بیگ سے پیسے نکالے تو زلیخا نے شرمندگی سے کہا۔ ''اب کی مرتبہ اگر تم نے کچھ لیا تو میں نہ کھاؤں گی۔ تم تو میرے مہمان ہو بجائے اس کے کہ میں تمہیں کھلاؤں خود تم ہمیں کھلا رہے ہو۔''

کلثوم ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگی تب خالہ نے نہایت محبت سے زلیخا کا ہاتھ پکڑا اور رندھے گلے سے بولیں۔ ''بہن! تمہیں میری ذہنی حالت کا اندازہ نہیں ہے۔ میں زندگی کے کتنے لمبے عرصے تک تم جیسے پرخلوص لوگوں کے لیے کتنا روئی ہوں۔'' خالہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا مینہ برسنے لگا تھا۔

انہیں روتا دیکھ زلیخا نے ان کے ہاتھوں کو تھپتھپا کر کہا۔ ''اب میں کچھ نہ بولوں گی جیسا کہو گی ویسا ہی کروں گی۔''

جمال پور آتے ہی میں نے باہر جھانک کر دیکھا۔ خوانچے سروں پر رکھے خوانچہ فروش آوازیں لگا رہے تھے۔ آلو پوری لو، کچوری لو، کھیرے، ککڑی لو، بڑے بڑے پراٹھے، آلو کے کباب، چائے، شربت اور نہ جانے کیا کیا بک رہا تھا۔ میں نے ایک پتیلی والے کو آواز دی، وہ بھاگتا ہوا آیا۔

''کیا بیچتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''مرچ چاول۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے اس سے خوب سارے پیلی رنگت اور ہرے کٹے ہوئے مرچوں والے چاول خریدے۔ آم کا اچار، کھیرے کی سلاد اور دہی کی کٹوری لے کر میں نے اس کی جانب پچاس کا نوٹ بڑھا دیا۔ نوٹ دیکھ کر وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''اتنا بڑا نوٹ! کھلے کہاں سے لاؤں؟''

''چاول کتنے کے ہوئے؟'' میں نے پوچھا۔

''پورے چودہ روپے جی!''

مجھ سے زیادہ سلمیٰ کو حیرت ہو رہی تھی۔ کراچی میں اتنے چاول کی قیمت سو روپے سے کم نہ ہوتی۔ میں نے خوش ہو کر کہا۔ ''باقی پیسے تم رکھ لو۔''

چاول والے نے کہا۔ ''بہوا تو یہاں کے لگت نئی ہو۔ کہاں سے آت رہے ہو؟''

خالہ ہنس کر بولیں۔ ''میں یہیں کی ہوں پر اب پاکستان میں رہتی ہوں۔''

اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا۔ سیٹی کی آواز گونجی اور ٹرین چھک چھک کرتی آگے بڑھنے لگی۔ ہم سب مل کر خوب مزے لے لے کر چاول کھانے لگے۔ تبھی جواد نے رونا شروع کر دیا۔

''اے بہو! اسے دودھ پلاؤ۔ بھوکا لگتا ہے۔'' خالہ نے حکم نامہ جاری کیا۔

سلمیٰ ان کی آڑ لے کر بچے کو دودھ پلانے لگی۔ دودھ پلاتے ہوئے اس نے کہا۔

''جمال پور کیا یہاں صرف مسلمان رہتے ہیں۔''

''یہاں بڑی مشہور درگاہ ہے، ہر سال یہاں بہت بڑا میلہ لگتا ہے۔ دور دور سے لوگ یہاں مرادیں مانگنے آتے ہیں اور جھولیاں بھر کے جاتے ہیں۔ ایسے بزرگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ جس سے بیعت لی اس کے خاندان پر اپنی نوازشوں کی بارش کر دی۔ اگر کسی نے بیعت لے کر بھی برا کام کیا تو بس جانو اس کی خیر نہیں۔ پریشانیاں اور مصیبتیں اس کا مقدر بن جاتی ہیں۔'' زلیخا نے کہا۔

ہمیں کیا پتا تھا کہ بیعت کیے بغیر ہم مصیبت کو دعوت دے رہے ہیں۔ انسان تو ازل سے بے پرواہ ہوا ہے۔ اگر اسے غیب کا علم ہوتا تو وہ فرشتوں کی قطار میں نہ آ جاتا۔ خالہ ہر جانب سے بے خبر اپنی دھن میں بولے جا رہی تھیں:

''یہاں ریلوے کا کارخانہ ہے۔ یہاں سے اتر کر منگھیر جایا جاتا ہے۔ یہ وہی شہر ہے

جہاں سراج الدولہ سے تخت چھین کر انگریزوں کی غلامی اختیار کرنے والے میر جعفر کے بھتیجے میر قاسم نے قلعہ بنایا تھا۔ اسلحہ سازی کا کارخانہ کھولا تھا۔ یہیں سے اس نے انگریزوں کے خلاف جنگ لڑی تھی۔"

ٹرین اپنی رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ ہم لوگ کھا پی کر بیٹھ گئے تھے۔ اب رات ہو چکی تھی تقریباً نو بجے کے قریب دور سے سلطان گنج کا اسٹیشن نظر آیا۔ گاڑی اچانک جھٹکے سے رک گئی۔ سلطان گنج کا اسٹیشن آ گیا تھا۔

"یہاں ہندوؤں کا مشہور مندر ہے۔ ہر سال ساون میں یہاں میلہ لگتا ہے۔ دور دور سے ہندو آتے ہیں۔ یہاں کی گنگا ندی سے پانی بھر کر دیوگھر کے مندر لے جاتے ہیں۔" خالہ نے بتایا۔

گاڑی پھر چل پڑی۔ پہلے اکبر پور پھر ناتھ نگر پھر بھاگل پور کا اسٹیشن آیا۔

اسٹیشن کافی بڑا تھا۔ یقیناً یہاں ٹرین کافی دیر رکتی پھر بھی سب جلدی میں تھے، ہر کوئی جلدی جلدی سامان اتار رہا تھا۔ بچوں کے رونے کی آوازیں تیز ہو گئیں، قلی دوڑتے پھر رہے تھے۔ میں سب کے ساتھ اسٹیشن پر اتر آیا۔ میرے ساتھ ہی زلیخا کلثوم اور انعم بھی اتر آئیں۔ زلیخا نے مجھ سے پوچھا۔ "آپ کے گھر سے کوئی آیا نہیں؟"

خالہ چاروں طرف نظریں گھما گھما کر اپنے رشتے داروں کو ڈھونڈنے لگیں، اطلاع تو سب کو دے دی تھی۔ شاید گاڑی کے لیٹ آنے کی وجہ سے مایوس ہو کر گھر چلے گئے ہوں، میں یہی سوچ رہا تھا۔ مایوسی مجھ پر غالب آنے لگی تب دور سے آواز سنائی دی۔ "ارے فوزیہ! تو ہے۔"

سفید ململ کے کرتے اور علیگڑھ پاجامے میں ایک صاحب دیوانہ وار ہماری طرف بڑھ رہے تھے، اب جو میں نے نظر دوڑائی تو عورتوں اور بچوں کا ہجوم ان کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ میں "گنگ" سا اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ رابیل نے کہا "محبت کا یہ عالم۔ پورا خاندان استقبال کے لیے آ گیا ہے۔"

"یہ ماموں میاں ہیں۔" خالہ نے بتایا۔

ضعیف اور کمزور، کھچڑی بال، جھکی کمر اور ہاتھ میں لاٹھی لیے جھکے جھکے بڑھے آ رہے تھے، خالہ لپک کر ان کے پاس پہنچ گئیں۔

"ماموں میاں!" خالہ ان کے سینے سے لپٹ کر بلک پڑیں ان کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

تب زلیخا پاس آئی اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ "ارے اب کس بات کا رونا۔

اب تو اپنے مل گئے ہیں خوب خوش ہو خوب جشن مناؤ۔" اور پھر ماموں میاں کو اپنا پتا سمجھا کر بولی۔ "بھائی صاحب ان کو ضرور میرے گھر لائیے گا۔ ہم لوگ "لگائیں" میں رہتے ہیں۔ جگدیش پور سے راستہ مڑتا ہے!" اور چلتے چلتے ہنس کر بولی۔ "بھئی تمہارا ساتھ بڑا یادگار رہا۔ میرے گھر ضرور آنا۔ بچیاں تمہارا انتظار کریں گی۔"

خالہ نے آنسو بھری نظروں سے زلیخا کی طرف دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولیں! "میں تمہارے گھر ضرور آؤں گی۔" اور پھر کلثوم اور انعم کے سروں پر ہاتھ پھیرا۔ وہ سب خدا حافظ کہہ کر جدا ہو گئیں تب ماموں میاں نے خاندان کے سارے لوگوں کو آوازیں دیں۔ سب شرماتے، خوش ہوتے قریب آ گئے خالہ تو ان میں سے کئی کو جانتی بھی نہ تھیں۔

خالہ کے رشتے کا بھائی آگے بڑھا اور بولا۔ "چلو آپا! گھر چلیں۔"

باہر چار تانگے موجود تھے۔ ہم سب اس میں ٹھونس ٹھانس کر سیور کی طرف روانہ ہو گئے۔

سڑک پکی تھی۔ آہستہ آہستہ شہر پیچھے چھوٹتا جا رہا تھا۔ تانگہ جب ایک چھوٹی سی چورنگی پر پہنچا تو ماموں نے خالہ سے کہا "رفو تجھے یاد ہے نا۔ یہ تلکا مانجھی چوک ہے جہاں تو آنے کے لیے ضد کرتی تھی۔"

نوجوان لڑکے، لڑکیاں گھومتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ خالہ نے پرجوش لہجے میں کہا "جی ماموں مجھے یاد ہے۔ یہیں پر انگریزوں نے غدر یعنی پہلی جنگ آزادی میں سنتھالی نوجوان تلکا مانجھی کی سمادھی ہے۔ وہ جنگل سے اپنے قبیلے کے ساتھ باہر آیا تھا اور انگریزوں پر ٹوٹ پڑا تھا۔"

"ارے واہ رفو!" ماموں نے تعریفی نظروں سے خالہ کو دیکھا "تجھے تو سب یاد ہے۔"

"اور کیا۔" خالہ نے چہک کر کہا "میں بھلے ہی پاکستان میں تھی مگر میرا دل یہاں تھا۔ ہر پل ہر وقت میری نظروں میں اپنا وطن ہوتا تھا۔"

"مگر رفو پھپھو آپ کا وطن تو اب پاکستان ہے۔ وہاں جہاں مسلمانوں کی عزت ہے۔ مسلمانوں پر کوئی پابندی نہیں۔" ایک نوجوان نے خالہ سے کہا۔

"اے بیٹا وہ بھی کوئی ملک ہے جہاں مہنگائی لوٹ کھسوٹ، مار دھاڑ کے سوا کچھ نہیں۔" خالہ منہ بنا کر بولیں۔

"کچھ بھی ہو خالہ آپ لوگ عزت سے زندگی تو گزار رہی ہیں۔ نماز روزہ، تیج تہوار

سب آزادی سے منا تو لیتیں ہیں۔ایک ہم ہیں جو بقر عید آئی نہیں کہ دل میں ڈرا ترنے لگا کہ اب ہندو مسلم فساد ہوا کہ اب ہوا۔"

"بیٹا دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔تم کیا جانو وہاں ہم کس قدر کرب میں ہیں کہ بزرگوں کی قبر پر فاتحہ تک پڑھ نہیں سکتے۔"

خالہ کی منفی باتیں سن کر میرا دل خراب ہو رہا تھا کہ عورتوں نے باتوں کا رخ بدل دیا، وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔"رفو! تجھے اس پگڈنڈی پر بھاگنا کیسا پسند تھا۔"

"ہاں بھابی مجھے یاد آ گیا۔تمہارے دولہا بھائی نے بھی تو پہلی مرتبہ اسی پگڈنڈی پر مجھے دیکھا تھا۔"انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اوں!" سلمٰی شرارت سے بولی۔"اور اسی وقت خالو نے آپ کو پسند کر لیا ہوگا۔"

پورا تانگہ زعفران بن گیا۔خالہ بھی مسکرا دیں۔شاید وہ بہت خوشی محسوس کر رہی تھیں۔

جب حویلی پہنچے تو لگا جیسے وقت ٹھہر گیا ہو۔کچی پکی راہداری سے گزرتے ہوئے ہم سب بڑے دالان میں پہنچے۔

خالہ "اماں" کہہ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔شاید انہیں اپنی ماں کی یاد آ گئی تھی تبھی ایک کانپتا ہوا ہاتھ ان کے سر پر آ کر ٹھہر گیا۔انہوں نے چونک کر سر اٹھایا۔ایک بڑی بی کھڑی تھیں جو کافی ضعیف ہو چکی تھیں۔خالہ نے اس عظمت کے مینار کو دیکھا اور بلبلا کر ان سے لپٹ گئیں۔

"بڑی امی! تم مجھے بھلا بیٹھیں؟ لیکن میں تم سے ملنے کے لیے دیکھو سمندر پار کر کے آن پہنچی!"

وہ ان سے لپٹ کر اور بھینچ بھینچ کر ان کی موجودگی کا احساس کر رہی تھیں۔خاندان کی بہت سی لڑکیاں سلمٰی کو لے کر ایک طرف چلی گئی تھیں۔بڑی امی آنکھیں پونچھتے ہوئے بولیں۔

"جاؤ اس کمرے میں تمہارا بھیا مجو لیٹا ہے مل لو!"

خالہ لپکتی ہوئی مجو بھیا کے کمرے میں پہنچی۔ان کو دیکھ کر خالہ نے دل تھام لیا جیسے کلیجا منہ کو آ گیا ہو۔وہ زندہ ضرور تھے پر مردوں سے بدتر۔قوت گویائی بھی چھن گئی تھی۔

"ان کے بچے؟" خالہ نے پوچھا۔

"اس کے بچے ندیم، کلیم جوان ہو چکے ہیں" بڑی بی نے کہا۔

کچھ دیر بعد میں نے ان کی بیٹیوں کو بھی دیکھ لیا۔ان کی دو بیٹیاں تھیں کہکشاں اور انجم۔دونوں ماشاءاللہ چودھویں کا چاند تھیں۔سچ پوچھیں تو میں نے آج تک اتنی حسین، خوش شکل

اور خوش اخلاق لڑکیاں نہیں دیکھی تھیں۔

"اب یہ بتاؤ کون کیا کر رہا ہے۔" خالہ نے پوچھا۔

"چھوٹے چچا کے پوتے، پوتیاں ماشاءاللہ جوان ہیں۔مجو چچا کا ایک بیٹا سعودی عرب میں ہے۔احمد، وقاص، نعیم یہیں کاروبار کر رہے ہیں۔احمد کی بازار میں دکان ہے۔وقاص اور نعیم

اس کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔بڑے چچا کا چمڑے کا کارخانہ ہے۔چھوٹے چچا لکڑی کی ٹال پر بیٹھتے ہیں۔" ایک نوجوان لڑکی نے بتایا۔ان سب کو باتیں کرتے دیکھ میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ ماموں میاں بولے "ارے بھئی لڑکوں کو ان کا کمرا دکھا دو۔آرام کریں گے۔"

ایک لڑکی نے آگے بڑھ کر کہا "آئیے بھائی جان' میں آپ کو کمرا دکھا دوں۔"

میں اور رابیل اس کے ساتھ چل پڑے۔چھوٹی سی سیڑھیوں کو پار کر کے ہم ایک کمرے میں پہنچے۔اس کمرے میں بستر لگا ہوا تھا۔ہم جا کر اس پر ڈھے سے گئے۔

لیٹے لیٹے ہم نے کہا "رابیل تمہیں یہاں کیسا لگ رہا ہے۔"

"بہت زبردست' لوگ کتنے مخلص اور پیار کرنے والے ہیں۔ہمارے یہاں ایسے لوگ خواب ہو گئے ہیں۔"

"یہ تو ہے' خود تمہاری کہانی سے پتا چل رہا ہے کہ لوگ لالچ میں کتنا آگے بڑھ چکے ہیں۔ایسا کرو' کہانی کا بقیہ حصہ بھی سنا دو۔شاید سنتے سنتے نیند آ جائے۔"

اس نے قہقہہ لگایا پھر بولا "گویا میری کہانی نہیں لوری ہے.....اچھا سنو۔میں بتا رہا تھا کہ.....آصفہ آگے بڑھتے ہوئے غرائی۔"رابیل کے سوال کا جواب دے کتے۔"

عثمانی نے اپنے چہرے سے داڑھی مونچھیں اور سر سے وگ نوچ لی۔شیر خان کے میک اپ کے پیچھے چھپے چہرے کو دیکھتے ہی سب پر سکتہ سا چھا گیا۔آصفہ، صادقہ، شگفتہ، کمال ہی نہیں کمیٹی کے اراکین بھی حیرت زدہ رہ گئے تھے۔صرف انکل ہی ایک ایسے آدمی تھے جن کے چہرے پر حیرانی کا کوئی شائبہ نہیں تھا بلکہ وہ مسکرا رہے تھے۔

داڑھی مونچھوں اور بڑی سی تاریک شیشوں کی عینک کے پیچھے سے جو چہرہ ابھرا تھا وہ ایک نوجوان کا تھا۔اس کا قد کاٹھ عثمانی اتنا ضرور تھا مگر رنگ نسبتاً کھلتا ہوا تھا۔

"کون ہو تم؟" آصفہ نے پوچھا۔

"نورا!"

"کون نور۔"

"اسی مظلوم شخص کا بیٹا جسے تم لوگوں نے سولہ سال پہلے قتل کیا تھا۔"

سب کے لبوں پر خاموشی کی مہر لگی تھی نور بولتا رہا۔

"میری مرتی ہوئی ماں نے بتایا تھا کہ سہیل نے میرے مظلوم باپ کو پھنسانے کے لیے شاداں کے ماں باپ کا قتل کیا تھا۔ اسی دن سے میں اس کو تلاش کر رہا ہوں جب وہ ملا تو ایک نئے روپ میں۔ اس روپ میں قتل اور بھی آسان تھا۔ بس میں نے اپنا انتقام لے لیا۔ اپنی سمجھ کے مطابق اسے ختم کر کے اس کی جگہ پر شیر خان بن بیٹھا۔"

"عثمانی کہاں ہے؟"

"میری قید میں۔"

"جیل سے نکل کر وہ تمہاری قید میں کیسے پھنس گیا؟"

"میں بتاتا ہوں میرے بچو۔" سہیل انکل نے بڑھ کر کہا۔ "اس کے آگے کی کہانی میں بتاتا ہوں کیونکہ نور کی الجھی ہوئی کہانی تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔"

ہم سب انکل کی جانب مڑ کر دیکھنے لگے۔

انکل نے یکا یک مڑ کر گارڈز سے کہا۔ "امید ہے کہ سبھی گارڈز سمجھ گئے ہوں کہ نقلی شیر خان کے ساتھ ان پر بھی نظر رکھنی ہے اگر کوئی بھی غیر ضروری حرکت کرے تو فوراً شوٹ کر دینا۔"

"میں تجھے کچا چبا جاؤں گی حرامزادے!" صادقہ دھاڑتے ہوئے آگے بڑھی۔

"رک جاؤ! تم اچھی طرح سن لو، اس چھت کے نیچے شیر خان سے اونچی آواز میں کوئی بھی بات نہیں کر سکتا۔"

میں نے حالات کی نزاکت کو بھانپ لیا تھا فوراً لپک کر اسے پکڑ لیا۔ "صادقہ قابو میں رہو۔"

"تم کچھ کہہ رہے تھے۔" آصفہ نے حالات کو نیا موڑ دینا چاہا۔

"ہاں میں وہ پیچ دار کہانی سنانے کی بات کر رہا تھا جسے تم نور سے سننا چاہتے تھے جسے میں نے جنم دیا اور جس میں صرف نور نہیں تم سب پھنسے ہوئے ہو۔" وہ کچھ دیر کے لیے رکا پھر سانس لے کر بولا۔ "نور اپنے باپ کا بدلہ لینے کے لیے مجھے تلاش کر رہا تھا۔ بدقسمتی سے اس نے مجھے پہچان لیا۔ سہیل آصف کے نام سے میں کچہری کے پیچھے ایک مکان میں رہتا تھا۔ ایک رات

اس نے مجھے وہیں گھیر لیا اس وقت میں ڈائری لکھ رہا تھا۔"

"کیسی ڈائری؟"

"اپنا روزنامچہ۔ نور کے ہاتھ میں پستول تھا۔ میں اسے پہچانتا نہ تھا جب اس نے اپنا تعارف کرایا تو مجھے اپنی جان سے زیادہ قیمتی ڈائری لگی۔ اس ڈائری کے ذریعے وہ بہت کچھ جان سکتا تھا۔ حالانکہ اپنی اس بری عادت سے میں خود پریشان تھا۔ پچیسیوں ڈائری لکھ کر جلا چکا تھا پھر بھی عادت نہ چھوٹی تھی۔ جب تک دن بھر کا احوال لکھ نہ لیتا چین نہ ملتا۔ اس دن بھی اپنی اس عادت کو دل ہی دل میں کوس رہا تھا۔ اسے چھپانے کے لیے دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ نفسیاتی عمل ہے کہ آپ جس چیز کو چھپانے کی کوشش کریں گے سامنے والا تجسس میں مبتلا ہو جائے گا۔ وہی ہوا۔ اس نے لپک کر ڈائری چھین لی۔ اس ڈائری میں اتنا کچھ تھا کہ اسے پڑھ کر کوئی بھی ایسا شخص جس کا قد کاٹھ میرے اتنا ہو وہ بہ آسانی شیر خان بن سکتا تھا۔ اسی نے مجھے جلایا اور مجھے مردہ سمجھ کر حب کے نزدیک پھینک دیا۔ مجھ سے نمٹ کر یہ عثمانی سے جا ٹکرایا۔ وہ بھی تو اس پرانے کھیل میں ایک کھلاڑی تھا۔ پھر اس نے شگفتہ کو ہیروئن کا عادی بنایا۔ اسی کی سازش سے عثمانی جیل پہنچا پھر اسی نے اسے باہر بھی نکالا۔"

"لیکن میں نے تو عثمانی انکل کو دیکھا تھا وہی شیر خان بنے تھے۔"

"صرف ایک دن کے لیے۔ اس دن کے بعد سے پھر کسی نے اسے نہیں دیکھا۔ خود میں بھی یہی سمجھا تھا کہ عثمانی ہی شیر خان بنا ہوا ہے پھر ایک سلسلہ سا چل پڑا وہ چال چلتا اور میں کاٹ دیتا۔ اسی دوران میں، میں نے ایک نئی چال سوچی اور اپنے پرانے البم سے عثمانی کی تصویر نکالی۔ میرے پاس شاداں کے امی ابو کی بھی تصویر تھی۔ ان دونوں تصویروں کی مکسنگ کرائی اور ایک نئی کہانی گھڑ کر تم لوگوں کو سنا دی۔"

"یعنی میری امی والی کہانی جھوٹی تھی؟" آصفہ نے پوچھا۔

"یقیناً۔"

"ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو۔"

"حالانکہ مجھے خوشی ہے کہ مقابلہ تم جیسے سمجھدار سے ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ دوستوں کے ساتھ میں بھی تمہارے جال میں پھنس گئی۔ ویسے مجھے اسی وقت شک ہو گیا تھا جب اشفاق

قیدی بنا ہوا ہمارے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔ اس نے جیسے ہی تمہاری کہانی کے بارے میں جاننا چاہا تم نے فوراً بات کاٹ دی تھی تاکہ وہ ان باتوں کی تصدیق نور سے نہ کر لے۔'' اس نے رک کر ایک بار سب کے چہرے پر نظر ڈالی پھر سہیل کی جانب مڑ کر بولی۔ ''دراصل تم نہیں چاہتے تھے کہ نور کو کسی طرح معلوم ہو جائے کہ تم ہمیں اس کے بارے میں بتا چکے ہو۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا تو تمہارا منصوبہ چوپٹ ہو جاتا اور ہم بھی تمہاری بے وقوفانہ چال میں نہ پھنستے۔''

''بے وقوفانہ چال؟''

''ہاں کیونکہ تم بہت بڑے بے وقوف ہو۔''

گارڈز کے چہروں پر تناؤ آ گیا۔ ان کی انگلیاں ٹریگرز پر جم گئیں۔ انہیں سہیل کے اشارے کا انتظار تھا۔ تبھی سہیل نے کہا۔ ''نہیں کوئی فائر نہیں کرے گا۔''

سب کی انگلیاں ڈھیلی پڑ گئیں۔

آصفہ کے ہونٹوں کی مسکان مزید گہری ہو گئی۔

''میں تمہاری قدر کرتا ہوں لڑکی کیونکہ تمہاری ہر بات کے پیچھے ٹھوس دلیل ہوتی ہے۔ بولو آصفہ تم نے میری چال کو بے وقوفانہ کیوں کہا ہے؟''

''تم نے سیدھا راستہ اختیار نہیں کیا۔ اگر ہمیں بتا دیتے کہ نور ہی شیر خان ہے تو ہمیں ساتھ ملانے کے لیے اتنا لمبا کھڑاک نہ کرنا پڑتا۔ ہم عثمانی انکل کا بدلہ لینے کے لیے تمہارے ساتھ ہو جاتے۔ اسی لیے بے وقوفانہ چال کہا ہے۔''

''تم...... میری بات سنو لڑکی۔ میں تمہیں وہ راز بتاتا ہوں جس کی وجہ سے اس نے اتنا بکھیڑا کھڑا کیا۔'' نور نے دخل دیا۔

''کیا مطلب؟'' آصفہ اس کی جانب مڑی۔

''یہ شخص......''

''فائر۔'' اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی سہیل چیخا۔

ہال میں کئی دھماکے گونجے اور نور کٹے ہوئے شہتیر کی طرح لڑھک گیا۔

''دوستو ابھی تو ایسے ایسے راز سے پردہ اٹھے گا کہ تمہاری عقل چکرا کر رہ جائے گی۔'' سہیل نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''اچھا!'' آصفہ نے بھی طنزیہ انداز میں کہا۔

''فی الحال تو چائے پیو۔'' پھر سہیل نے اشفاق کو اشارے سے کچھ سمجھایا وہ باہر نکل گیا۔

☆☆☆

''کیا ہم زندہ نہیں؟'' صادقہ کی آواز سنائی دی۔

''فکر نہ کرو اگر مر چکے ہیں تو بھی ساتھ ہیں۔'' کمال نے آوازا کسا۔

میں بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چاروں جانب نگاہیں موڑ کر دیکھا۔ نجمہ، آصفہ اور شگفتہ بھی موجود تھیں۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔

''قیدی بننا ہماری قسمت میں لکھ دیا گیا ہے۔'' نجمہ نے ٹکڑا لگایا۔ ''پہلے جیل میں تھے پھر سہیل کے گھر میں پھنسے اور اب یہاں۔ اس دس بائی دس کے کمرے میں۔''

''لگتا ہے چائے میں نشہ آور دوا تھی۔'' آصفہ نے کہا۔

''جی نہیں، پیار بھری لوری تھی جسے سنتے ہی ہم سب سو گئے۔ عقلمند کی دادی جان بغیر نشے کے ہم بے ہوش کیسے ہوئے؟'' صادقہ نے طنز کیا۔

''کہیں دونوں جھگڑ نہ پڑیں اسی ڈر سے میں نے باتوں کا رخ موڑ دیا'' کیا تم نے اندازہ لگایا کہ مرنے سے پہلے نور کیا کہنا چاہتا تھا؟''

''سہیل بھی شیر خان نہیں ہے۔ تم نے غور نہیں کیا۔ نور نے جیسے ہی کہا کہ یہ شخص اور اسے گولی ماری دی گئی۔ شاید وہ اس کا اصل نام بتانا چاہتا تھا۔'' آصفہ نے مسکرا کر کہا۔

''غلط، ایک نہیں ایسے بہت سے ثبوت ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ سہیل ہی شیر خان ہے۔'' میں نے مسکرا کر آصفہ کی طرف دیکھا۔ ''نور کوئی اور بات بتانا چاہتا تھا۔ یقیناً کوئی ایسی بات جسے سنتے ہی ہم سہیل کے خون کے پیاسے ہو جاتے۔''

''تو اب کیا ہم اس کا اچار ڈالیں گے۔'' صادقہ جل کر بولی۔

''تو نہیں سمجھی وہ ہم سے بہت بڑا کام لینا چاہتا ہے۔'' آصفہ بولی۔ ''تم نے بھی سنا ہوگا۔ وہ ہمیں اس علاقے میں بھیجنا چاہتا ہے جہاں افیون کی کاشت ہوتی ہے۔ وہ علاقہ موت کی وادی کہلاتا ہے۔ وہاں دوستوں کے لئے جان دی جاتی ہے مگر دشمنوں کو کسی حالت میں بھی بخشا نہیں جاتا۔''

''یعنی ہمیں ان کھیتوں پر قبضہ کرنا ہوگا۔''

''کھیتوں پر نہیں، کسانوں پر انہیں مافیا کے چنگل سے نکال کر اپنے قبضے میں لینا ہوگا

تاکہ وہ اپنا مال ہمیں دیا کریں۔"

"ایک بات کہوں۔" کمال نے کہا۔ "میرا تو خیال ہے اس کا ساتھ دے دیا جائے تاکہ ہم وہاں تک جا پہنچیں لیکن وہاں پہنچ کر ہمارا مشن بدل جائے گا۔ ہم وہاں کے لوگوں کو ترغیب دیں گے کہ اس زہر کی کاشت بند کر دیں۔"

"فی الحال تو یہ سوچو کہ یہاں سے نکلا کیسے جائے۔" نجمہ بولی۔

"کھڑکیوں پر کوشش کرنی چاہیے۔" میں نے مشورہ دیا۔

"یہ مت بھولو کہ یہ کمرا بھی چائنیز ہوٹل میں ہوگا۔"

"یہ بعد کی بات ہے کہ ہم کہاں ہیں" کہتے ہوئے کمال نے پوری قوت سے کھڑکی پر گھونسا مارا۔

کھڑکی کا پلہ شاید بہت پرانا تھا۔ اکھڑ کر دور جا گرا۔ لکڑی کا پلہ ہٹتے ہی میرا دل جھوم اٹھا۔ کھڑکی میں سلاخیں بھی نہیں تھیں۔ سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ ہم چائنیز ہوٹل میں نہیں تھے۔ کسی ویران جگہ پر بنی عمارت میں قید تھے۔ عمارت کے گرد چار فٹ اونچی دیواریں تھیں۔ دیواروں کے پار دور دور تک پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ عمارت سنسان ہے۔ کوئی آدمی بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔

"پہلے میں باہر کودتا ہوں میرے پیچھے کمال آئے گا تاکہ اگر کسی سے مڈبھیڑ ہو جائے تو سنبھالا جا سکے۔" میں نے کہا۔ اور کھڑکی سے باہر کود گیا۔

واقعی وہاں کوئی نہ تھا۔ میں نے اشارہ دیا یکے بعد دیگرے سب باہر نکل آئے۔ باہر آتے ہی میں نے صحن میں قدم رکھا۔ ابھی بہ مشکل دو قدم چلے ہوں گے کہ میرے اوپر کوئی بھاری شے آ پڑی۔ میں نے پھرتی سے قلابازی لگا دی تھی پھر بھی میری شرٹ پھٹتی چلی گئی تھی۔ پتا نہیں کس کونے میں وہ بلڈ ہاؤنڈ چھپا ہوا تھا جس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اگر ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو میرا نرخرا ادھڑ جاتا۔ کتا پھر اچھلا تھا کہ میں نے دوبارہ قلابازی کھائی۔ کمال نے موقع کی نزاکت کو بھانپ لیا تھا۔ اس نے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے پلے کو اٹھا لیا تھا اور ایسا تاک کر مارا کہ کتے کی کھوپڑی اڑ گئی وہ خون میں نہا گیا! ور زمین پر گر کر اینٹھنے لگا تھا۔ شگفتہ کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا تھا جب کہ آصفہ، صادقہ اور نجمہ پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اسی طرح چاق و چوبند تھیں۔

"ارے بھئی آگے بھی بڑھو۔" کمال نے ٹوکا۔

ہم سب ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھ ہی رہے تھے کہ سامنے سے ایک جیپ آتی نظر آئی۔ جیپ دیکھتے ہی میں نے سب کو لیٹ جانے کا اشارہ کیا اور نیچی آواز میں بولا۔ "واپس بلڈنگ کی جانب۔"

ہم سب ملٹری کی طرح سرعت سے سینے کے بل رینگتے ہوئے برآمدے میں پہنچے اور پھر سامنے والے دروازے میں داخل ہو گئے۔ اس کمرے میں ایک آدمی اوندھا پڑا تھا۔ اس کے نزدیک ہی دیسی شراب کی خالی بوتل پڑی تھی۔ لگتا تھا ایک کتے اور ایک آدمی پر بھروسا کر کے سہیل نے سمجھ لیا تھا کہ وہ طوفان کا راستہ روک لے گا، لیکن یہ اس کی عقل پر ہنسنے کا موقع نہیں تھا آنے والوں کی نگاہوں سے چھپنے کا موقع تھا۔ میں نے صادقہ کو الماری کے پیچھے، آصفہ اور نجمہ کو پلنگ کے نیچے چھپنے اشارہ دیا اور خود دروازے کی آڑ میں ہو گیا۔ دوسرے پلے کے پیچھے کمال کھڑا ہو گیا۔ شگفتہ، صادقہ کے پیچھے چھپ گئی۔ اسی وقت باہر سے جیپ کے رکنے کی آواز آئی پھر کسی نے پکارا "جمیل!"

میں سمجھ گیا کہ انٹا غفیل پڑے اس شخص کا نام جمیل ہے۔

پکارنے والا کمرے کے دروازے پر آ کر بولا۔ "سالے، اس نے آج پھر چڑھا لی۔ باس نے سختی سے حکم دے رکھا تھا کہ قیدی چالاک ہیں ان پر خاص نظر رکھنی ہے" اس نے آگے بڑھ کر لیٹے ہوئے شخص کو لات ماری۔ نشے میں دھت پڑے شخص نے کسمسا کر کروٹ لی۔ اسی وقت باہر سے آواز سنائی دی۔ "ارے ٹائیگر مر گیا۔ فرحان جلدی آؤ۔"

اندر آنے والا الٹے پیروں واپس پلٹ گیا۔ اس نے باہر پہنچتے ہی کہا "لگتا ہے قیدی فرار ہو گئے۔"

"ابھی زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے انہیں تلاش کر سکتے ہیں۔" ایک دوسری آواز سنائی دی۔

"چلو، انہیں سڑک تک پہنچنے سے پہلے روکنا ہے۔"

کچھ لمحے بعد گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی جو لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی جا رہی تھی۔ ہم پھر باہر نکل آئے۔ باہر آنے سے پہلے انٹا غفیل پڑے شخص کی مشکیں کس دی تھیں۔ باہر آتے ہی دل دھک سے رہ گیا۔ سامنے سے تین گاڑیاں آ رہی تھیں۔ آگے آگے کالی کار تھی۔ اس کار کو دیکھتے ہی میں نے پہچان لیا وہ بلٹ پروف کار تھی یقیناً اس میں سہیل ہوگا۔

میں نے مڑ کر کہا۔ ”ہری اپ واپس، اوپر چھت پر۔“

سب دوڑتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ کسی نے دیکھ نہ لیا ہو۔

باہر آنے سے پہلے ہی میں نے اوپر جانے والی سیڑھیاں دیکھ لی تھیں۔ اسی کے ذریعے ہم اوپر پہنچے اور ایک جانب دیوار کی آڑ میں بیٹھ گئے۔ یکے بعد دیگرے گاڑیاں آ کر پورچ میں رکیں اور لوگ اترے۔ دل نے چاہا کہ نیچے جھانک کر دیکھیں لیکن ہمت نہ ہوئی۔ کسی کی بھی نظر پڑ سکتی تھی۔ تبھی نیچے سہیل کی آواز سنائی دی۔ ”ٹائیگر مرا پڑا ہے۔ اندر دیکھو۔ لگتا ہے قیدی فرار ہو گئے ہیں۔“

نیچے سے کئی لوگوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اسی وقت کسی اور کار کے داخل ہونے کی آواز سنائی دی پھر کسی نے کہا۔ ”باس میں نے سڑک تک دیکھ لیا وہ ادھر نہیں گئے ہیں۔“

”تو کیا انہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ تلاش کرو ورنہ۔۔۔۔۔“ سہیل گرجا۔

”باس کہیں وہ اسی کوٹھی میں چھپے ہوئے نہ ہوں۔“

”ہاں، تلاش کرو۔“

”تبھی مجھے سیڑھیوں پر دھمک سنائی دی، کوئی اوپر آ رہا تھا۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔

میں زینے کی داہنی جانب تھا اور درمیان میں دیوار تھی۔ وہ زینے پر کھڑا سیدھ میں دیکھ رہا تھا۔ یقیناً اس کی آنکھیں سرچ لائٹ کی طرح گردش کرتی ہوئی اس کونے سے اس کونے تک کا جائزہ لے رہی تھیں اور میں اپنا سینہ زمین سے چپکائے دم سادھے لیٹا تھا۔ میرے پیچھے کمال تھا اور اس کے پیچھے باقی سب، تو اس کا داہنا پیر میرے ہاتھ کی پہنچ میں تھا۔ اگر چاہتا تو میں اسے کھینچ کر گرا سکتا تھا مگر میں پہل کا قائل نہ تھا۔

”اے ادھر کون ہے؟“ نووارد نے بائیں جانب دیکھتے ہوئے ہانک لگائی۔

میرے دل میں چور تھا۔ میں نے بغیر کچھ پوچھے سمجھے اس پر چھلانگ لگا دی۔ حالانکہ مجھے سوچنا چاہیے تھا کہ ہم اس کے داہنے جانب ہیں اور اس نے بائیں جانب دیکھتے ہوئے ہانک لگائی تھی۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ تندوے کی طرح اچھل کر اس پر جا پڑا اور اژدہے کی طرح اس کے جسم سے لپٹ گیا تھا۔ میرا بایاں ہاتھ اس کے منہ کا ڈھکن بن گیا تھا۔ وہ زور لگا رہا تھا اور میں اسے دابے ہوئے تھا۔ میری کوشش تھی کہ وہ تڑپ نہ سکے کیونکہ چھت پر ہونے والی دھینگا مشتی کی

دھمک نیچے کمرے میں بآسانی سنائی دے جاتی اور تجسس نیچے والوں کو چھت پر کھینچ لاتا۔ اسی لئے میری کوشش تھی کہ ہلکی سی بھی آواز پیدا نہ ہو۔ اسی دوران کمال نے اپنا کمال دکھا دیا اس نے نووارد کی کنپٹی دبا دی تھی۔ بے چارہ چیخ بھی نہ پایا تھا کہ بے ہوش ہو گیا۔ اس بے ہوش شخص کو میں نے دیوار کی آڑ میں کھینچ لیا اور گٹھڑی کی طرح ایک جانب ڈال دیا اس کی جیب سے پستول نکال ہی رہا تھا کہ نیچے سے کسی نے ہانک لگائی۔ ”صاحب جان، اے او صاحب جان کہاں مر گیا؟“

میں نے اندازہ لگا لیا کہ نووارد کو پکارا جا رہا ہے۔ میں نے پیچھے مڑ کر لڑکیوں کی جانب دیکھا وہ سب چوبند تھیں۔ ست باندھے تیار۔ شکار آیا کہ جھپٹیں۔ شگفتہ کے علاوہ سب ہی مارکٹائی میں ایکسپرٹ تھیں۔ مردوں کی پٹائی تو ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ صادقہ نے غراتی آنکھوں سے مجھے سامنے دیکھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے سر گھما کر پوری توجہ سیڑھیوں کی جانب لگا دی۔ چند لمحوں کے بعد سیڑھیوں پر دھپ دھپ کی آواز آنے لگی میں سمجھ گیا کہ اس بار آنے والا بھاری بدن کا ہے اس سے نمٹنا اتنا آسان نہیں جتنی آسانی سے پہلے والے کو چت کر دیا تھا۔ میں نے کمال کا ہاتھ دبا کر ہوشیار کیا اور آنے والے کی راہ دیکھنے لگا۔ دل کی دھڑکن کنپٹیوں میں محسوس ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دل سینے کا پنجر توڑ کر باہر آ جائے گا۔ عجیب سا ماحول طاری تھا۔ اپنی سانسوں کی سرسراہٹ سے بھی خوف آ رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھ پر عجیب سا خوف طاری ہوتا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے جو شخص آیا تھا اس کے انتظار میں ایسی کوفت ایسا خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ کوفت، اس بات کی تھی کہ وہ جلد آ جائے اور جو ہونا ہے ہو جائے۔ خوف اس بات کا تھا کہ اگر ناکام رہا تو زندگی کی بھی ضمانت نہیں۔ سہیل زندہ نہیں چھوڑے گا۔

بڑی مشکل سے جاں گسل لمحے کا خاتمہ ہوا اور آنے والے کا پیر نظر آیا۔ میرا اندازہ صحیح تھا۔ پیر بہ زبان خاموشی اس کی تندرستی کی کہانی سنا رہا تھا۔ وہ بھاری تن و توش کا تھا۔

اس نے چھت پر قدم رکھتے ہی چاروں جانب دیکھا اور پھر صاحب جان کو گالیاں دیتا ہوا واپس پلٹ گیا۔

سارے اندیشے غلط ثابت ہو گئے۔ تنے ہوئے اعصاب معمول پر آ گئے۔ سب کی جان میں جان آئی۔ خطرہ ٹل گیا تھا اب انتظار تھا کہ ان کی گاڑیاں باہر نکلیں۔ جب تک وہ نہیں جاتے ہیں ہمارے فرار کی راہ بند رہے گی۔

”صاحب جان کہاں مر گیا؟“ سہیل کی آواز سنائی دی۔

"پتا نہیں باس اوپر بھی نہیں ہے۔"

"تلاش کرو۔" وہ دھاڑا۔

اسی وقت کسی کی آواز سنائی دی۔ "باس! اوپر...... کوئی ہے۔" مجھے ایسا لگا گویا میرے سینے میں برچھی اتر گئی ہو، خوف کے عفریت نے گلا دبوچ لیا ہو۔ میں نے مڑ کر دیکھا تھا شگفتہ بیٹھ رہی تھی۔ اسی کی غلطی نے ہمیں مروا دینے کا سامان کر دیا تھا۔

"ہوشیار!" میں نے سرگوشی میں کمال کو مخاطب کیا اور پستول کو آگے کر لیا۔

"احتیاط! میاں احتیاط۔" کمال نے ٹوکا۔ "پہلے انہیں اوپر آنے دو پھر دیکھا جائے گا۔"

اس کا مشورہ غلط نہیں تھا۔ سیڑھیاں تنگ تھیں ایک وقت میں دو آدمی آتے پہلے آنے والوں کو ہم بہ آسانی سنبھال سکتے تھے۔ کچھ کو آصفہ صادقہ اور نجمہ سنبھال لیتیں۔ بعد میں جو ہوتا دیکھا جاتا یوں بھی آنے والے دوست تو تھے نہیں۔

ابھی میں خیالوں میں ہی گم تھا کہ سہیل کی تند آواز سنائی دی۔ "دلاور جا کر دیکھو۔"

میں تیار ہو گیا۔ نیچے چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں مگر آواز صاف سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ تبھی سیڑھیوں پر چاپ سنائی دی۔ میں مستعد ہو گیا۔ آنے والا اکیلا تھا مگر چاپ بھاری تھی۔ یقیناً بھاری تن و توش کا آدمی ہو گا۔ اس سے نپٹنا آسان ہو گا بھی یا نہیں۔ ابھی بھی سوچ رہا تھا کہ وہ میرے اندازے سے بھی پہلے اوپر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی۔ وہ نیولے کی طرح ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ میں نے پھرتی سے اس کے پیر کو پکڑ کر کھینچ لیا۔ اس کے گرتے ہی کمال نے سواری گانٹھلی اور آصفہ نے سرعت سے اس کی کلاشنکوف چھین لی۔ صادقہ کب پیچھے رہنے والی تھی اس نے پوری قوت سے کھڑی ہتھیلی سے اس کی گردن پر وار کیا۔ چٹ کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ یقیناً نووارد کا منکا ٹوٹ گیا ہو گا۔ اس کا بدن رہ رہ کر جھٹکے لے رہا تھا۔ میں نے اس کے کپڑوں کی تلاشی لینی شروع کی۔ اس نے ڈبل ہولسٹر لگا رکھا تھا دونوں میں پستول تھے۔ ضرور وہ سہیل کا باڈی گارڈ ہو گا تبھی تو اس طرح مسلح تھا۔ میں نے صادقہ، آصفہ اور کمال کو پستول دے دیے اور کلاشنکوف خود رکھ لی۔

"کہاں مر گیا؟" نیچے سے سہیل کی دھاڑ سنائی دی۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ دو دو ہاتھ کرنا ناگزیر ہے۔

"شمیم تو جا کر دیکھ وہ اوپر کیا کرنے لگا ہے۔ لگتا ہے صاحب جان کے ساتھ گھونٹ

لینے لگا ہے۔" سہیل پھر دھاڑا۔

سیڑھیوں پر بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز ابھری۔ میں سمجھ گیا کہ آنے والے تعداد میں دو تین ہیں۔ ان سے کیسے نمٹا جائے۔ پہلے آنے والے صرف تلاشی کے لئے آئے تھے مگر اب جو آ رہے تھے ان کا مقصد اپنے ساتھیوں کو تلاش کرنا تھا۔ پینے والے آڑ میں بیٹھتے ہیں۔ وہ آتے ہی پہلے دیوار کے پیچھے دیکھیں گے اور ہم سب دیکھ لئے جائیں گے۔ موقع نہیں تھا کہ ہم سب بکھر جاتے۔ سب کا ایک ساتھ پکڑے جانا یقینی تھا۔ مگر میں نے سوچ لیا تھا کہ آخری سانس تک مقابلہ کروں گا۔ تبھی مجھے پیٹھ کی جانب سے آواز سنائی دی۔ "بچو کھیل ختم ہو چکا اپنے اپنے ہاتھ اٹھا لو۔"

میں نے مڑ کر دیکھا میرے پیچھے ایک نوجوان کلاشنکوف تھامے کھڑا تھا۔ اس کے کپڑوں پر زنگ کا داغ تھا میں سمجھ گیا کہ وہ پائپ کے ذریعے چھت پر چڑھا ہے۔ ٹھیک اسی وقت سیڑھیوں سے آواز آئی۔ "ہری اپ فوراً ہاتھ اٹھا دو ورنہ چھلنی کر دوں گا۔" سیڑھیوں پر بھی کلاشنکوف بردار موجود تھے۔

ہم سب بے بس ہو چکے تھے کوئی چارہ نہ تھا۔ آنے والا اتنی چالاکی سے آیا تھا کہ ہلکی سی آہٹ بھی نہیں ہوئی تھی۔ ہم سب سامنے کی سیڑھیوں پر نظریں جمائے ہوئے تھے اور وہ پچھلی جانب سے پائپ کے ذریعے چڑھ آیا تھا۔ اس نے کلاشنکوف سیدھی کر لی تھی۔ ہماری ہلکی سی لغزش ہمیں موت کے منہ میں دھکیل دیتی اسی لئے میں نے خاموشی سے ہاتھ اٹھا دیے میری تقلید سب نے کی۔

"چلو نیچے اترو۔" اس نے کلاشنکوف ہلائی۔

ہم سب قطار باندھ کر نیچے کی جانب چل پڑے۔ میری کلاشنکوف بھی اس نے چھین لی تھی لیکن پستول میری کمر میں تھا اگر ہاتھ نیچے رہتا تو میں رسک لے لیتا۔

"کیا میں ہاتھ نیچے گرا لوں۔" آصفہ نے پوچھا۔

"ہاں لڑکیاں گرا لیں۔"

آصفہ، صادقہ، نجمہ اور شگفتہ نے ہاتھ نیچے گرا لیا لیکن کمال اور میں اسی حالت میں بڑھتے رہے۔ تبھی صادقہ نے بہت بڑا کام کر دکھایا وہ مڑی اور دھائیں دھائیں کی آواز سے فضا کانپ اٹھی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا اور سیڑھیوں سے پھسلتا ہوا نیچے لڑھکا ہم سب پھرتی سے کنارے ہو

گئے جب وہ لڑھکتا ہوا میرے نزدیک پہنچا تو میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے کلاشنکوف کو روک لیا
اور وہ لڑھکتا ہوا نیچے چلا گیا۔ تبھی نیچے سے فائر ہوا۔ صادقہ نے جوابی گولی چلائی۔ میں نے کاشن
دیا۔ ''ہری اپ سب اوپر چلو۔'' خود بھی دوڑتا ہوا اوپر پہنچ گیا میں نے ایک پہلی والی کلاشنکوف
سنبھال لی اور نووارد کی کلاشنکوف کمال کو تھمادی۔ آصفہ نے زخمی کے دونوں پستول نکال لیے تھے۔

ایک اس نے نجمہ کو تھمادیا۔ میں نے اپنا پستول شگفتہ کو دے دیا ہم اوپر سے فائر کر رہے تھے اور
نیچے سے وہ لوگ جم کر مقابلہ ہو رہا تھا۔ ہم پائپ کی جانب سے بھی ہوشیار تھے، کئی لوگوں نے
چڑھنے کی کوشش میں جان سے ہاتھ دھولیا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ زیادہ دیر اور ٹھہرنا ممکن نہیں ہے
گولیاں ختم ہوتے ہی ہم بھیگے چوہے کی طرح پھنس جائیں گے۔ اسی لیے میں نے اشارہ کیا کہ وہ
سب سیڑھیوں سے نیچے اتریں۔ وہ سب پوزیشن لے کر نیچے اترنے لگے۔ میں نے دیوار کے
نزدیک پہنچ کر آخری برسٹ مارا اور خاموشی سے پیچھے ہٹنے لگا۔ چار پانچ سیڑھیاں اترتے ہی
لڑکھڑا گیا۔ نیچے سے ہینڈ گرینیڈ پھینکا گیا تھا۔ پوری عمارت لرز کر رہ گئی تھی۔ شاید چھت بھی ٹوٹی
تھی۔ اگر ہم اوپر رہتے تو یقیناً زخمی ہو جاتے۔ ہم سب سیڑھیوں سے اتر کر آنگن میں آ گئے۔
دشمن لان میں مورچہ بند تھے۔ پچھلا دروازہ کھلا ہوا۔ ادھر کوئی بھی نہ تھا۔ ہم نے موقع سے فائدہ
اٹھالیا اور باہر نکل آئے۔

دور دور تک چٹیل میدان تھا۔ اگر ہم دوڑتے بھی تو زیادہ دور نہ جا پاتے، دور سے سے
ہی کسی گولی کا نشانہ بن جاتے۔ اس لیے آصفہ نے اشارے سے دیوار کی آڑ لے کر مین گیٹ کی
جانب بڑھنے کا اشارہ کیا۔ ہم آہستہ آہستہ بڑھنے لگے۔

سہیل کے گرگے ابھی تک چھت کی جانب فائر کر رہے تھے۔ اس درمیان تین گرینڈ
بھی پھینکے جا چکے تھے۔ پھر بھی عقل کے ماروں کو اتنی سمجھ نہ آئی تھی کہ چھت چھلنی ہو چکی ہوگی۔
وہاں کوئی بھی نہ ہوگا۔ ان کی غفلت سے فائدہ نہ اٹھانا بے وقوفی تھی۔ ہم نے ایک ساتھ ان پر
برسٹ مارا، آٹھ کے آٹھوں لڑھک گئے۔ میں نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر کرولنگ کرتے ہوئے
لان میں داخل ہوا۔

سہیل کی بلٹ پروف کار وہاں نہ تھی۔ لگتا تھا کہ وہ پہلے ہی فرار ہو گیا تھا۔ میں نے
اطمینان کے لئے دروازے پر برسٹ مارا لیکن کسی جانب سے کوئی ہلچل محسوس نہ ہوئی۔ میں اٹھ
کر بیٹھ گیا۔ مجھے بیٹھتے دیکھ کر کمال بھی آ گیا۔ انتاغفیل پڑے آٹھوں کی جانب میں بڑھا۔ ان

میں سے صرف ایک کی سانس چل رہی تھی۔ میں نے اسے ہوش میں لانے کے لئے تڑاتڑ تھپڑوں
کی بارش کی۔ وہ کراہتا ہوا اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے پوچھا۔ ''سہیل کہاں ہے؟''
''وہ......شر......'' اس کے آگے کچھ کہہ نہ سکا اور لڑھک گیا۔ ہم نے اس کی وین پر
قبضہ کیا اور باہر نکل آئے۔

''وین کو الٹی جانب لے چلو......سڑک خطرناک ثابت ہوگی۔'' آصفہ نے کہا۔
کمال نے وین کا رخ تبدیل کر دیا۔ ہچکولے کھاتی وین اونچے نیچے راستے پر بڑھتی
چلی گئی۔ کافی دور جانے کے بعد ہم نے دیکھا کہ شہر کی جانب سے کئی وین آگے پیچھے چلی آ رہی
تھیں۔ یقیناً وہ سہیل کے گرگوں سے بھری ہوئی ہوں گی۔ کہیں وہ ہمیں دیکھ نہ لیں یہی سوچ کر
میں نے کہا ''کمال وین کو کسی آڑ میں کھڑی کر دو۔''
''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ کچھ دوری پر ایک
سوکھا تالاب نظر آیا۔ اسی گہری جگہ پر وین کو کھڑی کر کے کمال نے کہا ''دور سے دیکھے جانے کا
خطرہ نہیں ہے پھر بھی ہمیں الگ الگ جگہوں پر پوزیشن لے کر بیٹھنا چاہئے۔''
اس کے خیال ظاہر کرتے ہی صادقہ، آصفہ، نجمہ پتھروں کی آڑ لینے کے لئے دوڑ
گئیں۔ ان کے پاس پستولیں تھیں۔ کمال نے کلاشنکوف سے ایک بڑے سے پتھر کی جانب
اشارہ کیا۔ ''میں تو ادھر جا رہا ہوں۔'' ہم سب پوزیشن لے کر بیٹھے تھے اور نگاہیں وینوں پر جمی
تھیں۔ تینوں وین عمارت کی جانب بڑھتی جا رہی تھیں۔ پہلی وین عمارت میں داخل ہوئی اور پھر
فوراً ہی یوٹرن ہو گئی اور آخری وین کے نزدیک جا کر رکی۔ دروازہ کھلا اور ڈرائیور اتر کر سامنے والی
وین میں بیٹھے کسی شخص سے کچھ کہنے لگا۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ اندر کا حال بتا رہا ہے۔ کچھ دیر
بعد اس وین میں سے ایک شخص اترا اور اس نے چیخ کر کچھ کہا تھا۔ باقی دونوں وینوں سے بھی کئی
شخص اتر کر اس کے آس پاس کھڑے ہو گئے۔ اس نے انہیں ہدایت دی اور خود جھک کر زمین پر
کچھ دیکھنے لگا۔ پھر آہستہ آہستہ ہماری جانب بڑھنے لگا۔ وہ جوں جوں بڑھ رہا تھا ہمارے چہروں
کی رنگت بدل رہی تھی، دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ ''ٹریگر پر انگلیاں اکڑتی ہوئی محسوس ہو رہی
تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہم سب یکا یک بارود کی طرح بھک اٹھیں گے۔ بم کی طرح پھٹ
پڑیں گے۔
جوں جوں وہ ہمارے نزدیک آ رہا تھا مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ موت نزدیک آتی جا رہی

ہے اس کے ساتھ آنے والوں کی تعداد دس سے زائد تھی۔ میری نگاہیں ان پر جمی ہوئی تھیں کہ آصفہ کی دبی دبی آواز سنائی دی۔ ''گولیاں دیکھ بھال کر خرچ کرنا۔ ہمارے پاس گولیوں کا اسٹاک بالکل نہیں ہے۔ ایک بھی گولی برباد نہ ہو۔''

تبھی ہماری جانب گولیوں کا سیلاب امنڈا۔ ڈھیر ساری گولیاں ہمارے سامنے کھڑی پتھر کی چٹان سے ٹکرائیں، جواب میں کمال نے بھی برسٹ مارا۔ وہ سب اچھل اچھل کر پتھروں کے پیچھے چھپ گئے۔

''افسوس، ہمارے پاس گرینڈ نہیں ہے۔'' صادقہ کی تیز بڑبڑاہٹ گونجی۔ ''تم میرے پیچھے آؤ۔'' کہتے ہوئے آصفہ نے رینگنا شروع کر دیا۔ میں نے اس کی تقلید کی۔ کچھ دور آ کر اس نے کہا۔ ''نگاہیں دوڑاؤ شاید کوئی بڑی سی ڈال نظر آ جائے۔''

''ڈال! ڈال سے کیا کرو گی؟''

''گول چٹان کو لڑھکانا چاہتی ہوں۔ اگر یہ چٹان لڑھکی تو سیدھی اس ڈھلان پر گرے گی جس پر وہ سب موجود ہیں۔ چٹان اتنی بڑی ہے کہ ایک کنکری تک اس کی مار سے بچ نہ پائے گی؟'' آصفہ کہتی چلی گئی۔ ''مجھے یقین ہے یہ چٹان ان کے لئے موت کا ہرکارہ بن جائے گی۔''

''واہ! کمال کا آئیڈیا ہے۔''

''مگر آئیڈیا کا کیا کیا جائے۔ یہاں ایسی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ جس سے چٹان لڑھکائی جائے۔ گنوں کی بٹ یا کسی ہلکی چیز سے چٹان گرائی نہیں جا سکتی ہے۔ کاش اس وقت ہمارے پاس ایک بھی گرینڈ ہوتا۔''

''سوال یہ ہے کہ ایسی حالت میں کیا کیا جائے؟''

آصفہ بولی۔ ''دکھ کی بات تو یہی ہے کہ ہمارے پاس چٹان گرانے کا کوئی سامان نہیں ہے۔''

ڈھلوان کی طرف سے رہ رہ کر فائرنگ ہو رہی تھی ہم سمجھ رہے تھے کہ فائرنگ کی ہر آواز کے بعد وہ اور اوپر چڑھتے چلے آ رہے ہوں گے کچھ توقف کے بعد آصفہ بولی۔

''ایک اور ترکیب دماغ میں آئی ہے حالانکہ وہ اتنی کارگر نہیں ہے جتنی چٹان والی تھی مگر پھر بھی کچھ نہ کر پانے سے تو بہتر ہی ہوگا۔''

''جلدی بولو۔''

مجھے کچھ بتانے کی بجائے وہ لپک کر وہاں پہنچی جہاں کمال اور صادقہ پوزیشنیں لئے فائرنگ کرنے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ انہیں کچھ ہدایت دے کر پھر وہ واپس آ گئی۔

''کیا رہا آصفہ؟'' میں نے پوچھا ''کوئی ترکیب سوچی؟''

''ڈھلان پر جتنے بڑے بڑے پتھر ہیں ان کی جڑوں میں برسٹ مارو۔''

''اس کا فائدہ۔''

''انہیں اوپر آنے کی آڑ نہیں ملے گی۔''

''اسکیم بہت کمزور ہے۔'' میں نے کہا۔ ''پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے پاس گولیاں کم ہیں اور پتھروں کو جڑ سے اکھاڑنے کے لئے بڑی مقدار میں گولیاں چاہئے۔''

''کوشش کرنا ضروری ہے۔'' کہنے کے ساتھ آصفہ نے میرے ہاتھ سے کلاشنکوف لے کر برسٹ مارا۔ ریت ہوا میں اڑی مگر چٹان ٹس سے مس نہ ہوئی۔ تبھی دوسری جانب سے کسی نے چیخ کر کہا۔ ''باس وہ پاگل ہو گئے ہیں۔ بے مقصد گولیاں برباد کر رہے ہیں۔''

''ان کے پاگل پن پر توجہ نہ دو، آگے بڑھو۔'' کسی دوسرے نے ہدایت دی۔

آصفہ نے فائرنگ بند نہ کی تھی۔ بالآخر چٹان اکھڑ گئی اور لڑھکتی ہوئی میدان میں جا گری۔ مگر ہم جو چاہتے تھے وہ نہ ہوا۔ چٹان دوسری طرف جا گری تھی۔

''نہیں آصفہ'' تبھی صادقہ بولی۔ ''اس طرح گولیاں برباد کرنا عقلمندی نہیں ہے۔''

آصفہ جھنجلا اٹھی۔ ''اس کے علاوہ کر کیا سکتے ہیں۔''

کمال نے چٹکی بجائی۔ ''میں کر سکتا ہوں۔''

''کیا؟''

''ایک کرشمہ۔'' وہ مسکرایا۔ ''تم سب یہیں ٹھہرو۔ میرا کرشمہ دیکھنے کے بعد تم بھی میری عقل کی داد دو گی۔''

''کیسا کرشمہ؟'' میں نے پوچھا۔

''سننے میں نہیں دیکھنے میں مزہ آئے گا۔ آج میرا کمال دیکھو، مجھے صرف پندرہ منٹ چاہئیں۔ کسی بھی طرح انہیں پندرہ منٹ روک لو۔''

کہنے کے ساتھ ہی وہ داہنی جانب سرکتا چلا گیا۔ فوجیوں کے انداز میں وہ سینے کے بل کہنیوں کی مدد سے سانپ کی طرح رینگتا ہوا بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ تبھی ڈھلان کی جانب سے

زبردست فائرنگ شروع ہوگئی۔ ہم سب جواب دینے میں مصروف ہوگئے۔ میری کلاشنکوف رہ رہ کر گولیوں کا مینہ برسا رہی تھی۔ میں گھوم گھوم کر برسٹ مار رہا تھا۔ گولیاں ختم ہونے کے قریب تھیں لیکن حوصلے بلند تھے۔ میری نگاہیں اس ٹیلے کی جانب تھیں جس کے پیچھے دشمن چھپے ہوئے تھے اور وقفے وقفے سے گولیاں چلا رہے تھے۔ تبھی ہم سب چونک اٹھے۔ ہمارے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ایسا پاگل پن میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پتا نہیں کیسے اس نے اتنا بڑا قدم اٹھا لیا تھا۔ اگر مجھے ذرہ برابر بھی شک ہوتا تو میں اسے ہٹنے نہ دیتا۔ کمال نے رینگتے ہوئے ایک لمبا چکر کاٹا تھا اور ان کے سروں پر پہنچ گیا تھا۔ ان کی پشت پر پہنچ کر اس نے للکارتے ہوئے دوڑ لگا دی تھی۔ کلاشنکوف کا برسٹ جاری تھا۔ انگارہ اگلتے کلاشنکوف کے ذریعے اس نے وہ کر دکھایا جو کسی صحیح العقل سے ممکن نہ تھا۔ دشمنوں نے اس پر بھی برسٹ مارا تھا۔ خون کی دھارا اچھلتے میں نے بھی دیکھی تھی مگر وہ رکا نہیں تھا دوڑتا چلا گیا تھا۔ خودکشی کرنے والوں پر دو چار گولیاں کب اثر کرتی ہیں۔ مرتے مرتے وہ سب کو مار گیا تھا۔ اس کی جنونی کیفیت دیکھ کر صادقہ بھی مشین پستول سے فائر کرتی دوڑ پڑی تھی۔ کئی گولیاں اسے بھی لگی تھیں۔ مجھ پر تو گویا سکتہ سا طاری ہوگیا تھا۔ کلاشنکوف کے ٹریگر پر انگلیاں اکڑ کر رہ گئی وہ اس وقت تک انگارہ اگلتی رہی جب تک میگزین خالی نہ ہوگیا۔ ٹیلے کی ایک جانب صادقہ پڑی تھی دوسری جانب کمال' دونوں خون میں غلطاں تھے۔
کافی وقت یوں ہی گزر گیا تب میں نے آصفہ کو جھنجوڑا۔ "یہ...... یہ کیا ہوگیا۔"

اس نے چونک کر سر کو جھٹکا۔ "دیکھو...... شاید وہ زندہ ہوں۔"

میں نے سینے کے بل رینگنا شروع کردیا۔ چند گز کا فاصلہ میلوں کی دوری بن گیا تھا۔ پتھروں کی چبھن بے چین کیے دے رہی تھی لیکن سامنے چھپے دشمنوں کا خوف برداشت کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔

میں کھسکتا، رینگتا صادقہ کے نزدیک پہنچا۔ وہ تمام خطروں سے آزاد ہوگئی تھی۔ سر میں پیوست گولیوں نے اسے موت کی گود میں سلا دیا تھا۔ اسے دیکھنے کے بعد میں اور آگے بڑھا۔ آہستہ آہستہ ٹیلے کے نزدیک پہنچا۔ اس وقت میرا دل بے قابو ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا سینے کا پنجر توڑ دے گا۔ اسی ٹیلے کے پیچھے تو دشمن تھے۔ کہیں وہ میرے نزدیک پہنچنے کے منتظر تو نہیں لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ ٹیلے کے پیچھے چھ لاشیں پڑی تھیں۔ ان سے کچھ دوری پر کمال آڑا ترچھا پڑا تھا۔ اس کا جسم چھلنی ہو رہا تھا۔ میں اس کے نزدیک پہنچا اپنے پیارے دوست کو کندھے پر لادا۔

مجھے کھڑے ہوتے دیکھ کر آصفہ، نجمہ اور شگفتہ بھی کھڑی ہوگئیں اور میری جانب بڑھنے لگیں۔ آصفہ اور نجمہ نے اپنی پیاری سہیلی کو اٹھایا اور میرے ساتھ چلنے لگیں۔ نزدیک ہی ایک نالہ تھا۔ ہم نے فرار کے لیے اسے چنا تھا۔ اس پہاڑی نالے کے کنارے کئی گڑھے تھے انہی میں ان دونوں کو لٹایا اور بھاری دلوں سے ان پر مٹی ڈالنے لگے۔ دو قبریں بنانے کے بعد ہم نے دشمنوں کے اسلحے جمع کیے اور چل پڑے۔ ہم پہاڑ کے اوپر چڑھ رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ پہاڑ کی دوسری جانب سڑک ہوگی۔

شام کا دھندلکا گہرا ہوتا جا رہا تھا اور چڑھائی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ پہاڑ زیادہ اونچا نہیں تھا مگر ہم ٹوٹے ہوئے تھے، قدم منوں بھاری ہو رہے تھے۔ تبھی شگفتہ بولی۔ "مجھ سے اب چلا نہیں جا رہا ہے۔" اور وہ بیٹھ گئی۔

"پلیز شگفتہ، ہمت سے کام لو دوسری جانب سڑک ہوگی۔ کسی گاڑی والے سے لفٹ لے کر ہم جلد ہی شہر پہنچ جائیں گے۔"

"نہیں آصفہ! اب مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔ پلیز مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اور تم سب نکل جاؤ۔"

"ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ یہیں کسی جگہ رات بسر کر لی جائے۔ یوں بھی رات میں گاڑیوں کا ملنا ممکن نہیں ہے۔" نجمہ نے کہا۔

میں نے ان دونوں کی جانب دیکھا۔ چہرے اترے ہوئے تھے۔ اتنے بڑے معرکے کے بعد آگے بڑھنا واقعی ان کے لیے ناممکن تھا۔ اس لیے میں نے آصفہ سے کہا۔ "ایسا کرتے ہیں کہ یہیں ٹھہر جاتے ہیں صبح ہوتے ہی پھر چل پڑیں گے۔"

"اور اگر سہیل لاؤ لشکر کے ساتھ آگیا تب؟ معرکے کے وقت وہ نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ مزید آدمیوں کو لانے کے لیے خاموشی سے نکل گیا تھا۔"

"قسمت کے لکھے کو کون ٹالے، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" میں نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑاتے ہوئے کہا۔

یکایک مجھے ایک جگہ غار نما گڑھا نظر آیا۔ میں اسی جانب بڑھ گیا۔ نزدیک پہنچ کر دیکھا وہ قدرتی سرنگ تھی۔ شاید کبھی زلزلے وغیرہ سے وہ سرنگ بن گئی ہوگی۔ میں نے انہیں آواز دی۔ ان کے نزدیک آتے ہی کہا۔ "اس غار میں رات بسر کی جاسکتی ہے۔"

''اور اگر اندر سانپ بچھو ہوئے تو؟'' شگفتہ بولی۔

''موت باہر بھی ہے اور اندر بھی۔ آنی ہو گی تو اسے کوئی نہیں روک سکتا۔''

میری بات کا ان پر خاصا اثر پڑا اور سب سے پہلے شگفتہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے بعد میں۔ میرے پیچھے آصفہ اور نجمہ تھیں۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے ماچس نکال کر جلائی۔ وہ ایک کشادہ غار تھا اور دور تک پھیلا تھا۔

''کیوں نہ ہم آگے بڑھیں؟'' آصفہ نے کہا۔

''چلو۔ میں نے دوسری تیلی جلالی۔

''فکر نہ کرنا، میرے پاس دو لائٹر بھی ہیں۔'' آصفہ نے کہا۔ ''لاشوں کی تلاشی میں ملے ہیں۔''

''لائٹر جلالو، تیلیاں کم ہیں۔'' میں نے مشورہ دیا۔

اس نے لائٹر جلا لیا غار تنگ ہوتا جا رہا تھا ہم سب آگے پیچھے بڑھتے جا رہے تھے۔ کافی دور آگے جانے کے بعد ہمیں تازہ ہوا کا احساس ہوا۔

''شاید ہم دوسری جانب نکل آئے ہیں۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

کسی نے جواب نہیں دیا۔ گیس لائٹر کی ہلکی روشنی میں سب بڑھتے رہے کچھ دیر جاتے ہی ہمیں تاروں بھرا آسمان نظر آ گیا۔ باہر آتے ہی مجھے ہنسی آ گئی۔ ہم جہاں سے چلے تھے وہیں آ گئے تھے۔ سرنگ چکر کھاتی ہوئی پہلے دہانے کے نزدیک ہی ختم ہوئی تھی۔

''یہ بھی اچھی رہی۔'' آصفہ مسکرائی۔

''خیر تم تینوں سو جاؤ میں پہرہ دے رہا ہوں۔'' میں نے مشورہ دیا۔

''نہیں!'' آصفہ بولی۔ ''ہم باری باری سے پہرہ دیں گے۔''

''ایسا کرو، کچھ دیر کے لیے میں سو لیتا ہوں۔ بارہ بجے اٹھا دینا کیونکہ پچھلے پہر جاگنا زیادہ مشکل ہے۔''

''ہاں ایسا ممکن ہے، تم سو جاؤ میں پہرہ دوں گی۔'' آصفہ نے کہا۔ ''میں وہیں کھردری زمین پر لیٹ گیا۔ کچھ دوری پر نجمہ اور شگفتہ بھی لیٹ گئیں۔ جسم تو پہلے ہی تھکا ہوا تھا کچھ ہی دیر میں نیند آ گئی۔ کافی دیر تک میں سوتا رہا جھنجھوڑنے پر آنکھ کھلی۔ شگفتہ اور نجمہ بے خبر سو رہی تھیں۔

''میں نے ان دونوں کو بیدار نہیں کیا، وہ پھر سو جاتیں۔'' کہتے ہوئے آصفہ لیٹ گئی۔

میں اُٹھ کر غار کے دہانے پر چلا آیا۔

آسمان پر صبح کا تارا جگمگا رہا تھا۔ آصفہ نے جان بوجھ کر مجھے بیدار نہیں کیا تھا۔

نیند بھگانے کے لیے میں غار کے دہانے سے باہر نکل آیا اور چہل قدمی کرتے ہوئے شہر پہنچنے کے طریقہ کار پر غور کرنے لگا۔ یکا یک میرے ذہن میں ایک نئی بات آئی اور میں چونک گیا۔ کل اتنی فائرنگ ہوئی تھی پھر لوگ متوجہ کیوں نہیں ہوئے تھے۔ کہیں یہ جگہ آبادی سے کافی فاصلے پر تو نہیں ہے؟ اسی نئے خیال نے مجھے پریشان کر دیا تھا، کہ پتا نہیں کتنا فاصلہ پیدل طے کرنا پڑے گا۔ ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے اسی بات پر غور کر رہا تھا کہ میری نظر ایک دوسرے غار پر پڑی۔

پتا نہیں، کس خیال کے تحت مَیں اس میں داخل ہو گیا۔ آصفہ کا لائٹر میرے ہی پاس تھا۔ اسے میں نے جلا لیا۔ ہلکی روشنی میں آگے بڑھنے لگا۔ یہ غار بھی پہلے والے کی طرح شیطان کی آنت تھا۔ کافی دور چلنے کے بعد دوسرے سرے پر نکلا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس جگہ سے کافی دور نکل آیا تھا جہاں آصفہ وغیرہ تھیں۔ میں اس بار باہر سے ہی ان کے پاس پہنچا آصفہ ہنوز بیدار تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''کہاں گئے تھے؟''

''ایک اور غار دیکھا ہے۔ داہنی جانب بالکل قریب ہے اس کا دوسرا سرا کافی آگے ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''خیر اب کہیں نہ جانا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے کروٹ بدل لی۔

میں وہیں غار کے دہانے پر بیٹھ گیا۔ مشرقی افق پر سپیدی سحر نمودار ہو رہی تھی۔ پہلی بار ایسا منظر دیکھا تھا۔ شہر میں ایسا منظر کبھی کبھی ہی نظر آتا ہے اس لیے میں مبہوت سا بیٹھا تھا کہ چونک گیا۔

سامنے سے کئی گاڑیاں قطار در قطار چلی آ رہی تھیں۔ ان چھ سوزوکی وجیپ میں سہیل کی کار نہ تھی۔ ان کا رخ ہماری جانب تھا میں سمجھ گیا کہ یہ سہیل کے گرگے ہیں اور اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے آ رہے ہوں گے جب ان کی لاشیں دیکھیں گے تو بارود کی طرح بھبک اٹھیں گے۔

میں نے آصفہ کو پکارا۔ وہ کچی نیند میں تھی فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''تیار ہو جاؤ۔ مہمان آ رہے ہیں ان کی خاطر داری کرنا ہے۔''

اس نے فوراً ہی نجمہ اور شگفتہ کو بھی بیدار کر دیا۔ سب نے کلاشنکوف سنبھال لی۔ نجمہ

اور آصفہ پر تو بھروسا تھا مگر شگفتہ کے بارے میں شک تھا کہ وہ کلاشنکوف چلا بھی پائے گی کہ نہیں۔

ان کے تیار ہوتے ہی میں نے کہا۔ ''آصفہ تم اور نجمہ برابر والے غار میں رینگتی ہوئی داخل ہو جاؤ تا کہ دوسرے سرے پر مورچہ بنا سکو۔''

میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ نجمہ کو ساتھ لے کر سینے کے بل رینگتی ہوئی برابر والے غار میں داخل ہو گئی۔

''شگفتہ تم غار میں پوزیشن لے کر بیٹھ جاؤ۔ میں باہر نکل کر مورچہ بنا رہا ہوں۔'' میں بھی باہر نکل گیا۔ غار کے سامنے ہی ایک بڑی سی چٹان تھی۔ اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ اجالا پھیلتا جا رہا تھا اور دشمن نزدیک آتے جا رہے تھے۔ پہلے معرکے والی جگہ پر وہ سب رک گئے۔ ٹیلے کے پیچھے کا منظر نظروں سے اوجھل تھا۔ اس لیے دیکھ نہ پایا۔ یقیناً وہ اپنے ساتھیوں کی لاشیں دیکھ رہے ہوں گے۔ کچھ دیر بعد وہ آگے بڑھتے نظر آئے۔ آگے آگے چل رہا شخص جھک جھک کر زمین پر کچھ دیکھ رہا تھا۔ یقیناً وہ نرم ریت پر ہمارے قدموں کے نشان دیکھ رہا ہو گا پھر اس نے ڈھلان پر آ کر اپنے ساتھیوں کو پھیلا دیا۔ اس نے اس طرح پہاڑی کی گھیرا بندی کی تھی کہ چڑیا بھی پہاڑی سے نکل نہ سکے۔ ان کی نگاہیں ہمارے غار کی جانب لگی ہوئی تھیں اور ان کی گنوں کا رخ بھی ہماری جانب تھا۔ وہ سب بالکل تیار تھے۔

''انتظار کس بات کا ہے۔ آتش بازی شروع کر دو۔'' شگفتہ نے کہا۔ وہ غار سے نکل آئی تھی اور میرے پیچھے سینے کے بل لیٹی تھی۔

''وقت آنے دو۔'' میں نے کہا۔ ''آج میں تمہارے ہاتھوں کا کمال بھی دیکھوں گا۔''

اس نے جواب نہیں دیا۔

سہیل کے گرگوں نے آہستہ آہستہ پیش قدمی شروع کر دی۔ ابھی وہ غار کے نزدیک بھی نہ پہنچے تھے کہ آنے والے شخص نے دونوں ہتھیلی کو بھونپو کی طرح بنا کر منہ پر رکھا اور چیخ کر بولا۔ ''ہاتھ اٹھا کر باہر آ جاؤ ورنہ ہمیں اپنی طاقت کا ٹریلر دکھانا پڑے گا۔''

''طاقت کا ٹریلر تو کیا دکھائے گا تجھے ہم دکھائے دیتے ہیں، لے دیکھ اسے ہینڈ گرینیڈ کہتے ہیں۔'' نجمہ نے گرینیڈ اچھال دیا۔ ''تمہارا گرینیڈ تم کو مبارک!''

زبردست دھماکے کے ساتھ وہ حصہ دھوئیں، آگ اور دھول سے اٹ گیا۔

''حملہ!'' کسی نے چیخ کر کہا۔

ہر جانب سے برسٹ مارا جانے لگا۔ ان کا نشانہ اس غار کا دہانہ تھا جس میں آصفہ اور نجمہ بیٹھی تھیں۔

اگر اسے بے وقوفانہ حملہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا، گولیاں صرف پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر چھترا رہی تھی۔

وہ پوزیشن ہی ایسی جگہ لیے ہوئے تھیں کہ کسی بھی طرف سے چلنے والی گولی ان کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتی تھی لیکن عقل سے عاری دستہ دنا دن فائرنگ کیے جا رہا تھا۔ جواب میں وہ دونوں بھی وقفے وقفے سے گرینیڈ اچھال رہی تھیں۔ اب تک میں خاموش تھا۔ شگفتہ کو بھی روک رکھا تھا۔ مجھے شک سا ہونے لگا تھا کہ آصفہ زیادہ دیر ٹھہر نہ سکے گی۔ میں نے اس کی مدد کرنے کی ٹھان لی مگر اپنی پوزیشن بتانے کے حق میں نہ تھا۔ میں نے شگفتہ سے کہا۔ ''تم اس وقت تک خاموش رہو گی جب تک میں اشارہ نہ کروں۔'' پھر میں نے سینے کے بل کھسکنا شروع کر دیا۔ پتا نہیں خود میری عقل کو کیا ہو گیا تھا۔ اس کی مدد دوسری طرح سے بھی کر سکتا تھا ان کی توجہ ہٹانے کے لیے نیا محاذ کھول سکتا تھا مگر اس وقت یہ بات یاد نہ آئی اور میں کھسکتے ہوئے دوسرے غار میں داخل ہو گیا پھر دوڑتا ہوا اندر ہی اندر دوسری جانب پہنچا اگر میں پہلے ہی آصفہ کو پکار نہ لیتا تو وہ مجھ پر بھی فائر کر دیتی۔

اس کے نزدیک پہنچ کر میں نے کہا۔ تم اپنا کلاشنکوف بھی دو۔ میں دراڑ میں پھنسا کر بیک وقت دونوں سے فائر کروں گا۔''

اس نے فوراً دے دیا۔ میں رینگتا ہوا دہانے پر پہنچا پھر ایک دراڑ میں دونوں کی نالیاں فٹ کیں اور برسٹ مارا اسی وقت ڈھلان سے آواز آئی۔ ''اگر شگفتہ کو بچانا چاہتے ہو تو بندوقیں پھینک دو۔''

''نہیں آصفہ! سرینڈر مت کرنا۔'' شگفتہ چیخی۔ ''اس کتے کی باتوں میں نہ آنا۔ تم لوگ میری پروا مت کرنا۔''

''تیری پروا کیسے نہ کریں شگفتہ!'' نجمہ بڑبڑائی۔ ''اگر تو نہ رہی تو یہ جنگ جیت کر ہم کیا کریں گے۔ دو کا زخم کیا کم ہے کہ تیسرا زخم بھی اٹھا لیں۔'' پھر وہ میری جانب مڑ کر بولی۔ ''ہاتھ اٹھا کر کلاشنکوف پھینک کر میرے ساتھ باہر چلو۔'' پتا نہیں اس کی آواز میں ایسا کیا جادو تھا۔ میں نے اپنی کلاشنکوف پھینک کر ہاتھ اٹھا دیے۔ میرے ساتھ آصفہ بھی باہر نکل آئی ہم سب ہاتھ

اٹھائے قطار میں آگے بڑھ رہے تھے۔

شگفتہ پھر چیخی۔ ”نہیں نہیں تم سب ایسی بے وقوفی نہ کرو۔“

مگر ہم نے اس کی بات پر کان نہ دھرا۔

شگفتہ چیخ چیخ کر ہمیں رکنے کو کہہ رہی تھی لیکن ہم سب آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ میری نگاہیں اس شخص پر جمی تھیں جس نے شگفتہ کی کنپٹی پر پستول کی نال لگا رکھی تھی۔ اس نے جھلا کر کہا۔ ”تو گلا پھاڑنا بند کرے گی یا نہیں؟“

”نہیں! تو کیا کرلے گا؟“

”میں...... میں تجھے گولی مار دوں گا۔“

”تو...... تو مجھے گولی مارے گا؟“ شگفتہ غرا اٹھی۔ ”اور تو مجھے گولی مار دے گا تو ان کو کیسے سنبھالے گا جو دم بہ دم بڑھتے آرہے ہیں ان کے ہاتھ صرف اس لئے اٹھے ہوئے ہیں کہ مجھے کچھ نہ ہو اگر تو نے ذرا بھی بدسلوکی کی تو یہ تجھے پھاڑ کر رکھ دیں گے۔“

وہ شخص سمجھ گیا۔ شگفتہ کی باتوں میں صرف سچائی ہی سچائی تھی وہ بولنا بھی چاہتا تو بول نہ پاتا۔

تبھی شگفتہ نے ایک ایسی حرکت کردی جسے کوئی بھی صحیح العقل نہیں کرسکتا تھا۔ شاید اسے احساس ہوگیا تھا کہ ہم سب اس کی خاطر موت کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ اس نے موت کی پروا کئے بغیر ہاتھ گھما دیا تھا۔ ریوالور دور جا گرا تھا اور اس نے سرعت سے اپنے دونوں ہاتھ اس کی گردن میں پھنسا دیئے تھے۔ وہ شخص بوکھلا گیا تھا۔ چاروں طرف کھڑے اس کے گرگے سکتے کے عالم میں کھڑے رہ گئے، ہڑبڑا کر اس شخص نے شگفتہ کے ہاتھ کو گردن سے ہٹانے کی کوشش لیکن ناکام رہا شاید شگفتہ نے جان کی بازی لگادی تھی اس لئے اس کی نسیں اکڑ سی گئی تھیں اور اس شخص کی سانس رکنے لگی تھی وہ آزادی کی پوری کوشش کر رہا تھا لیکن ناکامی اس کا مقدر تھی۔ اس کے ساتھیوں کی گنوں کا رخ ہماری طرف سے ہٹ کر شگفتہ کی طرف ہوگیا تھا۔

وہ شخص کچھ کہنا چاہتا تھا مگر غوں غوں کے علاوہ ایک بھی لفظ نہ نکلا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا تبھی ایک شخص نے دہاڑ کر کہا۔ ”کمانڈر کو چھوڑ دے لڑکی ورنہ بھون کر رکھ دوں گا۔“ شگفتہ نے گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا اور بولی۔ ”چلا گولی میں بھی دیکھوں تجھ میں کتنا دم خم ہے۔“

شاید وہ بھی چاہتی تھی۔ ہمیں بچانے کے لئے اپنی جان قربان کر دینا چاہتی تھی تبھی تو وہ

بار بار نہیں اُکسا رہی تھی۔ میں نے اسے روکنے کے لئے چیخ کر کہا۔ ”تو...... تو کیا پاگل ہوگئی ہے۔“

تبھی کوئی چیخا ”یہ...... یہ لڑکی پاگل ہوگئی ہے مار ڈالو اسے فائر۔“

ایک بار پھر بندوقیں گرجیں شگفتہ نے چھلانگ لگادی۔ شگفتہ کو گرتے دیکھ کر ہم سب بے ساختہ چیخے۔ ”شگفتہ۔“

کہانی عروج پر تھی کہ وہی لڑکی جو ہمیں کمرے تک لائی تھی اندر آئی اور ہنستے ہوئے بولی ”اگر آپ لوگوں کی باتیں ختم ہوگئی ہوں تو چلیئے سب کھانے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

”بھائی تمہاری کہانی ہر بار ادھوری رہ جاتی ہے چلو کچھ کھا کر آتے ہیں خود ہمیں بھی بھوک لگ رہی ہے۔“ میں نے رابیل سے کہا۔

”چلو!“ کہہ کر وہ بھی کھڑا ہوگیا۔

ہم باہر آئے۔ آنگن میں بچھے ایک بڑے سے تخت پر کھانا لگایا گیا تھا۔ دسترخوان پر سب بیٹھے ہمارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ میرے اور رابیل کے پہنچتے ہی کھانا شروع کرادیا گیا۔ نوالہ اٹھاتے ہوئے ماموں میاں نے کہا ”رفو کل جا کر پولیس آفس میں اپنی آمد لکھا دینا۔“

”جی اچھا۔“ خالہ نے جواب دیا

اگلے دن جا کر پولیس ہیڈ آفس میں انٹری کرانا پڑی کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ میں نے بھی اپنا پاسپورٹ دیا تھا جسے دیکھ کر افسر بولا۔ ”سر آپ کی انٹری نہیں ہوگی۔ آپ تو برٹش نیشنل ہیں۔ صرف پاکستانیوں کو لکھوانا پڑتا ہے۔“

☆☆☆

خالہ پھر سے اپنے بھرے کنبے کے درمیان تھیں۔ سلمٰی بھی خوش شادماں چہکتی پھرتی۔ ہر وقت لڑکیوں میں گھری رہتی۔ غرض دن عید اور راتیں شب برات بن گئی تھیں۔ رات چھتوں پر لیٹے باتیں کرتے بیت جاتی۔ تب پڑوس کی چھتوں سے ہندوؤں کے بڑبڑانے کی آوازیں آنے لگتیں۔ ”کم بخت یہ مسلے خود سوت ہیں نہ ہم کا سونے دیت ہیں۔“

تب خالہ حیران حیران نظروں سے اپنے کتنے برسوں پرانے پاس پڑوس کی چھتوں کو تکنے لگتیں۔ شاید انھیں ماحول بدلا بدلا محسوس ہونے لگا تھا۔ نہ وہ خلوص، نہ وہ محبت۔ جب دروازے پر کھڑی ہوتیں تو ہندو عورتیں منہ بنا بنا کر گزر جاتیں۔ بہت جلد سیور میں یہ بات پھیل گئی کہ میاں جی کی بیٹی پاکستان سے آئی ہے۔ دراصل پورے سیور میں خالہ کے والد ”میاں جی“ کے نام سے مشہور تھے۔

یونہی ایک دن بیٹھے بیٹھے خالہ نے سوچا کہ سلمٰی کو بازار دکھا لاؤں۔ بس اچانک ہی خیال آ گیا تھا پھر کیا تھا۔ سب نے برقعہ اوڑھا اور سلمٰی، کہکشاں، انجم کو ساتھ لیا اور مجھے چلنے کا کہہ کر نکل کھڑی ہوئیں۔

پورے بازار میں وہ سب چیزیں خریدتی پھر رہی تھیں لیکن جلد ہی میں نے محسوس کیا کہ ہندوؤں کی نظروں میں بجائے احترام کے حقارت ہے۔ ان کی آنکھوں میں ہوس کی پرچھائیاں اور نفرت کی آگ رقصاں تھی۔ میرے ساتھ عنبر، انجم تھیں۔ وہ پہلی مرتبہ بغیر برقعے اور چادر کے باہر نکلی تھیں۔ ان بچیوں کو تو گویا سب کی نظریں چھیدے جا رہی تھیں مگر خالہ کہاں دبنے والی تھیں، میاں جی کی بیٹی تھیں، کسی چوڑے چمار کی اولاد نہیں جم کے خریداری کرتی رہیں کہ اچانک شور اٹھا۔ لڑکیاں سہم کر میرے پیچھے دبک گئیں۔ میں حیران نظروں سے میدان کی طرف دیکھنے لگا جہاں کچھ لوگ گتھم گتھا تھے۔ اب جو غور کیا تو مجو بھیا کا بیٹا وقاص ایک ہندو کو نیچے گرائے اس کے سینے پر چڑھا بیٹھا تھا۔ تمام لوگ بھاگو، بچاؤ کا شور کرتے ہوئے بھاگ رہے تھے، پر کسی نے انہیں علیحدہ کرنے کی کوشش نہ کی۔ اب میں نے لڑکیوں کو وہیں چھوڑا اور بھاگتا ہوا وقاص کے پاس پہنچا اور اس کو ہندو بنیے کے اوپر سے ہٹاتے ہوئے بولا۔ "کیا بدتمیزی ہے وقاص؟"

وقاص نے کپڑے جھاڑتے ہوئے خالہ سے کہا۔ "پھوپو! یہ آپ کو پاکستانی بھگوڑن اور میری بہنوں کو گالیاں بک رہا تھا۔" پھر سر جھکا کر بولا۔ "میں برداشت نہ کر سکا۔"

خالہ نے اس ہندو کو کڑے تیوروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "نا ہنجار! ہمارے باپ دادا کی زمینوں کا کھا کر آج تو ہمیں ہی گالیاں دے رہا ہے۔"

وہ خبیث مسکرا کر ان کے پیر چھوتے ہوئے بولا۔ "موسی ہمکا معافی دیے دو۔ اب کبھو ایسا نہ ہوئے گا۔ تم پاکستان سے آئی ہو نا، پولس بھی تمرا ساتھ دیب۔"

خالہ کا تو ایک سیر خون بڑھ گیا۔ "لو بھلا یہاں کے بچے کتنے سیدھے سادے ہیں۔ ذرا دھمکاؤ فوراً دھمکی میں آ جاتے ہیں۔ کلاشنکوف نہیں دکھاتے۔" انہیں ذرا بھی شک نہیں ہوا کہ اس نے کس عیاری سے جواب دیا ہے۔ انہوں نے پیار سے پوچھا۔ "تیرے باپ کا کیا نام ہے؟"

وہ بولا۔ "موسی میں اچھوت کمار کا بیٹا ہوں"۔

تب وہ پیار سے بولیں۔ "جا کر اپنے باپ سے کہنا رفو پاکستان سے آئی ہے مل لے۔" اور وہ جے رام جی کہتا ہوا چلا گیا۔

جب ہم گھر آئے تو سب کو سہا ہوا پایا پھر ماموں نے گلا کھنکھارا اور بولے۔ "رفو اب

اس ملک کے وہ حالات نہیں رہ گئے ہیں کہ مسلمان اور خاص طور پر جوان لڑکیاں یوں بے پردہ سڑکوں پر گھومتی پھریں، تمہیں پتا ہے، وشو ہندو پریشد رتھ یاترا نکال رہی ہے۔ رتھ یاترا کا جلوس اس بات کا اعلان ہے کہ بابری مسجد کو شہید کیا جائے گا۔ اس جلوس میں مسلمانوں کے خلاف نعرے لگتے ہیں جس کی وجہ سے یہاں آئے دن ہندو مسلم فسادات ہوتے رہتے ہیں۔ یہ علاقہ تو ازحد مخدوش ہو چکا ہے۔ یہاں پڑوس کے ہندوؤں کے علم میں اگر یہ بات آ جائے کہ فلاں گھر میں اتنی جوان لڑکیاں ہیں تو گھات میں لگ جاتے ہیں۔ اندھیرے میں دشمن بن کر حملہ کرتے ہیں اور اجالے میں دوست بن کر افسوس کرنے آ جاتے ہیں۔" وہ رک کے پھر سانس لے کر بولے۔ "آج کا واقعہ بڑا ہی برا ہے۔ اچھوت کمار اور اس کا بیٹا کنہیا کمار بڑے ہی فسادی لوگ ہیں۔ بھس میں آگ لگانے والے۔ چور سے کہیں چوری کرو اور شاہ سے کہیں جاگتے رہو۔ ان کی ایسی ہی فطرت ہے۔"

خالہ حیران رہ گیں، یہ بڑے ماموں نہیں ایک کمزور لٹا پٹا بوڑھا بول رہا تھا جو زمانے کے سرد و گرم پر ماتم کناں تھا۔ پھر ماموں نے نظریں اٹھائیں اور سر جھکا کر بولے۔ "بیٹا! یہ ہندوستان مسلمانوں کے لیے ایسی قبر بن چکا ہے جہاں نہ آنے کا راستہ ہے اور نہ ہی جانے کا۔ تمہیں پتا نہیں ہے۔" وہ سانس لینے کو رکے "ابھی چند دن پیشتر رشید خان کے گھر ہندوؤں نے کس بری طرح لوٹ مار کی ہے کہ الفاظ ایسے بہیمانہ واقعات کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔"

"ماموں! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" خالہ نے اٹھتے ہوئے ان کی بات کاٹی۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"آج کے بھارت میں یہ سب ممکن ہے۔ اس کی جوان لڑکی آج تک نہیں ملی۔ اس کے پورے کنبے کو جلا کر کم بختوں نے خاک کر دیا۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ نوبت یہاں بھی آئے جس میں ہمارے کنبے کی عزت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔" ماموں نے اٹل لہجے میں کہا۔

"ماموں آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ نفرت کی آگ ہمارے یہاں بھی پہنچ گئی؟" خالہ نے افسردگی سے کہا۔

تب ماموں نرم لہجے میں بولے۔ "بیٹا وقاص نے کنہیا کمار سے جھگڑا کر کے اچھا نہیں کیا۔ یہ فسادی لوگ ہیں ضرور بدلہ لیں گے۔"

میں دل ہی دل میں بازار جانے پر اب تک شرمندہ تھا۔ خالہ ہنس کر جھینپ مٹانے کو بولیں۔ "ارے نہیں ماموں! یہ سب ہمارے اپنے ہیں، ہمارے نوکر، ہماری پرجا یہ کچھ نہیں کر

سکتے، آپ فکر ہی نہ کریں۔"

"خالہ! بڑے ماموں سچ کہتے ہیں۔ مجھے بھی یہاں کی فضا عجیب عجیب سی لگتی ہے۔ ہندو عورتیں کس نفرت سے ہمیں دیکھتی ہیں اور تھوک کر گزرتی ہیں۔" سلمٰی ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "میرا خیال ہے ہمارا یہاں زیادہ رکنا نقصان دہ ہوگا۔"

خالہ بھڑک اٹھیں۔ "ارے تمہارا دماغ تو صحیح ہے، ہوشوں میں تو ہو۔ یہ میری زمین ہے یہاں ہم نے ایک عرصے تک حکومت کی ہے۔ یہ چمار چوہاڑ ہمارے مزارعے ہیں ان کی اتنی ہمت کہاں کہ ہم پر ہاتھ ڈالیں۔"

تب بڑے ماموں نے ٹھنڈی آہ بھری گویا خالہ کو سمجھانا ہی بے کار تھا۔

پورے گھر میں عجیب سا کھنچاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ بڑی بھاوج علیحدہ منہ بنائے بیٹھی تھیں۔ گویا وقاص کے معاملے میں سارا قصور خالہ کا تھا۔ خالہ عجیب کجل کجل سی تھیں، بہو ساتھ تھی۔ خدا سے عزت کی دعا مانگتی رہتیں۔ رات پانی پینے اٹھا تو گھر میں ہو کا عالم تھا صرف ماموں میاں کے کمرے سے آوازیں آ رہی تھیں۔ میں خاموشی سے ادھر بڑھا تو میں نے سنا بڑی بھاوج ماموں میاں سے کچھ کہہ رہی تھیں پر کیا سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ تب میں نے دروازے کے نزدیک پہنچ کر پوری قوت سماعت کا استعمال کیا۔

بڑی بھاوج کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دی۔ "ماموں میاں! آپ رفو سے بولیں کہ گاؤں کی فضا پاکستانیوں کے حق میں نہیں ہے۔ مجھے کلیم بتا رہا تھا کہ کسی بھی وقت ہندو حملہ کر سکتے ہیں۔ ان سے بولیں کہ یہ لوگ پاکستان واپس چلی جائیں۔ کہیں ان کی وجہ سے ہمیں کوئی بھاری نقصان نہ اٹھانا پڑ جائے۔"

وہ سخت غصے میں بھری لگتی تھی۔ تب مجھے لگا کہ میرے سر پر کسی نے پہاڑ گرا دیا ہو۔ خالہ کی محبتوں کا، ریاضتوں کا ان لوگوں نے یہ صلہ دیا۔ وہ اتنی دور سے ان لوگوں کو دیکھنے، ان سے ملنے آئی تھیں۔ وہ بھی کتنی پاگل تھیں، کتنی نادان تھیں، ان کی محبتوں میں پاگل ہو گئی تھیں۔ یہ لوگ تو ڈرے، سہمے، بزدل لوگ ہیں جو محبتوں کے مفہوم سے بھی ناآشنا ہیں۔ میں نے انتہائی نفرت سے سوچا اور فوراً دروازے سے ہٹ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

رابیل سینے کے نیچے تکیہ لگائے اوندھا لیٹا تھا۔ شاید وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا میں نے کمرے میں پہنچتے ہی خود کو بستر پر گرا دیا۔ آہٹ پا کر وہ بولا "تم نے غور کیا؟"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں مسلمانوں کو تیسرے درجے کے شہری حقوق بھی حاصل نہیں ہیں۔ میرا دل بہت دکھی ہے۔ بس کسی طرح پاکستان پہنچ جائیں تو پھر لعنت بھیجنے بھی یہاں نہیں آؤں گا۔"

میں سمجھ گیا کہ اس نے بہت زیادہ اثر لیا ہے۔ اس کی ذہنی رو کو بدلنا ضروری تھا میں نے اس سے کہا "میاں بھائی! زیادہ مت سوچو ہم یہاں مہمان ہیں۔ یہاں والے اس کے عادی ہیں۔"

"میں یہی تو سوچ رہا ہوں کہ یہاں کے مسلمان کیسے جی رہے ہیں۔"

"ان باتوں کو چھوڑو، تم اپنی ادھوری روداد سناؤ، جہاں سے چھوڑی تھی وہیں سے سنانا شروع کردو۔"

"دل پر عجیب سا بوجھ ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ یہاں کچھ ہونے والا ہے۔"

"یار کہا ناں کہ ان باتوں کو گولی مارو، اپنی روداد سنانا شروع کردو۔ غضب کا تجسس ہے۔ آگے کیا ہوا یہ تو بتاؤ۔" میں اس کے ذہن پر چھائے غم کے بادل کا رخ موڑنا چاہتا تھا۔

"میرا دل تو نہیں تھا مگر جب بضد ہو تو سنو..... آصفہ نے چیخ کر کہا "پوزیشن لے لو۔" اور اس نے واپس غار میں چھلانگ لگا دی اس کے پیچھے نجمہ اور میں نے بھی جمپ لگا دی۔ ہم نے وہاں پہنچتے ہی اپنی کلاشنکوف اٹھا لئے۔

"مٹا دے آصفہ ان سب کو مٹا دے، لاشیں بچھا دے، ایک بھی شخص زندہ نہ بچے۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "سوچ کیا رہی ہے نجمہ گرینڈوں کی بارش سے پورے علاقے کو جلا کر خاک کر دے۔ اس پورے گروہ کو ختم کر دے جس نے ہم سے ہماری شگفتہ چھینی ہے۔"

آصفہ نے گرینڈ کا پن دانتوں سے کھینچا اور دشمنوں کی جانب اچھال کر بولی۔

"تیرے ہاتھ دھیمے چل رہے ہیں نجمہ۔ لے گرینڈ کا تھیلا تو پکڑ اور کلاشنکوف مجھے دے۔"

نجمہ نے برسٹ مارتے ہوئے کہا۔ "نہیں آصفہ، مجھے کلاشنکوف کا تجربہ ہے گرینڈ کی پن مجھ سے نہیں کھلے گی۔ میں اسی کے سہارے انتقام لوں گی۔"

ہم سب پر جنون سوار تھا۔ پورا علاقہ دھماکوں سے گونج رہا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ دو ملکوں کی فوجیں ٹکرا گئی ہوں۔

ہم آنسو بہاتے، چیختے چلاتے ہوئے سہیل کے گرگوں پر قیامت ڈھا رہے تھے۔ آدھے سے زیادہ دشمن مارے جا چکے تھے باقی بھی میدان چھوڑنے کی فکر میں پیچھے کھسک رہے تھے کہ میری نظر دور سے آتی گاڑیوں کی قطار پر پڑی۔ میں نے آصفہ کو دکھایا۔ آصفہ کچھ کہتی کہ

آنے والی گاڑیاں رک گئیں اور وہیں سے میگا فون پر کسی نے کہا ”خبردار تم سب گھیرے جا چکے ہو۔ پولیس نے پورے علاقے کو گھیر لیا ہے۔ ہتھیار پھینک کر ہاتھ اٹھا دو۔“

آصفہ نے چیخ کر کہا۔ ”بھاگو...... پیچھے کی جانب بھاگو۔“

ہم تینوں غار کی اندر کی جانب دوڑے۔ اندھیرے غار میں اسلحوں کے ساتھ دوڑنا آسان نہ تھا مگر گرفتاری کا خوف بھاگنے پر مجبور کیے جا رہا تھا کہ آصفہ ٹھوکر کھا کر گری، میں نے جلدی سے گیس لیٹر روشن کر دیا۔ ہلکی روشنی پھیلتے ہی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ چھپنے کی جگہ نظر آ گئی تھی۔ داہنی جانب ایک اور دراڑ تھی۔ میں اسی میں داخل ہو گیا۔ لائٹر کی ہلکی روشنی میں دراڑ کافی لمبی نظر آئی۔ آگے آگے میں اور پیچھے پیچھے وہ دونوں۔ ہم آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے کہ ہلکی روشنی نظر آئی۔ ہم نے قدم تیز کر دیئے۔ روشنی کے مخزن کو دیکھتے ہی میں پھر مسکرا اٹھا۔

غار کا دوسرا دہانہ پہاڑ کی دوسری جانب تھا۔ یہاں سے فرار نسبتاً آسان تھا مگر ہم نے قدم باہر نہیں نکالے۔ آصفہ کا خیال تھا کہ پولیس پہاڑی کے اوپر چڑھ کر جائزہ لے رہی ہوگی۔ ہم اندر ہی بیٹھ گئے۔ وقت گزرتا گیا۔ آہستہ آہستہ سورج اپنی منزل کی جانب سرکتا رہا اور پھر اندھیرا پھیل گیا۔

”اب نکل چلو“ آصفہ نے کہا۔

ہم تینوں باہر نکل آئے۔ باہر آ کر میں ناک کی سیدھ میں بڑھتا رہا۔ کافی دور آنے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا اور کھٹک گیا اب تک میں سمجھ رہا تھا کہ ہم پہاڑی کی دوسری جانب پہنچ گئے ہیں لیکن یہ بات غلط ثابت ہو گئی تھی۔ ہم اسی جانب تھے جہاں سے چلے تھے فرق تھا تو صرف فاصلے میں پہلے والے غار سے کافی فاصلے پر ہم کھڑے تھے۔

”اب انتظار کس کا ہے؟“ آصفہ نے پوچھا۔

”سوچ رہا ہوں کدھر جاؤں؟“

”پولیس والے زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ کہیں آس پاس ہی ہوں گے۔ اس لئے ہمیں اسی بلڈنگ میں پناہ لینا چاہئے جہاں قید تھے۔“

”واہ بہت خوب خود ہی شیر کی کچھار میں کود جائیں۔“ نجمہ نے کہا۔

”بے وقوف ابھی وہاں کوئی بھی نہ ہوگا۔ پولیس کے خوف سے ادھر کوئی بھی نہ گیا ہوگا۔“ آصفہ نے جھڑکا۔

”آصفہ ٹھیک کہتی ہے۔“ میں نے ادھر ہی قدم بڑھا دیئے۔

کچھ دور گیا تھا کہ مجھے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ میں چونک گیا۔ ایک چھوٹے سے گڑھے میں شگفتہ دبکی بیٹھی تھی۔ میں نے گھبرا کر آصفہ کو آواز دی۔ ”شگفتہ! شگفتہ کو باہر نکالو۔“

نجمہ اور آصفہ نے اسے کھینچ کر باہر نکالا۔ وہ بری طرح زخمی تھی۔

جگہ جگہ سے خون رس رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”تمہیں گولی لگی ہے کیا؟“

”نہیں!“ وہ کراہی ”گرنیڈ کی بارش میں میں لڑھکتی ہوئی پہاڑی سے گری تھی۔ نوکیلے پتھر، جھاڑیوں کے کانٹے وغیرہ چبھے ہیں۔“

وہ نجمہ اور آصفہ کا سہارا لئے آگے ہی بڑھتی جا رہی تھی۔

ہم سب اسی عمارت میں پہنچے۔ وہ عمارت خاموشی کی چادر میں لپٹی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ادھر کوئی آیا ہی نہیں ہے۔ ہم سب اس سنسان عمارت میں داخل ہو گئے۔ پہلا کمرا پار کر کے جب ہال میں پہنچے تو میں چونک گیا۔ فرش میں لگا ایک چوکور تختہ اٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس میں جھانکا۔ دور تک سیڑھیاں اترتی چلی گئی تھیں یقیناً وہ تہ خانہ تھا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر آصفہ وغیرہ کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور نزدیک بلانے کے لئے ہاتھ ہلایا، وہ قدم بہ قدم آہستہ آہستہ نزدیک آ گئیں۔ سیڑھیاں دیکھ کر حیرت کا سایہ ان کے چہروں پر بھی چھا گیا۔

میں نے اشارے سے انہیں نیچے اترنے کو کہا اور خود بھی اترنے لگا۔ نیچے پہنچ کر مجھے پھر ایک بار حیرت کا جھٹکا لگا۔ جتنے کمرے اوپر تھے اتنے ہی نیچے۔ ہم ہال نما کمرے میں کھڑے ادھر دیکھ ہی رہے تھے کہ شگفتہ پاپا پاپا کہتی ہوئی ایک جانب دوڑی، اس کے پیچھے ہم سب بھی دوڑے۔ ہال کے ایک کونے میں ایک بڑا سا پنجرہ بنا ہوا تھا۔ اس لوہے کے پنجرے میں عثمانی بند تھا، ہم نے سمجھ رکھا تھا کہ وہ مر چکا ہے لیکن وہ زندہ تھا۔ وہ ہمیں اس طرح دیکھ رہا تھا گویا ہم آٹھواں عجوبہ ہیں۔ اس نے چیخ کر پوچھا۔

”تم لوگ یہاں کیسے پہنچے؟“

”ہماری بات چھوڑیں یہ بتائیں اس میں دروازہ تو ہے ہی نہیں آپ کو داخل کیسے کیا گیا تھا؟“ آصفہ نے کہا۔

”سامنے سوئچ بورڈ پر ایک بٹن ہے اسے دباتے ہی سلاخیں اوپر اٹھ جاتی ہیں۔“ عثمانی بولا۔

میں نے آگے بڑھ کر سوئچ بورڈ پر لگے قطار در قطار بٹنوں میں سے ایک دبایا۔ پنجرے

کی سلاخیں کیا اٹھیں ایک دوسرا خفیہ دروازہ کھل گیا۔ سامنے ہی سفید پاؤڈر سے بھری چھوٹی چھوٹی سی تھیلیاں تھیں۔

''ارے یہ تو ہیروئن کی تھیلیاں ہیں۔'' آصفہ نے ایک تھیلی اٹھا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''تقریباً تیس کروڑ کی ہیروئن ہوگی۔'' نجمہ نے خیال ظاہر کیا۔

''لیکن ہمارے لئے بیکار ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''بیکار! ارے بے وقوف، تیس کروڑ کی رقم معمولی نہیں ہے۔ سوچ کر دیکھو اس سے کیا نہیں ہوسکتا۔ ہم شہنشاہ بن کر رہیں گے۔'' پھر اس نے نجمہ کی جانب مڑ کر پوچھا۔ ''تیرا کیا خیال ہے نجمہ؟''

''جس کے دماغ میں تیس کروڑ کو ٹھکرا دینے کی بات آئے اس کے لئے پاگل خانہ ہی صحیح ہے۔'' پھر اس نے مڑ کر مجھ سے کہا۔ ''ویسے بھی ہمارا منصوبہ ہے کہ اس عمارت کو منہدم کر دینا ہے تاکہ پھر یہاں مجرموں کا اڈہ بن نہ سکے۔''

''یہی تو میں کہنا چاہتی ہوں۔ لوگ روپے کے لئے جانے کیا کیا کرتے ہیں کوئی بینک لوٹتا ہے، کوئی قتل کرتا ہے، کوئی ٹھگ بن کر لوگوں کو ٹھگتا ہے۔ اتنا رسک لے کر کماتے ہیں؟ لاکھ؟ دولاکھ؟ جبکہ یہاں تیس کروڑ کا مال ہے۔''

''پاپا کو پنجرے سے باہر نکالنے کے بارے میں بھی تو کچھ سوچو۔'' شگفتہ جو ابھی تک چپ تھی جھلا کر بولی۔

''سوچ لیا ہے۔'' آصفہ بولی۔ ''الٹے بٹن دبانے سے کیا فائدہ، پتا نہیں کس بٹن کا سلسلہ کس سے منسلک ہے، کوئی بٹن ڈائنامیٹ سے بھی منسلک ہوسکتا ہے۔ ادھر ہم نے غلطی سے دبا دیا۔ ادھر بلڈنگ کے پرخچے اڑ گئے، ساتھ میں ہم بھی۔ اس لئے انہیں وہی باہر نکالے گا جو ان بٹنوں کے بارے میں جانتا ہے اور اسے لے کر آئے گا میرا شیر۔'' اس کا اشارہ میری جانب تھا۔

میں فوراً باہر نکل گیا۔ مجھے یقین تھا کہ تہ خانے میں کوئی نہ کوئی ضرور ہوگا۔ ادھر ادھر بھٹکتا اس کمرے سے اس کمرے میں جھانکتا آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک بند دروازے پر پہنچ کر ٹھٹکا، اندر سے باتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

میں نے دروازے سے کان لگا دیئے۔ آواز کی پہچان ہوتے ہی میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ میں نے مشین پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا پھر میں نے دستک دی۔ کچھ توقف کے بعد دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولا تھا خود سہیل نے میں نے بلا توقف اس کے سینے پر پستول رکھ دیا

اور اندر کی جانب دھکیلا۔ کمرا بالکل خالی تھا۔ ایک جانب وائرلیس سیٹ تھا یقیناً وہ اس پر کسی سے مخاطب تھا۔ میں نے حکم دیا ''چلو باہر نکلو۔''

اسی وقت چار مسلح شخص کمرے میں داخل ہوئے، آتے ہی انہوں نے سیلوٹ کیا پھر بولے۔ ''باس! ہال میں کچھ اجنبی گھس آئے ہیں۔ ہم انہیں شارٹ سرکٹ ٹی وی کیمرے سے اسکرین پر دیکھ رہے ہیں۔ ان کے بارے میں کیا حکم ہے۔''

میں نے طنز کیا ''وہ تہہ خانے میں گھس آئے ہیں اور تم ذرا بھی گھبرائے ہوئے نظر نہیں آرہے ہو، وجہ؟''

ان میں سے ایک بولا۔ ''وہ آئے اپنی مرضی سے ہیں مگر جائیں گے ہماری مرضی سے اب تک اوپر کا دروازہ لاک ہو چکا ہوگا۔''

''لیکن آپ ہیں کون؟ باس کی موجودگی میں آپ کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔''

''میں یہ ہوں۔'' کہتے ہوئے میں نے اسے پستول دکھایا اور پھر سہیل کی پیٹھ سے لگا دیا۔ سارے لوگ بوکھلا گئے۔ تبھی میں نے دیکھا۔ ان میں سے ایک اپنی جیب کی جانب ہاتھ بڑھا رہا ہے۔ میں نے غراتے ہوئے کہا۔ ''خبردار! اگر میری لاش کے ساتھ اپنے باس کے بھی چیتھڑے دیکھنا چاہتے ہو تو کرو فائر۔''

اس شخص کے ہاتھ جہاں کے تہاں ٹھٹک گئے۔ چہرے پر حیرت کا سمندر امنڈ آیا تھا۔

''تم نے پہچانا نہیں پیارے میں ان کا چوتھا ساتھی ہوں ہم چھ تھے دو شہادت کا جام نوش کر چکے ہیں اور چار مرنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔''

اس شخص نے جواب نہیں دیا۔ وہ سہیل کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے وہ معلوم کرنا چاہتا ہو کہ اگلا قدم کیا ہوگا۔ تبھی میں نے کہا۔ ''چلو، نہ تمہاری مرضی نہ میری اس بات کا فیصلہ اب تمہارا باس کرے گا۔'' پھر میں نے سہیل سے کہا۔ ''ہاں تو مسٹر باس کیا ہونا چاہیے؟'' بات ختم کرتے ہی میں نے پستول کی نال چبھائی۔

سہیل نے گھبرا کر کہا۔ ''انہیں ...... انہیں کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ ہمارا یہ حکم کنٹرولر کو دے دو۔ وہ فوراً مین بورڈ کے سامنے سے ہٹ جائے وہ جو کرتے ہیں کرنے دو۔''

وہ شخص ہنوز کھڑا تھا۔ میں نے پھر چیخ کر کہا۔ ''سنتے نہیں ہو تمہارا باس کیا بک رہا ہے؟''

اس کا چہرہ غصے میں سرخ ہوگیا۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ مجھے پیس کر رکھ دیتا۔ میں نے

سہیل کی گردن پر پستول کا دباؤ ڈالا پھر سے حکم دو۔"

سہیل تیز لہجے میں بولا۔"گدھے فوراً کنٹرولر کو حکم دو۔" اس شخص نے جیب سے کارڈلیس فون ٹائپ کا چونگا نکالا اور پھر رابطہ ملا کر بولا۔"باس کا حکم ہے کہ ان لوگوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔"

"لیکن صفدر!" دوسری جانب سے آواز آئی۔"وہ پنجرہ کھولنے کی لگاتار کوشش کر رہے ہیں۔"

صفدر پہلے ہی غصے میں ابل رہا تھا وہ دہاڑ اٹھا۔"بہرے ہو گئے ہو یہ حکم میرا نہیں باس کا ہے اگر وہ پوری عمارت کو بھی اڑا دینا چاہیں تو انہیں مت روکنا۔"

میں نے سہیل کی گردن میں پستول چبھوئی۔"تم بھی سمجھ لو اور اپنے آدمیوں کو بھی سمجھا دو کسی قسم کی چالاکی میں برداشت نہیں کروں گا۔اب ناک کی سیدھ میں چلنا شروع کر دو۔"

میرا حکم سنتے ہی اس نے سب کو قطار میں آگے بڑھنے کا حکم دیا تبھی صفدر کے ٹرانسمیٹر سے بپ بپ کی آواز سنائی دی۔اس نے ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھا۔

"سن لو کیا کہتا ہے تمہارا گرگا؟" میں نے اشارہ کیا۔

صفدر نے کارڈلیس فون کی شکل والے ٹرانسمیٹر کو آن کر دیا۔

"لیس!" دوسری جانب سے آواز آئی۔"وہ متواتر کوشش کر رہے ہیں ان کے بارے میں کیا حکم ہے؟"

"میں نے کہا نا وہ جو کر رہے ہیں کرنے دو، یہ باس کا حکم ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ باس ایسا حکم کیوں دے رہے ہیں؟"

"ہم ہال کی جانب جا رہے ہیں۔"

"ادھر تو تین خطرناک لڑکیاں ہیں، ان کے ساتھ ایک مرد بھی تھا جو اب نظر نہیں آ رہا ہے۔یقیناً وہ پاس ہی گھات لگائے بیٹھا ہوگا۔"

"بے وقوف! اسی نے تو باس کو کور کر رکھا ہے اور ہم سب اسی کا حکم ماننے پر مجبور ہیں، اوور اینڈ آل۔" صفدر نے غصے میں سوئچ بند کر دیا۔

ہم سب چل پڑے۔میں پوری طرح ہوشیار تھا۔پستول سہیل کی گردن پر تھا۔یکا یک مجھے احساس ہوا کہ سہیل اگر چلتے چلتے بیٹھ گیا تو اس کے آدمیوں کو موقع مل جائے گا۔میں نے فوراً دوسری جیب سے دوسرا پستول نکال لیا اور اسے سہیل کی کمر پر رکھ دیا۔اب وہ چالاکی دکھانے کی

کوشش بھی کرتا تو موت مقدر بن جاتی۔دو میں سے ایک بھی پستول کام دکھا دیتا۔اس بات کو وہ بھی سمجھ رہا تھا اسی لیے اچھے بچے کی طرح بڑھتا جا رہا تھا یکا یک مجھے صفدر کی داہنی کمر کچھ پھولی پھولی لگی۔میں نے چلتے چلتے کہا۔"مسٹر صفدر، میرے قریب آؤ۔"

وہ غصے میں ابلتا ہوا قریب آ گیا۔میں نے داہنا پستول پھر اپنی کمر میں اڑس لیا اور سرعت سے اس کی شرٹ کو اٹھا کر پستول کھینچ لیا پھر بولا۔"اگر کسی اور کے پاس کوئی ہتھیار ہے تو اسی جلد پھینک دے ورنہ میں گولی چلا رہا ہوں۔"

اپنے باس کی حفاظت کے خیال سے انہوں نے فوراً حکم پورا کر دیا۔میں نے پھر آگے بڑھنے کا حکم دیا۔

ہال میں داخل ہوتے ہی میں نے کہا۔"تھینک یو مسٹر صفدر تم میرے سفر کے ساتھی تھے اور سفر کے ساتھی کو منزل تک لے جانا عقلمندی نہیں۔یہاں سے آگے صرف تمہارا باس جائے گا۔"

صفدر نے جواب نہیں دیا۔

"لاؤ اپنا ٹرانسمیٹر مجھے دو۔"

اس نے فوراً بڑھا دیا۔میں نے سرعت سے دروازہ بند کیا اور اسی پھرتی سے پھر سہیل کو کور کر لیا۔مجھے دیکھتے ہی نجمہ چیخی۔"واہ میرے شیر! تو نے آدھا معرکہ سر کر لیا۔"

تبھی سہیل چیخا۔"یہ...... یہ دروازہ کیوں کھلا ہے۔اس میں میرا اسٹاک تھا وہ کہاں گیا؟"

"ادھر ہے میرے پیارے انکل!" نجمہ نے اپنا ایئر بیگ کھول کر دکھایا۔"اتنا ہی دوسرے تین بیگوں میں بھی ہے۔جسے ہم ساتھ لے جائیں گے۔"

"ہاں تو میرے پیارے انکل ذرا اپنے دست مبارک سے عثمانی انکل کو بھی آزاد کر دیں۔"

سہیل کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرا گئی جو اس بات کی نشاندہی کر رہی تھی کہ اس کا دل پسند کام مل گیا ہے۔وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا سوئچ بورڈ کے پاس پہنچا پھر اس نے مسکرا کر ہم سب پر باری باری سے نظر ڈالی اور مڑ کر داہنی جانب کی دیوار پر ٹنگی ایک تصویر پر نظر ڈالی۔میری نگاہیں بھی ادھر ہی گھوم گئیں۔تب میں نے غور کیا کہ اس تصویر کے درمیان میں بنے دائرے میں کچھ چمک رہا ہے۔پل بھر میں میری سمجھ میں بات آ گئی۔ٹی وی کیمرے کا لینس تھا یقیناً دیوار میں کیمرا نصب تھا ابھی میں کچھ کہتا کہ سہیل نے وکٹری کا اشارہ دیا۔اس کی دو انگلیوں کا

اٹھنا تھا کہ ایک معجزہ سا ہو گیا۔ پلک جھپکتے ہی سہیل غائب ہو گیا۔ ایسا لگا تھا کہ اسے زمین نے نگل لیا ہو۔ میں نے فوراً چھلانگ لگائی تھی لیکن تب تک زمین برابر ہو چکی تھی۔

''اوہ چوک ہو گئی۔'' میں بڑبڑایا۔ ''سوئچ بورڈ کے نیچے خفیہ راستہ تھا جسے اس نے فرار کے لیے استعمال کیا ہے۔''

''لیکن اس نے تو سوئچ بورڈ میں ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔'' شگفتہ بولی۔

''ضرور کنٹرولر نے یہ کام انجام دیا ہے۔ اس کیمرے سے ہم کنٹرولر کو اسکرین پر نظر آ رہے ہیں۔'' میری آواز میں فکرمندی تھی۔

جواب میں کوئی کچھ نہ بولا۔ ہر ایک کے چہرے پر فکرمندی تھی۔ اسی وقت ہال میں قہقہہ گونجا۔ یہ آواز صفدر کی تھی جو ہر دیوار سے پھوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ہم سب احمقوں کی طرح گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگے تھے۔ یکایک قہقہہ رک گیا۔ گہری خاموشی چھا گئی ایسی خاموشی کہ ہمیں ایک دوسرے کی سانس کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ کچھ پل بعد صفدر کی بھاری آواز سنائی۔ ''اب میں تمہیں بتاؤں گا کہ میرے ہیڈ کوارٹر میں قدم رکھنے کا انجام کیا ہوتا ہے۔ سب سے پہلے میں اسے ختم کروں گا جسے آزاد کرانے تم آئے تھے۔''

''نہیں!'' شگفتہ بے ساختہ چیخ پڑی۔

''میں پنجرے کی سلاخوں میں بجلی دوڑا رہا ہوں۔ تم سب کے سامنے رک رک کر بجلی کے جھٹکے دوں گا اور وہ تمہاری نظروں کے سامنے تڑپ تڑپ کر مرے گا اگر بچا سکتے ہو تو اسے بچا لو۔''

آصفہ سوئچ بورڈ کی جانب لپکی اور ہم سب پنجرے کی جانب ہم نے ساتھ لائے بندوقوں کو الٹی طرف سے پکڑ کر احتیاط سے مگر پوری قوت سے سلاخوں پر مارنا شروع کیا۔ سب ہوشیار تھے۔ ہماری کوشش تھی کہ نال پنجرے سے نہ ٹکرائے صرف بٹ کی ضرب سلاخوں پر پڑے۔ پنجرے کے اندر بند عثمانی گیند کی طرح اچھل رہا تھا۔

''بے کار ہے آصفہ۔'' مخفی مائک سے سہیل کی آواز ابھری۔ سوئچ بورڈ کا ایک بھی بٹن کام نہیں کر رہا ہے۔ ہم نے کنٹرول روم سے سب کو ڈسکنکٹ کر دیا ہے۔''

آصفہ گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ تمام کوششیں ناکام ثابت ہو چکی تھیں۔ تبھی نجمہ نے چیخ کر کہا۔ ''سہیل! ہم سرینڈر کر رہے ہیں۔ ہمارا پلہ برابر ہے۔ جس طرح تم اس وقت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، جب تک ہیروئن ہمارے قبضے میں ہے، اس طرح ہم بھی مجبور ہیں کہ عثمانی انکل تمہارے قبضے میں ہیں۔''

''یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ تمہیں ختم کر کے بھی ہم ہیروئن حاصل کر سکتے ہیں۔''

سہیل نے جواب دیا۔ ''پھر بھی میں تم لوگوں کو موقع دوں گا اگر کچھ کر سکتے ہو کر لو۔''

''اگر پاپا کو کچھ ہو گیا تو میں تمہارے ہیڈ کوارٹر کے پرخچے اڑا دوں گی۔'' شگفتہ نے بھی چیخ کر کہا۔

سہیل نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ڈرا رہی ہو؟ ادھر دیکھو عثمانی کا دم نکلنے میں اب کچھ ہی دیر باقی ہے..... لو وہ تو بہت جلدی مر گیا۔''

میری نظریں عثمانی پر جم گئیں۔ وہ خاموش پڑا تھا۔ جسم کے کھلے ہوئے حصوں پر جا بجا جلنے کے نشان تھے۔

''لو ان کی لاش کا تحفہ!'' سہیل کی قابل نفرت آواز گونجی اور پھر پنجرہ کھل گیا۔ شگفتہ ادھر کو دوڑی تھی کہ آصفہ نے کہا۔ ''خبردار پنجرے کے نزدیک بھی مت جانا۔ وہ کمینگی دکھا سکتا ہے۔''

شگفتہ آگے بڑھتے بڑھتے رک گئی۔ آصفہ نے ایک کرسی اٹھا کر پنجرے کی سمت بڑھتے ہوئے کہا۔ ''میں اس کے ذریعے باہر نکالنے کی کوشش کرتی ہوں۔ بہ مشکل دو قدم بڑھی ہو گی کہ کمرے کا فرش گھومنے لگا۔ گردش کرتا فرش دم بہ دم نیچے جا رہا تھا۔ ہمیں حیرت تھی کہ ویرانے میں بنی یہ عمارت ہے کہ جادوئی پٹارا۔ تہ خانہ اور اس کے نیچے مزید خلا؟ آخر اس کی انتہا کہاں ہے؟

تبھی آصفہ چیخی۔ ''ہوشیار، اوپر جانے والی سیڑھیاں پکڑ کر لٹکو ورنہ ہم سب قید ہو جائیں گے۔''

''ہو جانے دو۔'' شگفتہ دہاڑی ''میں بھی دیکھنا چاہتی ہوں کہ وہ حرام زادہ ہمیں کون سی اذیت دینا چاہتا ہے۔''

''پاگل ہو گئی ہے کیا۔ دیکھ فرش گردش کرتا ہوا نیچے جا رہا ہے۔''

''ہاں، ہاں میں پاگل ہو گئی ہوں۔ اس وقت تک مجھے چین نہیں ملے گا جب تک میں اس کمینے کا خون نہیں پیوں گی۔'' شگفتہ نے دانت کچکچایا۔

''شگفتہ!'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ سہیل سے انکل کا بدلہ ضرور لوں گا پھر یہ عقلمندی بھی نہیں ہے کہ خود ہی پھانسی پر چڑھ جاؤ۔ بدلہ لینے کے لیے ہمیں آزاد رہنا ہو گا۔''

میری باتوں کا خاطر خواہ اثر ہوا سب کے سب گردش کرتے فرش پر کھڑے ہو کر اپنا توازن قائم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سیڑھیوں کی جانب بڑھ رہے تھے۔ فرش آخری سیڑھی سے کئی ہاتھ نیچے آ چکا تھا۔ میں نے اچھل کر شگفتہ کو لات ماری وہ لڑھکتی ہوئی سیڑھیوں کے نزدیک

پہنچ گئی۔ آصفہ نے بھی لڑھکتی کھاتے ہوئے اس جانب بڑھنا شروع کر دیا۔ نجمہ اور میں نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔ تب تک سیڑھی کافی اوپر پہنچ چکی تھی۔ میں نے اچھل کر سیڑھی کو پکڑ لیا اور چیخا۔

''میری ٹانگ پکڑ کر لٹک جاؤ میں بازوؤں پر وزن ڈال کر اوپر چڑھ جاؤں گا۔''

نجمہ فوراً میرے پیرے سے لٹک گئی۔ آصفہ نے شگفتہ سے کہا۔ ''چل جلدی کر ورنہ اس کا پیر بھی رینج سے باہر ہو جائے گا۔''

واقعی حالات وہی تھے فرش لمحہ بہ لمحہ نیچے جا رہا تھا۔ اس کی گردش اتنی تیز تھی کہ کھڑا ہونا مشکل تھا۔

شگفتہ نے کوشش کی۔ کئی بار اچھلی لیکن آصفہ کا پیر بھی اس کی پہنچ سے دور رہا۔ ہر چکر کے بعد جب وہ ہمارے قریب آتی اچھل کر پکڑنے کی کوشش کرتی لیکن ناکام رہتی۔

ہم سب اسے چیخ چیخ کر حوصلہ دے رہے تھے ہر بار وہ ہمت کرتی اچھلتی اور دھپ سے گر جاتی اب فرش اتنے نیچے جا چکا تھا کہ گہرے کنوئیں کا منظر پیش کر رہا تھا اور ہم سب زنجیر کی مانند ایک دوسرے کا پیر پکڑے لٹکے تھے۔ سب سے اوپر میں تھا یعنی سب کا وزن میرے ہاتھوں پر تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ اپنے بازوؤں پر وزن ڈال کر اوپر اٹھنے کی کوشش شروع کر دی۔ موت وزندگی کا سوال تھا۔ ایک ہلکی سی لغزش ہم تینوں کو موت کے منہ میں پہنچا دیتی۔ اللہ اللہ کرتے ہوئے میں نے اوپر اٹھنا شروع کیا۔

چیونٹی کی رفتار سے اوپر اٹھتے اٹھتے میں نے آدھا جسم اٹھا لیا۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ دو دو لڑکیوں کا بوجھ تھا پھر بھی خدا نے کامیابی عطا کی۔

نجمہ کا ہاتھ سیڑھی کے سرا تک پہنچ گیا تھا۔ اب مجھ پر وزن کچھ کم ہو گیا تھا باقی دھڑ بھی اوپر کھینچ کر میں نے جھک کر آصفہ کو پکڑ لیا نجمہ بھی فری ہو گئی۔ آصفہ کو اوپر کھینچنے کے بعد میں نے نجمہ کو بھی کھینچ لیا پھر نیچے فرش کی جانب دیکھا اتنا گہرا اندھیرا تھا کہ کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے آواز دی۔ ''شگفتہ!'' بازگشت کے علاوہ کچھ بھی سنائی نہ دیا۔

''باہر کی جانب بھاگو۔'' آصفہ نے کہا اور سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ہم تینوں ہال میں پہنچے اور پھر وہاں سے باہر۔ باہر نکلتے ہی ٹھٹک جانا پڑا...... دور سے آتی ہوئی گاڑیوں کی قطار نزدیک آتی جا رہی تھی۔

''ہم نے کچھ اسلحہ اوپر بھی تو چھوڑا تھا۔ انہیں اٹھا لاؤ۔'' آصفہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں دوڑتا ہوا ہال میں پہنچا صوفے پر پانچ کلاشنکوف اور گرینیڈ کی تھیلی رکھی ہوئی تھی اسے اٹھا کر سرعت سے واپس پلٹا۔ گرینیڈ کی تھیلی اور ایک کلاشنکوف آصفہ نے لے لی۔ ایک نجمہ نے لی۔ باقی کو میں نے اپنے کندھے پر لٹکا لیا۔

''پہاڑی...... اسی پہاڑی کی جانب دوڑو۔'' آصفہ نے دوڑ لگا دی ہم تینوں بھاگ رہے تھے کہ پیچھے سے فائر ہوا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ عمارت کے گیٹ پر صفدر اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ آگے بھی موت تھی اور پیچھے بھی۔ ہم لہراتے ہوئے داہنی جانب دوڑنے لگے۔ پہاڑی کے نزدیک پہنچنے تک ہم کئی بار برسٹ سے بچے تھے ہر بار گولیاں ہم سے چھو کر نکل جاتیں۔ ہم بچتے بچاتے اسی غار تک پہنچ گئے۔ اندر داخل ہوتے ہی ہم نے پوزیشن لے لی تھی۔

''انہوں نے ہمیں اس غار میں داخل ہوتے دیکھ لیا ہے۔ ان کا سارا زور ادھر ہی رہے گا۔ آصفہ! تم ایسا کرو کہ اندر ہی اندر دوسرے دہانے پر پہنچ جاؤ۔''

کہتے ہوئے وہ اندر کی جانب چل دی۔

''ٹھہرو!'' میں نے پکارا۔ ''تم ادھر رہو، میں ادھر جا رہا ہوں کیونکہ ادھر سے ہی زبردست حملہ کرنا پڑے گا۔ نجمہ تم بھی میرے ساتھ آؤ۔''

وہ میرے ساتھ آدھے دھڑ سے جھک کر آگے کی طرف دوڑنے لگی۔

ہم غار کے دوسرے دہانے پر پہنچے اور نشست باندھ کر بیٹھ گئے۔ سہیل کے گرگے فائرنگ کرتے ہوئے آصفہ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ آصفہ بھی رک رک کر جوابی برسٹ چلا رہی تھی۔ اس کی مدد کے لیے میں نے اور نجمہ نے بیک وقت فائر کیا۔

پہلے ہی برسٹ میں کئی دشمن ڈھیر ہو گئے۔ وہ سب بوکھلا گئے۔ شاید ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ فائرنگ کہاں سے ہوئی۔ جب تک ان کی سمجھ میں آتا مزید کئی لاشیں گر گئیں۔ باقی لوگوں نے پوزیشن لے کر میری جانب بھی برسٹ مارنا شروع کر دیا۔ میں نے نجمہ سے کہا۔ ''تم انہیں سنبھالو۔ میں رینگتا ہوا تیسرے غار کے دہانے پر جا رہا ہوں تاکہ وہ سمجھیں کہ ہم تعداد میں زیادہ ہیں۔''

''جاؤ'' اس نے پھر برسٹ مارا۔

میں سانپ کی مانند رینگ گیا۔ آگے بڑھتے ہوئے میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''انہیں معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ یہاں صرف ایک آدمی ہے۔''

''میں بے وقوف نہیں ہوں۔'' اس نے پھر ایک برسٹ مارا جواب میں دشمنوں نے

بھی برسٹ چلایا۔اس دوران میں، میں کافی آگے نکل آیا تھا۔میرے سامنے ایک بڑی سی چٹان تھی۔میں نے غار کے بجائے اس چٹان کی آڑ میں مورچہ بنانا زیادہ بہتر سمجھا۔وہ سب آصفہ اور نجمہ پر فائر کر رہے تھے کہ میں نے ان پر حملہ کر دیا۔پہلے ہی برسٹ میں سات آدمی خاک اور خون میں لوٹنے لگے اب تک ہم نے بیس سے زائد لاشیں گرادی تھیں مگر ان کا حوصلہ نہیں ٹوٹا تھا یوں بھی وہ گاڑیوں پر لد کر آئے تھے پھر اس عمارت کے تہ خانے میں بھی کچھ لوگ تھے۔وہ سب بھی ہمارے خلاف محاذ بنائے ہوئے تھے۔

میری فائرنگ سے باقی بچے ہوئے دشمنوں میں بھگدڑ مچ گئی۔انہیں بھاگتے دیکھ کر آصفہ جوش میں ہوش کھو بیٹھی اور دوڑتی ہوئی غار سے باہر نکل آئی۔رٹ۔رٹ......رٹ کی آواز سے پورا علاقہ گونج رہا تھا۔وہ گولیاں برساتی ہوئی کافی آگے نکل آئی اور پھر کلاشنکوف والا ہاتھ اٹھا کر چیخی۔"فتح"

ہم نے یہ مورچہ بھی فتح کر لیا۔مارے خوشی کے اس کا برا حال تھا۔وہ دوڑتی ہوئی میری جانب بڑھ رہی تھی کہ لاشوں کے درمیان سے فائر ہوا اور وہ سینہ پکڑ کر بیٹھ گئی۔لاشوں کے ڈھیر میں پڑے ایک زخمی نے اسے نشانہ بنا دیا تھا۔خون کا فوارہ سا ابل رہا تھا۔آصفہ نے سینے کے زخم پر ہاتھ رکھ کر خون روکنا چاہا تھا مگر خون کی دھار انگلیوں کے درمیان سے باہر نکل رہی تھی۔ہم سب اس کی جانب دوڑے۔نجمہ نے اسی دوران اس بدبخت دشمن کو چھلنی کر دیا تھا جس نے میری آصفہ کو نشانہ بنایا تھا میں نے نزدیک پہنچ کر اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔"بے وقوف یہ تو نے کیا کیا؟"

"بے وقوفی انسان سے ہی ہوتی ہے میرے دوست۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔"اور وہ لوگ کچھ زیادہ ہی بے وقوف ہوتے ہیں جنہیں خدا نے تیز دماغ عطا کیا ہے۔"

"تو گھبرا مت آصفہ میں تجھے بچا لوں گا۔"

"پاگل! وہ کراہنے کے انداز میں بولی۔"قسمت کا لکھا پورا ہو کر رہتا ہے۔موت برحق ہے اسے کوئی نہیں ٹال سکتا۔"

"نہیں آصفہ نہیں، تو مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتی ہو۔"

"کمال اور صادقہ نے ساتھ چھوڑا، شگفتہ بھی اب تک ماردی گئی ہوگی۔وہ سب مجھے بلا رہے ہیں۔مجھے جانا ہے میرے دوست۔"

"نہیں میں تجھے ہسپتال لے جاؤں گا۔"

"کے......سے" اس نے آخری جملہ کہا اور اس کا سر ڈھلک گیا۔

میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ سہیل کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔تبھی نجمہ نے کہا۔"اب ہمیں بھی علاقہ چھوڑ دینا چاہیے۔فائرنگ کی آواز سے پولیس متوجہ ہو چکی ہوگی۔"

"چلو!" میں نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا اور اس وین کی جانب بڑھنے لگا جس پر سوار ہو کر ہمارے دشمن آئے تھے۔ایک بڑی سی چٹان کے پیچھے وینوں کی پوری قطار تھی۔ان میں سے ایک پر ہم سوار ہو گئے۔نجمہ میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔میں تیز رفتاری سے سڑک پر آ گیا۔کچی سڑک پر وین دوڑاتے ہوئے ہم ابھی کچھ ہی دور گئے تھے کہ سامنے سے آتی ہوئی ایک کار نظر آ گئی۔اسے دیکھتے ہی میں چونک گیا۔وہ کار بلٹ پروف ہے اس کی خبر مجھے بھی تھی اسی لیے میں نے کلاشنکوف کے بجائے وین سے حملہ کر دیا۔اپنی وین کو لے جا کر اسے ٹکر ماری۔

میری وین اور وہ کار دونوں الٹ گئیں۔مجھے پورے بدن میں چبھن کا احساس ہوا مگر میں نے توجہ نہیں دی جوش نے ہر احساس کو ختم کر دیا تھا۔دوستوں کی لاشیں مجھے انتقام کے لیے پکار رہی تھیں۔

میں پھرتی سے باہر کودا اور اس کار کی جانب دوڑا کار میں سہیل اکیلا تھا یقیناً وہ کسی خاص وجہ سے آ رہا ہوگا میں نے کار کا دروازہ کھولنے کی بہت کوشش کی مگر کامیابی نہیں ملی۔سہیل اندر پڑا ٹک ٹک مجھے دیکھ رہا تھا۔اس کے چہرے پر خوف کی علامت تھی۔ایک جگہ سے شیشہ تڑکا ہوا لگا۔اس نشان پر میں نے نزدیک پڑے ایک بڑے سے پتھر کو اٹھا کر دے مارا۔

شیشہ چور چور ہو چکا تھا میں نے اندر ہاتھ بڑھا کر سہیل کو گھسیٹنے کی کوشش کی اور وہ مدافعت پر زور لگانے لگا۔کھینچ تان کر میں نے اسے باہر نکالا۔وہ بری طرح زخمی تھا۔میں نے اس کے بہتے ہوئے خون کو دیکھا اور پھر زوردار گھونسا جڑ دیا۔وہ لڑھکتا ہوا کئی فٹ دور جا گرا۔میں نے اسی بھاری پتھر کو اٹھا لیا جس سے کار کا شیشہ توڑا تھا۔پتھر کو ہاتھوں پر تولتے ہوئے میں نے پوچھا۔"بول کمینے، شگفتہ کہاں ہے؟"

"اسے......اسے ہم نے ختم کر دیا۔زندہ رکھتے مگر تم نے میرے بہت سارے تجربے کار لڑاکا کو ختم کر دیا تھا اسی لیے میں نے اسے زندہ رکھنا اپنی توہین سمجھی۔"

"اب تو بھی مرنے کے لیے تیار ہو جا۔" کہتے ہوئے میں نے پتھر سے وار کر دیا۔سر پر پتھر لگتے ہی اس کا سر پاش پاش ہو گیا۔

اس سے نمٹ کر میں نجمہ کی طرف آیا۔گاڑی ٹکرانے کی وجہ سے اس کا سر بھی پھٹ گیا تھا۔خون سے سیٹ سرخ ہو رہی تھی۔میں نے اس کی نبض دیکھی وہ بھی مر چکی تھی۔میں غصے میں

واپس پلٹا اور اس عمارت کو آگ لگا دی۔ ابھی میں اپنے کام سے فارغ بھی نہیں ہوا تھا کہ پولیس پارٹی نظر آ گئی۔ وہ سب شعلے دیکھ کر ادھر ہی آ رہے تھے میں نے انہیں دیکھتے ہی ہاتھ اٹھا دیے وہ مجھے گرفتار کر کے شہر لے آئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ لوگ مجھے اغوا کر کے لائے تھے مگر اس پر دوسری پارٹی نے حملہ کر دیا۔

پولیس والے بھی اس کیس کو ختم کرنے پر تیار بیٹھے تھے، شاید کچھ کو ان سے بھتہ ملتا تھا' مجھے تو ایسا ہی لگا تھا۔ اسی لیے انہوں نے رپورٹ میں میرا نام نہیں لکھا اور مجھے گھر چلے جانے کو کہہ دیا۔ تب سے میں ایک اچھے بندے کی طرح زندگی گزار رہا ہوں۔'' رابیل نے اپنی کہانی ختم کر کے میری طرف دیکھا۔

اس کی کہانی واقعی ایسی تھی کہ اگر کوئی لکھاری ہوتا تو وہ ناول لکھ ڈالتا۔ میں کہانی کا اثر ذہن سے اتارنے کے لیے باہر نکل آیا۔ سب سو رہے تھے۔ میں اس کمرے کی طرف چل پڑا جس میں خالہ ٹھہری ہوئی تھی۔ جیسے ہی میں اندر داخل ہونے کے لیے دروازے پر پہنچا کہ سلمٰی کی آواز آئی۔ ''خالہ۔''

''اوں اوں کیا ہے؟'' خالہ نے ہنکارا بھرتے ہوئے پوچھا۔

''میرا دل گھبرا رہا ہے مجھے مشکور یاد آ رہے ہیں۔ اپنا گھر جہاں مشکور کے قہقہے ہیں۔ اپنا ملک یاد آ رہا ہے جہاں نہ نیچ ہے نہ اونچ سب برابر ہیں۔ نہ وہاں ہندو مسلم جھگڑے کا خطرہ ہے۔''

خالہ نے تھوڑا سر اٹھا کر اسے دیکھا اور اس کی پیشانی چومتی ہوئی بولیں۔ ''نہ رو میری جان! ہم پرسوں واپس چلیں گے۔'' انہوں نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''جاؤ سو جاؤ!'' یہ کہتے ہوئے ان کا گلا بھی رندھ گیا تھا۔

ان سب کے ساتھ یہاں جو کچھ ہو رہا تھا یہی سب دیکھ کر خالہ بھی مایوس تھیں۔ آج سلمٰی نے کہا تھا وہ بات تو کئی دنوں سے میں خود کہنا چاہتا تھا۔ شاید خالہ بھی یہی کچھ کہنا چاہتی ہو مگر اس لیے نہ کہہ پا رہی ہوں کہ جس منہ سے ہندوستان کی تعریف کرتی تھیں اسی منہ سے اب یہاں والوں کی برائی کیسے کرتیں؟

پاکستان واپسی کے فیصلے پر پہنچ کر مجھے از حد سکون مل گیا۔ رات بڑی اچھی نیند آئی صبح آنکھ کھلتے ہی میں نے سب کے اترے ہوئے چہرے دیکھے، خالہ نے بڑی بھاوج کو نظر انداز کر کے ماموں میاں سے کہا۔ ''ماموں میں پرسوں جا رہی ہوں۔ اپنے ملک پاکستان۔''

وہ چونک اٹھے۔ ''کیا کہا' جا رہی ہو مگر کیوں؟''

خالہ نے جواب نہیں دیا۔ سلمٰی کی طرف مڑ کر بولیں ''پیکنگ کرو بیٹا! ہم واپس گھر چلیں گے۔ اپنے پاکستان جہاں صرف محبت کرنے والے بستے ہیں۔ اب تک مجھے اپنے ملک کی قدر نہیں تھی۔ سراب کے تعاقب میں بھاگ رہی تھی۔''

تبھی بڑی بھاوج اپنے کمرے سے نکلیں اور خالہ سے لپٹ کر رونے لگیں۔

''ارے..... ارے تمہیں کیا ہو گیا بھئی؟'' انہیں خود سے لپٹاتے ہوئے خالہ نے کہا۔

''وقاص..... وقاص'' ان کے منہ سے الفاظ پورے ادا نہیں ہو رہے تھے۔ وہ ان سے لپٹی پورے جسم سے کانپ رہی تھیں۔

''کیا ہوا ہے وقاص کو؟ بولو وقاص کو کیا ہوا؟'' خالہ نے انہیں جھنجھوڑا۔

''وہ..... وہ رات سے گھر نہیں آیا ہے۔''

''اے خدا خیر کیا کہہ رہی ہو؟'' خالہ سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ ''رشتے داروں کے یہاں معلوم کراؤ اس کے دوستوں سے پوچھو۔ گیا تو گیا کہاں؟'' وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ ''پولیس میں رپورٹ لکھاؤ تم لوگ اب تک بیٹھے ہو۔'' انہوں نے خاندان کے سارے لڑکوں، بزرگوں کے چہرے پر بے بسی محسوس کر کے غصے سے کہا۔

تب ماموں میاں بولے۔ ''ہر جگہ پتا کر لیا سب سے پوچھ لیا۔ کسی کو نہیں پتا کہ وہ کہاں گیا ہے؟ اور بیٹا! یہاں رپورٹ کرانا اتنا آسان نہیں؟'' انہوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''کس کا نام لکھوائیں؟ کس کو مجرم بنائیں؟ اگر کسی ایک کا بھی نام لکھوا دیا تو ہنگامہ ہو جائے گا۔'' وہ سخت اضطراب میں ہاتھوں کو مسلتے ہوئے بولے۔

''یہ کیا پاگل پن ہے۔ پتا نہیں لڑکا کس حال میں ہو..... چلو میں تھانے چلتی ہوں۔'' خالہ نے برقعہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

سب کے منع کرنے کے باوجود وہ ماموں میاں کو لے کر تھانے پہنچ گئیں۔ تھانے دار کے سوال پر انہوں نے کنہیا کمار اور وقاص کے جھگڑے کی روداد سنا دی، تبھی تھانے دار نے خالہ طرف گھور کر دیکھا اور ماموں میاں سے انتہائی بدتمیزی سے بولا۔ ''اے بڈھے! تو خود نہیں آ

سکت رہے جو ایک عورت کو مدد کے لیے لائے ہو۔'' اس نے خالہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حقارت سے کہا اور پھر خالہ سے بولا۔ ''سن تو پاکستانی ہے، تیری خیریت اسی میں ہے کہ ہمرے ملک کے باسیوں کے بارے میں انٹ شنٹ مت بک ورنہ۔''

خالہ کا دماغ گھوم گیا۔ وہ غرا کر بولیں۔ ''نمک حرام! تجھے بزرگوں سے بات کرنا نہیں

آتی۔ تیری ماں نے تمیز نہیں سکھائی۔ تجھے خیال رہے کہ بزرگوں سے بات کیسے کی جاتی ہے۔"

تھانے دار بولا۔ "تمنی کے اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ تُو پاکستانی ہے لیکن اب اس بڈھے کی خیر نہیں۔ اپنے بیت کٹھ رستے دار لوگن کو بھی اب پاکستان لے جانا پڑے گا۔ تجھے سکھا نہ دی تو ہمرا نام رام لال نہیں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

خالہ حیران پریشان تھیں۔ انہوں نے باہر آ کر مجھ سے کہا" کتنا ظلم، کتنی ناانصافی ہے یہاں۔ یہ مجھے اس لیے ذلیل کر رہا ہے کہ میں پاکستانی ہوں اور ماموں میاں سے اس لیے بدتمیزی کر رہا ہے کہ وہ ہندوستانی ہیں اور انصاف اس لیے نہیں مل رہا کہ ہم سب مسلمان ہیں۔ یہ کیسا ملک ہے جہاں مسلمانوں کو شکایت کرنے کا، ظلم کے خلاف رپورٹ لکھوانے کا کوئی حق نہیں۔"

میرا دل چھن چھن کر کے ٹوٹ گیا۔ ماموں کا جھکا سر ان کی غلامی کا، ان کی مظلومیت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ ایسا لگا جیسے خالہ اپنا سب کچھ ہار گئی ہوں۔

ہم سب آگے پیچھے تھانے سے نکل کر بازار کی طرف چلنے لگے۔ کچھ دور گئے تھے کہ ایک چائے کی دوکان پر بیٹھا رابیل نظر آ گیا۔ اس نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا۔ وہ دوکان سے باہر آ گیا۔ اس نے نزدیک پہنچ کر کہا" یقیناً انصاف نہیں ملا" تمہارا چہرہ بھی بتا رہا ہے۔"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کو اس طرح ذلیل کیوں سمجھا جاتا ہے۔ اب سمجھ میں آیا کہ ہمارے بزرگوں نے کس لیے الگ ملک کی مانگ کی تھی۔"

"اس نے چلتے چلتے کہا۔

اس کی ٹوٹتی بکھرتی حالت دیکھ کر میں سوچ میں پڑ گیا تھا کہ کہیں یہ کوئی غلط قدم نہ اٹھا لے۔ اسے ٹھنڈا کرنا ضروری تھا۔ میں نے خالہ سے کہا" آپ جائیں ہم کچھ دیر میں آ جاتے ہیں۔"

"اگر ساتھ ہی چلتے تو اچھا تھا۔ اس وقت علاقے کی صورت حال اچھی نہیں ہے۔"

ماموں میاں نے سمجھایا۔

"ہم لوگ بازار میں ہی رہیں گے۔ کہیں اور تو جائیں گے نہیں۔"

"ٹھیک ہے تو ایسا کرو کہ جلد آنے کی کوشش کرنا۔" کہہ کر ماموں میاں خالہ کو ساتھ لے کر آگے چلے گئے۔

ایک بڑے سے برگد کے نیچے دو چٹائیاں رکھی تھیں جن پر لوگ بیٹھ کر وقت گزارتے تھے، اس گاؤں کا اسے چوپال بھی کہا جاتا ہے۔ میں اسے ساتھ لے کر وہاں بیٹھ گیا۔ اس وقت ہمارے علاوہ اور کوئی وہاں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے ذہن کو بدلنے کے لیے میں نے سوال

کیا" رابیل یہاں والوں کے مسائل اور ہے۔ ہم ٹھہرے غیر ملکی اِن باتوں میں ہم دخل نہیں دے سکتے۔"

"یہ کیسا ملک ہے جہاں اپنے ہی شہریوں سے ایسا متعصبانہ سلوک کیا جاتا ہے۔"

"میں نے کہا ناں کہ یہ مسائل یہاں والوں کے ہیں۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے کہا کہ ان باتوں کو گولی مارو تم اپنی کہانی جہاں سے روکی تھی وہ سنا دو۔"

☆☆☆

گھر واپس پہنچے تو وہاں قیامت سے پہلے قیامت آ گئی تھی۔ وقاص کی ادھڑی لاش آنگن میں رکھی تھی۔ خون میں سَنی سفید چادر پر جوان لاشہ، میرا سر چکرانے لگا۔

"یہ...... یہ سب کیسے ہو گیا؟" میں نے پوچھا۔

"رات میں کھیتوں کے درمیان اکیلا پا کر کسی نے اسے قتل کر دیا۔" چھوٹے ماموں بولے۔

خالہ دل پر پتھر رکھ کر لاش کا معائنہ کرنے لگیں۔ اس کے وہ ہاتھ پنجوں سے کٹے ہوئے تھے جو کنہیا کمار کے گریبان تک پہنچ گئے تھے۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وقاص کا قاتل کون ہے؟

خالہ بین کر کے رونے لگیں۔" ہائے یہ کیا ہوا جن پیاروں کو دیکھنے آئی تھی مجھے کیا پتا تھا ان کا جوان لاشہ دیکھوں گی۔ ہائے یہ کیا ہو گیا۔" وہ سینہ پیٹنے لگیں۔

سلمٰی خالہ سے لپٹ کر رونے لگی اور روتے روتے بے ہوش ہو گئی۔ سب پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ ایک میں ہی ہوش میں تھا۔ میں نے دیکھا لاش کی حالت بہت خراب تھی۔ چہرے پر تشدد کے نشانات تھے، جگہ جگہ سگریٹ سے جلانے کے دھبے تھے۔ تمام نازک جگہیں استرے سے کاٹی گئی تھیں۔ دانت، لگتا تھا کسی ظالم نے زمبورے سے اکھاڑے ہوں۔ پورا چہرہ نیلا ہو رہا تھا۔ پیروں کے ناخن اکھڑے ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ میں نے اپنی انہی آنکھوں سے دیکھا جن کھلی آنکھوں سے میں نے اسے ہنستے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ بڑی بھاوج ہوش وحواس سے بیگانہ ہو گئیں۔ پورا گھر ماتم کدہ بن گیا۔ لڑکیاں بالیاں سب سسک رہی تھیں۔ بھائی کو یاد کر کے بلک رہی تھیں۔ ماموں میاں کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ ان کی کمر جھک گئی تھی۔ میں نے انہیں آدھے گھنٹے میں صدمے سے مُردوں جیسا ہوتے دیکھا۔ ان کے ہاتھ سے لاٹھی گر گئی تھی۔

پورا قصبہ وقاص کے سوگ میں افسردہ ہو گیا تھا۔ مسلمانوں نے اپنی اپنی دکانیں، کاروبار بند کر دیا۔ سب میاں جی کے خاندان کے دکھ میں شریک تھے۔ جب کہ ہندو دکانیں

کھولے بیٹھے رہے۔ کنہیا کمار نے پٹاخے داغنے شروع کردیے گویا شادیانے کا اہتمام ہو۔

☆☆☆

رات کا بارہ ساڑھے بارہ کا عمل تھا۔ لندن یا کراچی کی طرح وہاں کی راتیں جاگتی نہیں تھیں۔ اس وقت تک سارا عالم سویا ہوا تھا۔ ہم لوگ بھی بے خبر سورہے تھے۔ زمین پر بستر بچھایا گیا تھا۔

خواب خرگوش میں ڈوبے ہوئے تھے کہ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے شانے کو پکڑ کر ہلایا ہو۔ میری نیند فوراً ٹوٹ گئی۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا کوئی نظر نہیں آیا۔ میں دوبارہ آنکھیں بند کرنے والا تھا کہ سلمٰی کی آواز سنائی دی۔ ''اٹھو جلدی اٹھو۔ سب کو اٹھادو۔''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' میں نے جھنجلائی آواز میں کہا۔

''بلوائی آگے بڑھتے آرہے ہیں۔ اس محلے پر حملہ ہونے والا ہے۔''

''تمہیں کیسے پتا؟''

''مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میں دل بہلانے کے خیال سے چھت پر چلی گئی تھی کہ دور سے لوگوں کا جتھا آگے بڑھتے دیکھا۔''

''میں دیکھتا ہوں۔ تم اپنے حواس بحال رکھنے کی کوشش کرو۔'' اتنا کہہ کر میں اوپر چھت کی طرف لپکا۔ چھت پر پہنچتے ہی مجھے سلمٰی کی بات سچ نظر آئی۔

میں نے نیچے آتے ہوئے آواز دی۔ ''خالہ جانی...... اٹھیے خالہ جانی۔''

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔

''کیا ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''باہر شور ہورہا ہے' چھت پر چڑھ کر دیکھیں' مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ بلوہ شروع ہوگیا ہے۔''

''مجھے تو کچھ سنائی نہیں دے رہا ہے۔'' خالہ جانی بولیں۔

''آواز بہت دور کی ہے۔ جو قریب آتی جارہی ہے۔''

''آپ جا کر تو دیکھیں۔'' میری آواز پر سب ہی اٹھ بیٹھے تھے۔ چچا سے کہا تو وہ بادل نخواستہ اٹھ کر اوپر کی طرف بڑھے۔ کچھ دیر بعد اوپر سے آواز آئی۔ ''تم بھی اوپر آجاؤ۔ کچھ ایسا ہی نظر آرہا ہے۔''

ہم سب اوپر کی طرف دوڑتے ہوئے پہنچے۔ چھت پر پہنچ کر دیکھا دور بہت دور سڑک

کی طرف بہت سارے سائے نظر آرہے تھے۔

تبھی نیچے والے کمرے سے آواز آئی۔

''رفو...... رفو بیٹا!'' ماموں میاں نے اندر آتے ہی خالہ کا کندھا زور سے ہلایا۔

''آں...... ہاں، ہاں کیا ہوا، کیا ہوا؟'' وہ بوکھلا کر ماموں میاں سے بولیں!

''بیٹا! جلدی سے کمروں میں چھپ جاؤ جلدی کرو۔'' ماموں میاں نے کانپتے ہوئے کہا۔ ان کا ہاتھ بری طرح کانپ رہا تھا۔ ان کے ہاتھوں کی لرزش ان کے چہرے کی لرزش میں مدغم ہوگئی تھی۔ ''جاؤ جلدی کرو۔'' ماموں بولے۔ ''ہندوؤں نے حملہ کردیا ہے۔''

''کیا؟ نہیں، یہ...... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' وہ لپکتی ہوئی اندر گئی۔ چھوٹی بھابی گھبرائی گھبرائی سی کھڑی تھیں۔ روتے ہوئے بولیں۔ ''وقاص کے قاتل کی گرفتاری کے لیے جب لڑکے مظاہرہ کررہے تھے تو پولیس نے فائرنگ کردی۔'' گھبراہٹ میں الفاظ ان کے منہ سے اٹک اٹک کر ادا ہورہے تھے۔

''پھر...... پھر کیا ہوا؟'' خالہ نے جلدی سے پوچھا۔

''سنا ہے کئی لڑکے مر گئے اور۔'' وہ روتے ہوئے بھی بولے جارہی تھیں۔ ''جواباً مسلمانوں نے ایک ہندو کو مار ڈالا جس کا بدلہ لینے کے لیے ہندوؤں نے گاؤں کا محاصرہ کرلیا ہے۔ اللہ رحم کرے۔'' وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولیں۔ ''اب مسلمانوں کی آبادی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ شہر سے بھی مسلمانوں کی مدد نہیں آسکتی کیونکہ وہاں بھی کشیدگی ہے۔ وشو ہندو پریشد والے ناتھ نگر سے رتھ یاترا نکال رہے ہیں جو مسلمانوں کے سب سے بڑے محلے تاتار پور سے ہو کر گزرے گا۔ مسلمانوں میں سخت اشتعال ہے۔''

''یا خدا خیر!'' سلمٰی، جواد کو سینے سے لگا کر کانپنے لگی۔ باہر سے جے کار کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔

میں نے چھت پر سے ہی چیخنا شروع کردیا۔ ''اٹھ جائیے...... محلے والو اٹھ جاؤ۔ محلے پر حملہ ہوا ہے۔''

میری چیخ پکار کا مثبت اثر ہوا۔ بہت سارے لوگ نظر آنے لگے۔ اپنے اپنے گھر کی چھتوں پر بھی لوگ چڑھ آئے۔ پورا محلہ جاگ اٹھا تھا۔

تب ہی دور سے نعرہ بلند ہوا۔ ''بجرنگ بلی کی جے۔''

ادھر بھی لوگ پہلے سے ہی تیار تھے۔ فوراً مزاحمت کے لیے ڈٹ گئے۔ جوابی نعرے

گونجنے لگے مگر یہ بھی عجیب بات تھی کہ ابھی تک حملہ آوروں نے حملہ نہیں کیا تھا صرف نعرے لگا رہے تھے۔ میں بلوائیوں پر نظریں جمائے تھا ذہن بھی الجھا ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگر بلوائیوں نے حملہ کر دیا تو یہ مٹھی بھر لوگ اسے کیسے روکیں گے۔

وہاں پاکستان کی طرح جدید اسلحے عام نہ تھے۔ ہزار میں سے ایک گھر میں بندوق ہوگی۔ دونالی بندوق ورنہ روایتی اسلحے ہی عام تھے جن میں تلوار بھالے بلم اور تیر کمان۔ ادھر بھی یہی ہتھیار نظر آ رہے تھے اور ادھر بھی یقیناً یہی کچھ ہوگا۔ میں ابھی اسی بارے میں غور کر رہا تھا کہ یکا یک زوردار دھماکا ہوا پھر جو چیخ پکار شروع ہوئی کہ الامان الحفیظ۔

بلوائیوں کی آمد سے قبل ہی مسلمانوں نے سامنے کے گھروں کو خالی کرالیا تھا اور ان گھروں کی چھتوں پر دو بندوق بردار بیٹھ گئے تھے۔ مگر بلوائیوں نے سیدھے حملہ نہیں کیا تھا۔ انہوں نے رک کر پہلے صف بندی کی تھی پھر دستی بموں سے عقبی گھروں پر حملہ کر دیا تھا۔

دستی بموں کے استعمال کا مطلب تھا کہ ان کی تیاری زبردست تھی۔ وہ سب بارش کے قطروں کی طرح دستی بموں کا استعمال کر رہے تھے۔ گھریلو ساخت کے یہ بم نقصان کم اور دہشت زیادہ پیدا کر رہے تھے۔ دھماکوں ہی کی وجہ سے دہشت پھیل رہی تھی۔

عورتیں بچے خوفزدہ ہو کر ادھر سے ادھر بھاگ رہے تھے۔ جواب میں ادھر سے بھی گولیاں چلائی جارہی تھیں کہ محلے کے دوسری طرف سے بھی دھماکے سنائی دینے لگے۔ گویا نہایت منظم انداز میں بلوائیوں نے چڑھائی کی تھی۔ سامنے سیدھی سڑک تھی۔ ایک طرف سیورا ایگریکلچر کالج تو دوسری طرف فتح پور والی سڑک گویا ادھر بھی بلوائی جمع تھے۔ دونوں طرف آگ کے شعلے بلند ہونے لگے تھے۔

”اُف!“ خالہ نے سر پکڑ لیا۔ ”یہ ہندوستان ہے۔ نہیں نہیں یہ تو مقتلستان لگتا ہے؟“ وہ اٹھیں اور بوکھلاتی ہوئی چھت پر آ گئیں۔ ہانپتی ہوئی اوپر پہنچیں تو دور تک ہزاروں کا مجمع، بلموں کے اوپر لال کپڑا باندھے قطار در قطار بلوائی چلے آ رہے تھے۔

میں بھی اوپر آ گیا تھا۔ میں نے گھبرا کر دوسری طرف دیکھا جدھر میدان تھا۔ وہاں پولیس کا گھیراؤ تھا اور پولیس پوری مستعد دکھائی دیتی تھی۔ اچانک مجھے سکون مل گیا۔ ”شکر ہے پولیس آ گئی ورنہ کیا ہوتا؟“ میں سوچتا ہوا نیچے اترا۔

وقاص کی لاش اب تک کمرے ہی میں رکھی تھی۔ ہم سب اتنے پریشان اور بوکھلائے ہوئے تھے، اللہ معاف کرے کہ لاش کے پاس کوئی تھا ہی نہیں صرف سلمٰی، جواد کو سینے سے لگائے

بیٹھی سسک رہی تھی۔ بھابی دوسرے کمرے میں عورتوں کے ساتھ بیٹھی بین کر رہی تھیں۔

میں نے سلمٰی سے پوچھا۔ ”کیا ہوا!“

وہ خاموشی سے سر جھکائے روتی رہی۔ کچھ منہ سے نہ بولی۔ اس کی آنکھیں بہت کچھ کہنا چاہتی تھیں پر وہ کچھ کہہ نہ سکی اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

میں نے پانی لاکر اسے پلایا اور اس کے پاس بیٹھ کر اسے تسلیاں دینے لگا۔ گھر میں میت رکھی تھی۔ باہر فسادات شروع ہو گئے تھے۔

”یا اللہ! میں اسی ہندوستان کی دیوانی تھی۔ میں نے یہ کیا کیا؟ زندگی کا ایک بڑا حصہ پاکستان میں رہ کر بھی اس کی راحتوں کو تسلیم نہ کر کے گزارا تھا پر آج میرا دل اسی ملک کے لیے بے چین تھا۔“

خالہ بڑبڑا رہی تھیں۔ مجھے ہول اٹھنے لگا تھا۔ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کے لیے میں اٹھا اور جس کمرے میں عورتیں بیٹھی تھیں ادھر چل دیا۔

تبھی مجھے بڑی بھابی کی آواز سنائی دی۔ ”رفو نے ہمیں تباہ کر دیا۔ اچھا خاصا ہم لوگ سکون اور اطمینان سے رہ رہے تھے کہ کیسا سبز قدم رکھا۔ ہرا بھرا گھر اجاڑ دیا۔ ہمارا سکون تباہ کر دیا۔ ہائے! میرا وقاص! خدا غارت کرے میرا گھر تباہ کرنے والوں کو۔ اللہ...... اللہ کسی کی آتی رفو کو آجاتی۔ اس نے ہمیں تباہ کر دیا۔ میرا چاند میرا وقاص! میں اپنا خون تجھے معاف نہیں کروں گی، رفو غارت ہو جا، دفعان ہو جا!“ وہ سینے پر دوہتڑ مار کر رو رہی تھیں۔

تب ماموں میاں بے تاب ہو کر بولے۔ ”چپ ہو جاؤ۔ خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ بلقیس! مہمانوں کو ایسا نہیں کہتے۔ اس کا کیا قصور ہے؟ وہ تو ہم سے ملنے کتنے برسوں کے بعد کتنے فاصلوں کو طے کر کے آئی ہے۔ ہم مسلمان تو صدیوں سے بے عزت ہو رہے ہیں۔ جوتے گالیاں کھا رہے ہیں، کیا کریں؟ مجبور ہیں۔ اللہ! اگر ہماری اماں کو عقل دیتا تو آج ہم پاکستان میں ہوتے یہاں کیوں خوار ہوتے۔“

ماموں میاں بری طرح بلک اٹھے۔ خالہ سکتے میں کھڑی تھیں شاید سوچ رہی ہوں۔ یہ میرے اپنے تھے جو مجھے کوسنے دے رہے تھے، گالیاں بک رہے تھے، چار دن کے مہمانوں کو۔ اف میرے خدا! کاش زمین پھٹ جاتی اور میں اس میں سما جاتی۔ انہوں نے دیوار کا سہارا لے لیا اور روتی آنکھوں سے برآمدے کو دیکھنے لگیں۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ وہ آنکھیں جو پاکستان میں اب تک نہ برسی تھیں آج

ہندوستان میں برس اٹھیں۔

اچانک بڑے گیٹ پر دھماکے ہونے لگے۔ لگتا تھا دروازہ توڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی، ذوالفقار پسینے میں تر بتر بھاگتا ہوا آیا۔ بڑے ماموں کا پوتا جمیل چیخا۔ ”عورتیں سب چھپ جائیں۔ ہندو اندر گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

دھم دھم دھم دروازے پر ضربیں تیز ہو گئیں۔ عورتوں کی چیخیں میرے دل کو دہلا رہی تھیں۔ وقاص کی لاش صبح سے اب تک بے گور و کفن کمرے میں پڑی تھی۔ مکھیاں بھن بھن کرتی پھر رہی تھیں۔ اسی وقت ندیم، کلیم بھاگتے ہوئے آئے اور سلمیٰ اور عنبر کو گھسیٹتے ہوئے کوٹھڑی میں لے گئے۔ ”پھوپو آپ سب یہاں چھپ جائیں۔ قیامت آ جائے تب بھی باہر نہ نکلیں۔“ اور اُڑی رنگت کے ساتھ وہ سلمیٰ کی طرف مڑے۔ ”سلمیٰ خدارا کچھ بھی ہو جائے آوازیں مت نکالنا۔ اگر ہم قتل بھی ہو جائیں تب بھی باہر مت نکلنا۔ میری بہنا۔“ یہ کہتے ہوئے کلیم کا گلا رندھ گیا۔ وہ کوٹھڑی کے کونے میں گندم کی بوریوں کے درمیان ہمیں چھپا کر جانے لگا۔ ”دروازہ کس کر بند کر لیں۔“

اس نے ایک نظر میرے چہرے پر ڈالی اور وہ سر جھکائے باہر نکل گیا۔ اس کے نکلتے ہی دھڑ کی آواز گونجی۔ ”ہائے اللہ! کیا دروازہ ٹوٹ گیا؟“ میں نے سوچا۔ جواد بلک بلک کر رونے لگا۔

گرمی، اندھیرا اور حبس اتنا تھا کہ بچہ بلک اٹھا۔ سلمیٰ نے جلدی سے بچے کے منہ سے نپل لگا دیا اور وہ معصوم ہر فکر سے بے نیاز ہو کر دودھ پینے لگا۔ میرے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چھا گئیں۔ اچانک صحن میں ہندوؤں کا ٹولہ بجرنگ بلی کی جے جے کار کرتا، بلم اونچے کیے تن پر گیرو ملے، اچکی دھوتی باندھے، گندی گندی گالیاں بکتا گھس آیا۔ وہ سب مسلسل چیخ رہے تھے۔ ”او مسلی کدھر ہے تو' او پاکستانی باہر نکل۔“ نجانے کتنے عجیب و غریب نام لے لے کر وہ سب گالیاں بک رہے تھے اور بلم بلند کر کے باہر نکلنے کو کہہ رہے تھے۔

میں بند دروازے کی درز سے آنکھ لگائے کھڑا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں پتھر کا بن چکا ہوں۔ مجھ میں ہلنے کی بھی قوت نہیں ہے۔ تمام عورتیں اور بچے اور مرد نجانے کہاں چھپ گئے تھے۔ کوئی نظر ہی نہیں آ رہا تھا؟ وہ برتن کچلتے جاتے، چیزیں روندتے جاتے کہ ایک موٹی توند والا ہندو اماں بی کی کمرے کی طرف بڑھا۔ اس کا چہرہ گیرو کے رنگ سے رنگا ہوا تھا۔ وہ بری طرح گالیاں بک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت رقصاں تھی۔ جب وہ اماں بی کے کمرے سے باہر نکلا تو میرا دل رو اٹھا۔ اگر میں اپنے منہ پر ہاتھ نہ رکھ لیتا تو چیخ فضا میں بکھر جاتی۔ وہ وقاص کی لاش کو انتہائی بے دردی سے گھسیٹتا ہوا باہر نکلا تھا۔ میں تھر تھر کانپ رہا تھا۔ تب جواد کلبلایا۔ سلمیٰ نے

شاید اپنا ہاتھ سختی سے جواد کے منہ پر جما دیا۔ اس کے بعد پھر اس کی آواز سنائی نہیں دی۔ اندھیرے میں کھڑا میں سخت ذہنی اذیت میں تھا۔ کھب کی آواز باہر سے سنائی دی۔ میں نے چونک کر جھری سے پھر باہر جھانکا۔

اُف میرے خدا! اس موٹی توند والے ہندو نے وقاص کے مردہ پیٹ میں پورا بلم گاڑ دیا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی کئی ہندوؤں نے کھچا کھچ اپنے بلم وقاص کے مردہ جسم میں گھسیڑنے شروع کر دیے۔

”او مسلو باہر نکلو نہیں تو آج اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔“ ایک ہندو جو نشے میں دھت تھا بولا۔ اس کے ساتھ ہی وقاص کے مردہ جسم پر کھڑے ہو کر پیشاب کرنے لگا۔

”ہاہاہا“ تمام ہندوؤں کے قہقہے بلند ہوئے۔

پوری حویلی ہندوؤں سے بھری تھی وہ سب ادھر ادھر ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے تھے اور ہم سب بوریوں کے پیچھے دبکے ہوئے اللہ اللہ کر رہے تھے۔

میں نے خود پولیس کو دیکھا تھا وہ کوئی مداخلت کیوں نہیں کر رہی؟ ان شر پسند لوگوں کو گرفتار کیوں نہیں کرتے؟ یہی سوچتے سوچتے میں نے مڑ کر سلمیٰ کی طرف دیکھا۔ شکر! ہے وہ باہر کا منظر دیکھ نہیں رہی تھی ورنہ اس کی چیخیں روکنا مشکل ہو جاتا۔ تب مجھے اوپر کوٹھڑی سے ایک چیخ سنائی دی۔

”یا اللہ! میری نظریں اوپر نہیں جا رہی تھیں میں بے چین ہو گیا کہ پتا نہیں اوپر کیا ہو رہا تھا۔ ہائے! میں نے بے چینی سے ہاتھوں کو مسلا۔ نہ جانے اوپر ہندو کیا ظلم کر رہے تھے۔ چند ہی لمحوں کے بعد میں نے دیکھا۔ کوٹھے سے مجو بھائی کو، معذور مجو بھائی کو جو چلنے پھرنے اور قوت گویائی سے معذور تھے، انہیں وہ سب اونچی سیڑھیوں سے ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ رہے تھے۔

جن کی صرف آنکھوں میں جان تھی ہر جھٹکے پر وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ ہندو انہیں گھسیٹ کر نیچے لے آئے اور ان کے چاروں طرف گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے پھر وہ سب دل ہلا دینے والے قہقہے لگانے لگے۔ ان کی آنکھوں میں نفرت، حقارت، درندگی اور خون کی پیاس تھی۔ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ کیا یہی بھارت کا سیکولرازم ہے؟ کیا یہی جمہوریت ہے؟ کیا یہی انسانیت ہے؟

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے تمام ہندوؤں کو تفریح ہاتھ لگ گئی ہو۔ وہ کبھی مجو بھیا کے منہ پر تھوکتے، کبھی ان کا معذور ہاتھ مروڑ دیتے اور کبھی نازک جگہوں پر ٹھوکریں مارنے لگتے۔

میں دل کو تھامے آنسوؤں سے تربتر چہرہ لیے کانپتے ہاتھوں، کانپتے چہرے سے بے حرمتی دیکھ رہا تھا کہ اسی وقت میں نے ایک نسوانی چیخ سنی۔ یہ مجو بھیا کی بیوی تھیں جو سیڑھیوں سے بھاگتی چلی آ رہی تھیں۔ بھابی نے بلوائیوں کو دھکا دیا اور آتے ہی مجو بھیا پر گویا چھا گئیں۔ وہ مجو بھیا پر لیٹ گئی تھیں۔ اب اگر کوئی مجو بھیا کو کوئی نقصان پہنچاتا تو پہلی ضرب بھابی پر پڑتی۔ وہ بھیا پر گر کر سسک سسک کر رو رہی تھیں۔

یہ وہ پڑوسی تھے جنہیں خالہ کتنے سالوں تک یاد کرتی رہیں پر آج انہیں ان محبتوں کا جو انعام ملا تھا اس پر ان کی روح تک تڑپ اٹھی ہو گی۔ چر، چر، چر کی آواز کے ساتھ ہی میں حواسوں میں آ گیا۔ کسی ہندو نے کہکشاں کے گریبان پر ہاتھ ڈال کر پھاڑ دیا تھا۔ خالہ چیخ کر اس کی طرف بھاگیں کہ اچھوت کمار نے لپک کر ان کا گلا پکڑ لیا۔ کہکشاں پر نجانے کتنے ہندو پل پڑے تھے، وہ دیوانہ وار انہیں پیچھے دھکیل رہی تھی۔ بری طرح چیخ رہی تھی۔ خالہ بے بس اچھوت کمار کے ہاتھوں میں مچل رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے کپڑے دھجی دھجی ہو گئے تھے۔ گھر میں کل پانچ نوجوان لڑکیاں تھیں۔ کہکشاں بھی بری طرح مچل رہی تھی۔ "مجھے بچالو، مجھے بچالو" اچانک انجم کی آواز آئی۔

میں نے بمشکل نظریں گھمائیں ایک ہندو درندے نے اسے جکڑ رکھا تھا اور وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ اب مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں قسم توڑ کر باہر نکل آیا۔ میں نے ایک ہندو کے ہاتھ پر وار کر کے بلم چھینا اور ان سب پر پل پڑا۔ مجھے باہر آتے دیکھ رابیل بھی باہر نکل آیا اور اس نے بھی دہشت پسندوں پر حملہ کرنا شروع کر دیا۔ مجھے یاد نہیں میں نے کتنوں کو زخمی کیا۔ کتنوں کی جان لی۔ مجھ پر پاگل پن کا دورہ سا پڑ گیا تھا۔ بس اتنا دیکھا کہ خالہ نے اچھوت کمار کو لات رسید کی اور کہکشاں کی طرف لپکیں اور اسے آزاد کرانے کی کوشش کرنے لگیں۔ کچھ بلوائی انہیں کھینچنے لگے۔ تب دور سے مجھے جواد کے رونے کی آواز سنائی دی۔ ایک لمحے کو سب ہی چونک گئے ان کی سرخ، نشے میں ڈوبی آنکھیں کوٹھری کی طرف اٹھ گئیں۔ خالہ جو انجم کو چھڑا رہی تھی فوراً ہانپتی ہوئی ادھر بھاگیں اور کوٹھری کے دروازے پر چٹان کی طرح جم گئیں۔ ان کی شلوار کے پائنچے پھٹ گئے تھے۔ قمیص ادھڑ گئی تھی۔ تب بڑے ماموں سر جھکائے باہر نکلے، ان کی دیکھا دیکھی ذوالفقار، ندیم، کلیم جو کہ ان کے بیٹے تھے وہ بھی اوپر سے بھاگتے ہوئے باہر نکل آئے۔ ہندوؤں نے اپنے اپنے بلم اٹھا لیے ان میں سے ایک قہقہہ لگا کر بولا۔ "آؤ آؤ ماموں جی! دیکھ لو مجو کا کیا حال کیا ہے ہم نے؟"

ماموں میاں نے کمزور لہجے میں کہا۔ "اچھوت کمار! شرم کر یہ تیرے مالک کا گھر ہے اور تو ہمارے ساتھ یہ سلوک کر رہا ہے۔" اور نہ جانے ماموں کیا کیا کہہ رہے تھے۔ کہ اچانک فائر کی آواز گونجی۔ احمد نے جو وقاص سے چھوٹا تھا اس نے ایک ہندو پر جو اس کی ماں کا دوپٹا کھینچ رہا تھا۔ فائر کر دیا۔ وہ ہندو پنڈت وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کے مرتے ہی یک لخت ہندوؤں کو سکتا ہو گیا۔ وہ حیران کھڑے رہ گئے مگر میں رکا نہیں اسی جوش سے لاٹھی چلاتا رہا۔ مجھے لڑتا دیکھ ماموں میاں نے بھی لاٹھی سنبھال لی۔ ذوالفقار وغیرہ بھی کود پڑے۔ کچھ دیر پہلے ہندوؤں کا پلا بھاری تھا مگر اب ہم ان پر بھاری پڑ رہے تھے۔ میں نے بہت سارے ہندوؤں کو زخمی کر دیا تھا۔ خود بھی زخموں سے چور ہو چکا تھا۔ مگر نہ میرے ہاتھ رک رہے تھے اور نہ میں۔ ہر طرف سے ہندو مجھے گرانے کے لیے لاٹھیوں ڈنڈوں سے وار کر رہے تھے اور میں پھرکی بنا جوابی وار پر وار کیے جا رہا تھا۔

تبھی پولیس کی وردی میں ملبوس بہت سے سپاہی اندر گھس آئے۔ انہوں نے اندر آتے ہی میرے سر پر کسی چیز سے وار کیا اور میں جو پہلے ہی ڈگمگا رہا تھا' ہوش سے بے گانا ہو گیا۔ انہوں نے اندر آتے ہی فائرنگ بھی کی تھی۔ کس پر یہ مجھے نہیں پتا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میرے اردگرد سب کھڑے تھے۔ بڑے ماموں' ذوالفقار' ندیم کلیم خالہ۔ گویا پوری حویلی سٹ آئی تھی۔ صرف مجو بھیا اور ان کی بیوی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہاں ایک اور چہرہ بھی تھا جسے دیکھ کر میرے اندر نفرت کی تیز لہر دوڑ گئی تھی۔ یہ وہی تھانے دار تھا جس نے ماموں میاں کے ساتھ تھانے میں بدتمیزی کی تھی۔

مجھے آنکھیں پٹپٹاتے دیکھ وہ بولا 'اے بوا تمنی تو بڑی ویرتا' بڑی بہادوری سے آ کر من کرتاؤں کو کھدیڑا ہے۔ ہمیں آنے میں کچھ دیر لگی نئی تو ہمنی مجو میاں اور اس کی پتنی کو بھی بچائی لیتے۔ فی الحال تم بسرام کرو۔ ہمنی نے رپورٹ لیکھ لی ہے۔ کچھ لوگن کو گرفتار بھی کیا ہے۔ ضرورت پڑی تو گواہی کے لیے تمنی کو بلائی لیں گے۔"

اس وقت پولیس والے مجو بھائی اور بھابی کی بلم میں پروئی لاش باہر لا رہے تھے۔

تھانے دار کے جاتے ہی میں نے کہا۔ "سمجھ میں نہیں آتا یہ فرعون صفت تھانے دار ہماری مدد کے لیے کیسے آ گیا۔ جبکہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے عقبی میدان میں پولس کا جتھا دیکھا تھا۔ انہی کی شہ پر بلوائی آئے تھے۔"

"ہاں میرے بیٹے یہی سچ ہے۔ بھارت کے جس شہر میں بھی فساد ہوتا ہے اس میں پولس کی بھرپور مدد شامل ہوتی ہے۔ پولس والے بلوائیوں کو پورا موقع دیتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو

اجاڑ دیں بعد میں خانہ پری کے لیے آجاتے ہیں۔ دو چار چھوٹے موٹے غنڈوں کو گرفتار بھی کر لیتے ہیں۔'' بڑے ماموں نے افسردہ لہجے میں کہا۔

تقریباً گھر کے ہر فرد کو چوٹیں آئی تھیں۔ بازار میں ایک مسلمان ڈاکٹر کا کلینک تھا۔ اسے بلا لیا گیا تھا۔ اس نے حویلی میں ہی سب کی مرہم پٹی کر دی تھی۔ پین کلر اور اینٹی بائیوٹک دوائیں بھی دے دی تھی، جاتے جاتے مجھے نیند کا انجکشن بھی لگا گیا تھا۔

صبح جب نیند سے جاگا تو درد میں کافی افاقہ تھا۔ خالہ نے سامان پیک کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب پروگرام یہ تھا کہ تین دن بعد ہم لوگ یہاں سے نکل پڑیں گے۔ یوں بھی گھر کا ماحول کافی سوگوار تھا۔ تین تین جنازے جس گھر سے اٹھیں وہاں کوئی مسکرا بھی سکتا ہے؟

میں بھی بہت رنجیدہ تھا۔ ان کافروں نے وقاص کی لاش کے ساتھ جو سلوک کیا تھا۔ جس بے رحمی سے مجو بھیا کو قتل کیا تھا وہ مناظر میری آنکھوں میں ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ ایسی درندگی کا تو میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں اندر سے سہم کر رہ گیا تھا۔ جلد سے جلد اس منحوس سرزمین سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔ یہ تین دن کیسے کٹیں گے میں اسی سوچ میں تھا کہ سلمیٰ جواد کو گود میں اٹھائے آگئی۔

اس نے آتے ہی کہا۔ ''داؤد میرا دم گھٹ رہا ہے۔ ایک ایک پل بھاری گزر رہا ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں اب نہیں بچوں گی۔ مشہود سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ میں زندہ اس منحوس ملک سے جا نہیں پاؤں گی۔ میرا کہا مانو تو خالہ سے کہو کہ آج ہی چل دیں۔''

''ڈرو نہیں بہنا... کچھ نہیں ہوگا۔ میں ہوں نا۔ میرے زندہ رہتے تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ پھر یہاں سے اتنی جلدی جانا ممکن بھی نہیں ہے۔ پہلے پولیس ہیڈ آفس جا کر لکھانا پڑے گا تب ہی جا سکیں گیا اور شہر بند پڑا ہے۔ تھانے دار بتا رہا تھا کہ پورا شہر جل رہا ہے۔''

اسی وقت کہکشاں کمرے میں داخل ہوئی۔ شاید اس نے ہماری باتیں سن لی تھیں۔ وہ بولی۔ ''بھابی آپ گھبراتی کیوں ہیں۔ یہ سب تو یہاں کا معمول ہے۔ مرنا مارنا ہماری قسمت میں لکھ گیا ہے۔ آپ کے لیے نیا ہے اس لیے آپ ڈر رہی ہیں۔ یہ ہندوستان ہے۔ یہاں پچیس کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ دنیا بھر میں سب سے زیادہ مسلمان یہیں ہیں۔ یہ ہندو چاہ کر بھی ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ دو چار مسلمان اگر مر جاتے ہیں تو یہ قوم کے لیے قربانی ہے۔''

''دراصل میرے اندر ہول سا اٹھ رہا ہے۔''

''بھابی آپ ڈر کر یہاں رہ ہی نہیں سکتیں۔ اسے زندگی کا معمول سمجھئے۔ صرف تین

دن کی تو بات ہے۔ پھر پتا نہیں کبھی ملاقات ہو گی بھی یا نہیں۔'' کہکشاں کی آواز میں بھراہٹ آ گئی تھی۔ وہ اپنی آنکھیں پونچھنے لگی تھی۔

''ارے پگلی ایسا نہیں سوچتے۔ میں تمہیں پاکستان بلاؤں گا تاکہ تم دیکھ سکو کہ انسانیت کیسی ہوتی ہے۔'' میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''مجھے تو پاکستان دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ ایک بار اپنی نظروں سے اس ملک کو دیکھنا چاہتی ہوں جہاں مسلمانوں کو مکمل آزادی ہے۔ جہاں بقرعید پر ہندو مسلم فساد کا کوئی ڈر نہیں۔ جہاں مسلمان امن چین سے رہتے ہیں۔ ان کو کوئی ڈرانے دھمکانے والا نہیں مگر سنتے ہیں وہاں جانے کا خرچ بہت ہے۔'' وہ حسرت بھری آواز میں بولی۔

''تو فکر کیوں کرتی ہے۔ میں تجھے بلواؤں گا اپنے خرچے پر۔'' میں نے کہا۔

ہم سب باتیں کر ہی رہے تھے کہ ذوالفقار گھبرایا ہوا اندر آیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ میں نے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے؟ اتنے پریشان کیوں لگ رہے ہو؟''

''خیریت ہی تو نہیں ہے۔ میں کچہری سے بھاگتا ہوا آ رہا ہوں۔'' وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ بہت دور سے بھاگتا ہوا آیا تھا۔

''کیوں کتے پیچھے لگ گئے تھے کیا؟'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''یا اچھوت کمار نے پھر کوئی پھڈا ڈال دیا۔''

''یہاں جو کچھ ہوا ہے اس سے بھی بڑا پھڈا کھڑا ہو گیا ہے۔ کئی روز سے شہر میں خوف پھیلا ہوا تھا۔ وشو ہندو پریشد والے ناتھ نگر سے رتھ یاترا کا جلوس نکالنے والے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ جلوس تاتار پور سے گزارنا چاہتے تھے۔ مسلمانوں میں اشتعال تھا۔ حکومت نے ان کو چھوٹکی صاحب گنج کا روٹ دے دیا مگر وہ زور دیتے رہے تھے کہ وہ تاتار پور سے ہی گزریں گے۔ یہاں کا ایس پی بہت متعصب ہے اس نے روکا نہیں اور وہ جلوس زبردستی تاتار پور میں گھس آیا۔ مسلمانوں نے پتھراؤ کر دیا۔ جلوس والے زخمی ہوئے۔ وہ پلٹے اور انھوں نے شجاع گنج بازار میں لوٹ مار شروع کر دی۔ مسلمانوں کی ایک ایک دوکان لوٹ لی گئی۔ بہت سے مسلمان راہگیر مارے گئے۔ پورے شہر میں آگ لگی ہوئی ہے۔''

''اتنا بڑا شہر غنڈوں کو روکنے والا کوئی نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل، آر ایس ایس اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے غنڈے جن کا نعرہ ہے کہ مسلمانو پاکستان جاؤ یا قبرستان جاؤ وہ سب پہلے سے تیاری کرے بیٹھے تھے۔ ایس ایس پی

بھی ان کا،اس لیے انہیں کھلی چھوٹ مل گئی۔"

"اس کے معنی ہیں کہ اب ہمیں مزید دو چار دن رکنا پڑے گا۔"

"دو چار دن نہیں زیادہ' کیوں کہ ٹرین سے اتار اتار کر مسلمانوں کو شہید کیا گیا ہے۔ یونیورسٹی اسٹاف کوارٹر میں جتنے بھی مسلمان تھے سب کو مار دیا گیا ہے۔ اندازہ لگایا جارہا ہے کہ ایک سو سے زیادہ مسلمان مارے جا چکے ہیں۔ جب کہ ہندو بہت کم شکار ہوئے ہیں۔ تاتار پور 'اسانند پور اور پربتی کے مسلمانوں نے باہر نکل کر ہندو آبادیوں پر حملہ کیا مگر وہ سب علاقہ خالی پڑا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ انہیں پہلے سے معلوم تھا۔"

"یہ تو بہت بری خبر سنائی ہے۔"

"فساد شہر سے نکل کر آس پاس کے دیہاتوں تک پھیل گیا ہے۔ ابھی صرف ان دیہاتوں پر حملہ ہو رہا ہے جو چھوٹے ہیں۔ ایک دو دن میں یہاں بھی حملہ ہو سکتا ہے۔ یہاں اگر حملہ ہوا تو اس بار بجرنگ دل کے ٹرینڈ لڑاکا دستے حملہ کریں گے کیونکہ ان تک خبر پہنچ چکی ہوگی کہ ہم نے یہاں کا حملہ ناکام کیا ہے۔"

"ان حالات میں کیا کرو گے؟"

"ہر نوجوان تیاری میں لگا ہے۔"

ہماری باتیں جاری تھیں کہ گھر کے باقی افراد بھی وہیں آ گئے۔ ان میں بڑے ماموں بھی تھے۔ میں نے ان سے پوچھا "ماموں ان حالات میں کیا کیا جا سکتا ہے؟"

"ابھی گاؤں کے دیگر افراد بھی آئے تھے۔ سب کا کہنا یہ ہے کہ ہمیں فوراً فتح پور منتقل ہو جانا چاہیے۔ امداد میاں اپنے گھر والوں کو لے کر چلے بھی گئے۔"

"فتح پور کتنی دور ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"دور تو زیادہ نہیں ہے۔ مگر پریشانی یہ ہے کہ سڑک پر لوگ جمع ہیں۔ آنے جانے والوں کو روک کر چیک کر رہے ہیں۔ دو مسلمان پکڑ میں آ گئے تھے انہیں ان لوگوں نے اسی وقت مار دیا۔"

"اور کوئی راستہ نہیں ہے؟" میں نے پھر پوچھا۔

"کھیتوں سے ہو کر جایا جا سکتا ہے مگر وہ راستہ زیادہ خطرناک ہے۔ اس لیے کہ راستے میں چماروں کی ایک بستی ہے۔ عام دنوں میں تو وہ ہاتھ جوڑے کھڑے رہتے ہیں مگر اس وقت وہی زیادہ خطرناک ہیں۔ لوٹ پاٹ میں سب سے آگے وہی لوگ رہتے ہیں۔"

"اگر رات کے اندھیرے میں جایا جائے تو؟"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ رات میں ہی نکلا جائے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ اس وقت گاؤں میں سو سے زیادہ افراد ہیں اتنے لوگوں کا ایک ساتھ نکلنا آسان نہیں ہے پھر بھی کوشش کروں گا ضرور بس دعا کرو کہ رات میں حملہ نہ ہو۔"

ہر کوئی پریشان تھا۔ گاؤں کے تمام لوگ زیادہ تر لوگ حویلی میں آ گئے تھے۔ عورتوں بچوں کی بھیڑ لگ گئی تھی۔ وقت گزرتا جارہا تھا۔ سورج چھپ گیا تھا۔ اندھیرا چھا گیا تھا۔ کسی کی آنکھ میں نیند نہ تھی۔ سب کو دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اب حملہ ہوا کہ تب ہوا۔ سب کے ساتھ میں بھی چھت پر چڑھ آیا تھا۔ ایک دو نالی بندوق تھی۔ اسی کے بھروسے پر سب بیٹھے تھے کہ حملہ ہوا تو اس سے روک لیں گے۔

تبھی سڑک کی طرف سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائیٹ نظر آئی۔ وہ گاڑی گاؤں کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ سب لوگ ہوشیار ہو گئے۔ لاٹھی بلم لے کر نوجوان گلی میں کھڑے ہو گئے۔ ذوالفقار نے بندوق تان لی۔ گاڑی سیدھی آ کر حویلی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

وہ پولیس کی جیپ تھی۔ اس سے کود کر وہی داروغہ اترا جس نے دو دن پیشتر بلوائیوں سے ہم لوگوں کو بچایا تھا۔ اس نے اترتے ہی آواز لگائی "ماموں کہاں ہو۔ تنک ایہاں آبو۔ ہمنی ایک بات کرنے واستے آئے رہے۔"

ماموں چھت سے اتر کر نیچے پہنچے۔ ساتھ میں میں بھی اتر گیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے وہ شخص ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ اس کی شکل دیکھتے ہی میری نظروں میں تھانے کا منظر رقصاں ہو جاتا۔ اس نے ماموں کو نمستے کہا اور مسکرا کر بولا "میاں جی ہمنی بہت مجبور ہیں۔ سڑک پر ہزاروں بلوائی جمع ہے۔ کا کریں؟ ہمرے پاس زیادہ فورس بھی نئی۔ ان سب کا کیسے روکے؟ اس لیے ہم سوچے ہیں کہ آپ سبھو کو فتح پور پہنچا دیب۔ آپ کا' کا خیال ہے؟"

"یہ تو بہت اچھا ہے۔ ہم بھی وہاں جانا چاہتے ہیں۔" ماموں نے خوش ہو کر کہا۔

ان کا مرجھایا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ ان حالات میں اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا جبکہ مجھے اس کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ اس دن بھی میدان میں تھا جس دن حملہ ہوا تھا۔ وہ بہت متعصب شخص ہے اس کا ادراک اسی دن ہو گیا تھا جس دن ہم تھانے میں تھے۔ ایسے شخص سے خیر کی امید نہیں تھی مگر اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا اس لیے میں خاموش ہی رہا۔ گاؤں بھر کے لوگ فتح پور جانے کے لیے تیاری کرنے لگے۔ میں خاموش نظروں سے سب

کچھ دیکھتا رہا۔ تقریباً نوے لوگ ہو گئے تھے۔ ان میں بچے بھی تھے اور عورتیں بھی۔ سب جمع ہو گئے تو تھانے دار نے ایک سپاہی سے کہا کہ وہ جا کر دیکھ آئے کہ راستہ صاف ہے نا؟

سپاہی چلا گیا کچھ دیر بعد لوٹا تو بولا کہ جتنے بھی لوگ ہیں سب کھیتوں کی طرف ہیں۔ سڑک والا راستہ صاف ہے۔

اشارہ ملتے ہی اس نے کہا کہ آپ لوگ جلدی کریں۔ ہم اس بڑے تالاب کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے چلیں جائیں گے۔ اس طرح راستہ کچھ لمبا ضرور ہو جائے گا مگر ہم حفاظت سے پہنچ جائیں گے۔

اس کے اشارے پر لوگ چل پڑے۔ چار پولیس والے آگے تھے اور چار پیچھے۔ ان کے ساتھ سب بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ وہ تالاب اب کچھ ہی دور رہ گیا تھا۔ اس تالاب کو دیکھتے ہی میں حیران رہ گیا۔ پانی دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ پورے تالاب پہ ''کم بھیل'' کے پودے پھیلے ہوئے تھے۔ چوڑے چوڑے چھوٹے پام جیسے مگر بہت دبیز۔

میں ان پتوں کا جائزہ لیتا ہوا بڑھتا جا رہا تھا کہ یکا یک ہی جھاڑیوں میں چھپے ہوئے ہندو شور کرتے ہوئے باہر نکلے اور بغیر توقف کے ہم سب پر حملہ آور ہو گئے۔ ان لوگوں کا ساتھ دیتے ہوئے پولیس والے بھی لاٹھیوں سے ہم سب پر پل پڑے۔

چیخ و پکار سے میدان گونجنے لگا۔ لوگ زخمی ہو کر گر رہے تھے۔ اٹھ رہے تھے پھر گر رہے تھے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ہتھیار تھا۔ کسی کے ہاتھ میں بلم تو کسی کے ہاتھ میں تلوار۔ کوئی برچھا لیے ہوئے تھا تو کوئی لوہے کی سلاخ۔ ان سب ہتھیاروں سے وہ لوگ جانوروں کی طرح مسلمانوں کو شکار کر رہے تھے۔ میرے سر پر لاٹھی لگی تو میں اچھل کر تالاب میں گرا۔ مجھ پر کوئی اور آ گرا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کا پلان ہی یہی ہے کہ سب کو قتل کر کے تالاب میں ڈال دیں گے۔ میرے سر پر لگنے والا وار کافی کاری تھا۔ میں ہوش سے بیگانہ ہو گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں تالاب میں لاشوں کے درمیان پڑا تھا۔ اگر میرے نیچے لاشیں نہ ہوتیں تو ناک منہ میں گندہ پانی داخل ہو کر موت کا سبب بن جاتا۔

میرا دل تڑپ اُٹھا۔ میں بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا، میری نظریں پورے میدان میں گھوم رہی تھیں۔ کیا قیامت ہم پر بیت گئی تھی۔ ہر طرف گھپ اندھیرا تھا اور چاروں طرف کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دور آسمانوں پر دھواں اٹھ رہا تھا۔ کہ اچانک کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔ جواد، میرا بچہ! میں چور چور جسم کے ساتھ ادھر لپکا۔ گھپ اندھیرے میں

رونے کی آواز سے سمت کا اندازہ کر رہا تھا۔ تبھی مجھے ٹھوکر لگی وہ کسی کا جسم تھا خون میں بھرا، چپ چپا۔ میں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا ناک میں بڑی سی لونگ تھی۔ میں نے سلمیٰ کو پہچان لیا۔ سلمیٰ! میں اسے آوازیں دینے لگا اور زور زور سے اس کے جسم کو ہلانے لگا لیکن اس کے جسم میں کوئی گرمی نہ تھی۔ جواد البتہ اب بھی بلک رہا تھا۔ میں نے اندازے سے ہاتھ بڑھایا۔ بچے تک میرا ہاتھ پہنچ گیا تھا۔ میں اسے اٹھائے گرتا پڑتا کیچڑ سے باہر آیا کہ کسی چیز سے میرا پیر ٹکرایا۔ میں نے جھک کر ٹٹولا وہ ٹارچ تھی۔ میں نے اسے جلا کر دیکھا۔ وہ صحیح تھی اس کی روشنی میں، میں نے اپنے جواد کا معصوم چہرہ دیکھا۔ وہ دودھ کے لیے بلک رہا تھا پر میں اسے دودھ کہاں سے دیتا؟ دودھ پلانے والی تو اسے چھوڑ کر جا چکی تھی۔ میں آگے کی طرف بڑھا نجانے میرے پاؤں کے نیچے کتنے جسم آ کر کچلے گئے۔ جن کی چاہ میں کئی دہائیوں تک خالہ دیوانی رہیں۔ جن کی محبت میں انہیں اپنی زمین کی اہمیت بے وقعت محسوس ہوئی تھی۔

اتنی دیر میں میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھ لیا تھا کہ انجم اور کہکشاں ہی نہیں گھر کے تمام افراد مر چکے تھے۔ اتنے بڑے میدان میں صرف ان پر رونے کے لیے میں زندہ تھا یا پھر ننھا جواد۔ میں جواد کو اٹھائے ہوئے کھڑا تھا۔

یہاں سے وہاں تک لاشیں ہی لاشیں پڑی تھیں۔ جوان، بوڑھے، بچے اور لڑکیوں کی لاشیں! ان کے کچلے ہوئے جسم ہندوستان کی نام نہاد جمہوریت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ مسلمان ہونے کا انعام تھا۔ عفت مآب لڑکیوں کے جسم روندے گئے تھے۔ یہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے کی سزا تھی۔ ان کی آنکھیں پھوڑی گئی تھیں تا کہ وہ اپنے ملک کے باسیوں کو پہچان نہ سکیں۔ میں کیا کیا بتاؤں کہ وہاں میں نے کیا کیا دیکھا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ان لاشوں میں رابیل کی لاش بھی تھی جو بے چارہ کس امید پر یہاں آیا تھا۔ اس ملک کو دیکھنے آیا تھا مگر اب اس کی لاش میرے سامنے پڑی تھی۔ کٹی پھٹی لاش۔

اس وقت کئی ٹرک آ کر رکے اور مائیکروفون سے اعلان کیا جانے لگا۔ ''خبردار، ہوشیار سی آر پی آ گئی ہے۔ فساد اور بلوے کرنے والوں کو ختم کر دیا جائے گا۔ اپنے ہتھیار پھینک کر سامنے آ جاؤ۔ چھپے ہو تو سامنے آ جاؤ اگر خود حاضر ہو جاؤ گے تو تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔''

تبھی ایک کانپتا ہوا ہاتھ میری طرف بڑھا اور سر پر آ کر ٹھہر گیا۔ تڑپ کر میں نے سر اوپر اٹھایا۔ ایک آدمی پولیس کی وردی میں سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ لرزتے ہوئے چہرے اور سرخ آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ نیچے گر رہے تھے۔ میں مارے

نفرت اور غصے کے اس پر جھپٹا۔ ''بے غیرت سب کو تباہ کر کے مگر مچھ کے آنسو بہاتا ہے۔ اس وقت تم کہاں تھے۔'' میں نے اس کا گریبان پکڑ کر اسے جھنجھوڑا۔ ''جب...... جب مسلمانوں کی عزتیں بھو کے بھیڑیے ادھیڑ رہے تھے۔۔ میں تجھے اور اس ملک کو، یہاں کے باسیوں کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔'' میں نے جنونی ہو کر اس کی گریبان کو جھنجھوڑا۔ ''تم کیسے دشمن ہو جنہیں روایات کا بھی خیال نہیں۔'' میں ہانپنے لگا۔ پسینہ میری پیشانی سے بہہ نکلا۔ میں نے جواد کی طرف اشارہ کیا۔ ''کیا جواب دوں گا جب یہ بڑا ہو کر مجھ سے پوچھے گا کہ تم نے 47ء سے سبق نہ سیکھا، اپنے پیاروں کی موت سے بھی سبق نہ سیکھا اور پھر میری ماں کو دوبارہ اس جہنم میں لے آئے۔ متعصب ہندوؤں کی پیاس بجھوادی۔ میں کیوں اسے ہندوستان لے کر آیا۔ کیوں، کیوں؟''

میں بری طرح رونے لگا۔ میرا دل پھٹا جا رہا تھا۔ یہ اندھیری کالی رات مجھے ڈس رہی تھی۔ تب وہ بھی نیچے بیٹھ گیا اور رندھے ہوئے گلے سے بولا۔ ''یقین کرو میں ان درندوں کے ساتھ نہیں تھا۔ میں ان کے ساتھ کیسے ہو سکتا ہوں کیونکہ میں بھی مسلمان ہوں۔ مجھے غلط مت سمجھو۔'' وہ منہ چھپا کر رونے لگا۔

میں نے سر اٹھایا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ''تم ہی کہو یہ کہاں کا انصاف ہے، یہ کیسا ظلم ہے، یہ کیسی نگری ہے۔ سب کو شہید کر دیا گیا اور کوئی دادرسی کرنے والا نہیں، کوئی فریاد سننے والا نہیں۔''

تب وہ دل گرفتہ لہجے میں بولا۔ ''ہم مسلمان یہاں اتنے مجبور ہیں کہ سب کچھ دیکھتے ہوئے، قاتل کا نام جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔'' پھر لمبی سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''جب کسی مسلمان علاقے میں فساد ہوتا ہے تو مسلمانوں کی ڈیوٹیاں وہاں نہیں لگائی جاتی ہیں کہ کہیں ہم فساد والے علاقے میں مسلمانوں کی مدد نہ کرنے لگ جائیں۔ یہاں کا یہی دستور ہے۔ یہ صرف تمہارے ساتھ ہی نہیں ہر گاؤں، ہر قصبے میں یہی ہو رہا ہے۔ مسجدیں شہید ہو رہی ہیں، قدیم بادشاہوں کی یادگاریں اکھاڑ پھینکی جا رہی ہیں۔ مسلمان عورتیں بے آبرو ہو رہی ہیں۔ بچوں کو اغوا کر کے کالی ماتا پر قربان کیا جا رہا ہے۔ مردوں کو اذیت دے دے کر ہلاک کیا جا رہا ہے۔'' اور پھر وہ شخص مٹھیاں بھینچ کر بولا۔ ''ارے دنیا کے لوگ، حقوق انسانی کی انجمنیں، فلسطینیوں کو رو رہی ہیں۔ بوسنیا پر نوحہ کناں ہیں لیکن بھارتی مسلمانوں کے لیے بھارت کے مظلوم مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اسے کوئی نہیں دیکھتا۔ صدیوں سے بسنے والوں پر یہاں جو ظلم ڈھائے جا رہے ہیں اس پر کوئی آواز نہیں اٹھاتا۔''

پھر اس نے پوچھا ''تمہارا کوئی بچا بھی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں! میرا اب یہاں کوئی نہیں رہا سب ختم ہو گئے۔ حویلی میں، میرا سامان تھا میں نے اس سے دھواں نکلتے دیکھا ہے پھر انتہائی لجاجت سے بولا۔ ''میری مدد کرو میں پاکستان جاؤں گا۔ اپنے ملک، اپنی سرزمین پر۔ حویلی سے نکلتے وقت میں نے پاسپورٹ لے لیا تھا مگر یہ تو بھیگ کر خراب ہو گیا۔'' تب وہ مجھے سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔

میں نے مڑ کر ٹرک کو دیکھا اور بے اختیار مجھ پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ میں ہنستا جاتا، روتا جاتا۔ ''واقعی بھارت میں بڑی جمہوریت ہے۔ یہاں کی پرجا کو بڑی آزادی ہے۔''

میرے قہقہے بلند ہوتے رہے۔ تب وہ پولیس والا میرے پاگل پن سے گھبرا گیا۔

میرے قہقہوں کی آواز سن کر ایک اعلیٰ افسر بھاگتا ہوا آیا اور میرے ساتھ والے پولیس افسر سے ڈپٹ کر بولا۔ ''اس کو اور بچے کو لے کر کہاں جا رہے ہو، جواب دو۔''

اس آدمی نے کہا۔ ''سر یہ واحد آدمی زندہ ملا ہے۔''

''باقی سب کہاں ہیں۔''

''ادھر۔'' میں نے انگلی سے تالاب کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس تالاب میں سب کو مار کر پھینکا گیا ہے۔''

میرا اشارہ پاتے ہی پولیس کے دس پندرہ آدمی تالاب میں کود گئے، اندر سے لاشیں نکال نکال کر میدان میں رکھی جانے لگیں۔

عورتوں کی ننگی لاشیں۔

کچلی مسلی اور روندی لاشیں۔

وہ جسم جو کبھی اپنوں کے سامنے عیاں نہ تھے، آج سی آر پی پولیس کے ٹرک کے سامنے عریاں پڑی تھیں۔ ان پر چادریں تک نہ ڈالی گئی تھیں۔

میرے ساتھ کھڑا مسلمان سپاہی بولا۔ ''یہاں تو کچھ نہیں ہوا۔ پورے ضلع میں فساد برپا ہے۔ یہ آگ بہت دور تک پھیل گئی ہے۔ ہر طرف رقص ابلیس جاری ہے۔ آؤ میں تمہیں کیمپ تک پہنچا دوں۔''

میں جواد کو گود میں لیے ہوئے اس کے ساتھ چل پڑا۔ سامنے جو ٹرک کھڑا تھا اس میں اس نے مجھے سوار کرا دیا۔ تبھی وہی افسر جس نے سپاہی سے سوال کیا تھا' قریب آیا۔ ''اسے جلد کیمپ لے جاؤ۔''

"لیس سر میں وہیں لے جا رہا ہوں۔" سپاہی نے جواب دیا۔

"ہری اپ.... جلدی کرو یہاں بہت سی لاشیں ہیں جن کو لے جانا ہوگا۔" کہہ کر وہ مڑ گیا۔

مجھے ٹرک میں سوار کرا دیا گیا۔ میرے بیٹھتے ہی ٹرک چل پڑا۔ ابھی ہمارا ٹرک کچھ دور ہی پہنچا تھا کہ سڑک پر بھاگتا ایک بچہ نظر آیا۔ اسے یوں بھاگتے دیکھ ڈرائیور نے ٹرک روک لیا۔

"یہاں ہر طرف ویرانی ہے۔ اتنی رات گئے یہ بچہ؟ کوئی گاؤں بھی اتنی نزدیک نہیں ہے کہ وہاں سے کوئی بچہ یہاں آجائے؟ ضرور یہ بچہ بھی کسی مسلمان پریوار کا ہے۔ اسے پکڑ و ورنہ کسی دشٹ (بدمعاش) کے ہتھے چڑھ جائے گا۔" افسر نے ایک سپاہی سے کہا۔

سپاہی نیچے اترا اور دوڑتا ہوا اس بچے کے پاس پہنچا۔ بچہ بمشکل تین یا چار سال کا ہوگا مگر وہ فوجی کو دیکھ کر اس طرح بھاگا کہ فوجی کو اپنی رفتار بڑھانی پڑی۔ سپاہی دوڑتا گیا اور اس نے بچے کو پکڑ لیا۔

بچہ بری طرح مچل رہا تھا۔

اس کی پکڑ سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔

شور مچا رہا تھا۔ چیخ رہا تھا۔

پکڑنے والا فوجی تھا اور وہ بچہ اس لیے قابو میں آگیا۔ سپاہی اسے لے کر ٹرک میں آگیا۔ ٹرک پر پہنچتے ہی اس نے پھر چیخنا شروع کر دیا کہ میں امی کے پاس جاؤں گا۔

لفظ امی نے خود بتا دیا کہ وہ بچہ مسلمان ہے۔ ہندو ہوتا تو ماں یا مائی کہتا۔

میں نے اسے اپنی گود میں لے لیا۔ جواد اس کی چیخ سے مزید سہم گیا تھا اور خاموش بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس بچے سے پوچھا۔ "تمہاری امی کہاں ہیں؟"

بچے نے جواب دینے کی بجائے عجیب عجیب باتیں شروع کر دیں۔ "میں امی کا دودھ پیوں گا..... نہیں، میں نہیں پی سکتا..... ہائے اللہ میں کیا پیوں' ان لوگوں نے تو امی کی چھاتی ہی کاٹ دی....... اُف میں کیا کروں..... وہ سب کہتے جا رہے تھے کہ اب یہ کسی مسلّے کو دودھ نہیں پلائے گی۔ ہم نے مسلّوں کا راستہ روک دیا...... میرا بھیا' میرا منا بھی نہیں پی سکے گا...... لیکن میں پیوں گا.... میں پیوں گا...... امی دودھ دو... امی بھوک لگی ہے دودھ دو.... میں بھی منّے کی طرح دودھ پیوں گا۔"

اس بچے نے ضرور کچھ ایسا دیکھا ہے جس نے اس کے دماغ پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔

میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ ایک جلتے ہوئے مکان سے چیختی ہوئی ایک بوڑھی عورت نکلی۔ وہ لب دم

تھی۔ اسے بھی فوجیوں نے ٹرک پر لا دلیا۔ میں نے بچے کو گود سے اتار کر جواد کے پہلو میں لیٹا دیا اور اس بڑھیا کے زخموں کو دیکھنے لگا۔ جہاں جہاں سے خون رس رہا تھا وہاں وہاں اس کی ساڑی کے آنچل کو پھاڑ کر باندھنے لگا۔ تبھی مجھے محسوس ہوا جیسے وہ کچھ بڑبڑا رہی ہے۔ ضعف ضعیفی کی وجہ سے آواز بہت ہلکی تھی۔ میں نے جھک کر اس کے لبوں سے کان لگا دیا۔

وہ کہہ رہی تھی۔ "مجھے پاکستان پہنچا دو.....

میں پاکستان جاؤں گی...

اپنے بھائیوں سے فریاد کرنے.......تم.....تم لوگ جس جنت میں رہتے ہو.....

اس جنت کی قیمت ہم چکا رہے ہیں۔۔۔۔

تم جن کی فلمیں....ڈرامے.....شو دیکھ کر خوش ہوتے ہو......

بے عزت ہونے بار بار بمبئی آتے ہو......

کبھی ہمارے بارے میں بھی سوچو.....

یہ کفار ہم پر ظلم کا پہاڑ توڑتے ہیں....

تمہارے پاکستان کی قیمت ہم ادا کر رہے ہیں......

آہ میرے پورے گھر کو جلا دیا......

چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی نہیں بخشا......

ہائے سب کو زندہ جلا دیا.......

ہائے میں ابھاگن جو باہر تھی...

اس کو بھی نہیں چھوڑا.........

دیکھو کس بے رحمی سے مارا ہے.....

مجھے پاکستان پہنچا دو.......

مجھے پاکستان جانا ہے...."

کہتے کہتے اس کا سر ڈھلک گیا۔

وہ پاکستان جانے کی تمنا لیے ملک عدم چلی گئی۔

ٹرک جب رُکا اور ہم سب نیچے اترے تو فوجی اسے اتارنے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر اس کا جسم ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ میں اس با ہمت بی بی پر دو آنسو بھی نہ بہا سکا۔

جہاں میں اُترا تھا وہ ایک بہت بڑی عمارت تھی۔ عمارت کے باہر فوجی جوان سنگین

تانے پہرے پر کھڑے تھے۔ ہمیں اس عمارت میں لے جایا گیا۔ میں نے جواد اور اس بچے دونوں کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔ بچہ محبت کی مہک پا کر سو گیا تھا۔ اندر پہنچتے ہی عمارت کی حقیقت معلوم ہوگئی۔ اندر بہت سارے مرد عورت بیٹھے لیٹے تھے۔ بچے بھی تھے جن کے چہروں پر خوف ہی خوف تھا۔ اس کمرے میں گیس کا ہنڈا جل رہا تھا جس کی روشنی ہر جانب پھیل رہی تھی۔ تاریکی کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ تاریکی اگر تھی تو لوگوں کے چہروں پر۔ ہر چہرے پر الگ کہانی تھی۔ لٹنے بچھڑنے کی کہانی۔

میں بھی ان کے درمیان بیٹھ گیا۔

میرے برابر بیٹھے شخص نے میری طرف جھک کر کہا۔ ''میں ریڈیو بچا لانے میں کامیاب ہوگیا۔ خبریں سنو گے؟ پہلے اصلی خبر سنو' میرا گھر لٹ گیا۔ بیٹا مار دیا گیا۔ بیٹی اغوا ہوگئی۔ لیکن آل انڈیا ریڈیو مسلسل کہہ رہا ہے۔ شہر میں اب امن ہے۔ گھروں سے دھواں اب بھی اٹھ رہا ہے مگر شہر میں امن ہے۔ اور سنو گے؟'' اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ان کا رونا تھا کہ ہر طرف بین شروع ہوگیا۔ شاید سب کو اپنے زخم یاد آرہے تھے۔ تبھی ایک کڑکتی ہوئی آواز گونجی۔

''خبردار..... خاموش.... اب کوئی رویا تو اسے گولی مار دی جائے گی۔''

یکلخت زندگی کی علامت ختم ہوگئی، ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ مگر میرے اندر کا انسان رو رہا تھا۔

روتے بلکتے۔ سوتے جاگتے رات کٹ گئی۔ صبح کا اجالا پھیل گیا۔ میں اٹھ کر صحن میں آگیا۔ مجبوری انسان کو بے شرم بنا دیتی ہے۔ وہاں ایسی عورتیں بھی تھیں جن کے اطوار بتا رہے تھے کہ اس سے پہلے انہیں کھلے آسمان نے بھی نہیں دیکھا ہوگا مگر اب وہ مردوں کے درمیان بیٹھنے پر مجبور ہیں۔

وہ حیا سے کٹی جا رہی تھیں۔ خود میں سمٹی سمٹی' کونے کھدروں میں چھپی جا رہی تھیں۔

مگر بھوک کی مجبوری انہیں روٹی کے لیے قطار میں کھڑے ہونے پر مجبور کر رہی تھی۔

مردوں کی قطار میں میں بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ روٹی لے کر پلٹا تو دیکھا کہ جواد اٹھ گیا ہے۔ مگر بچہ ابھی بھی بے خبر سو رہا تھا۔

میں نے ایک روٹی اس کے ہاتھ میں دے کر کہا ''بیٹے کھالو۔''

وہ روٹی کو ہاتھ میں پکڑ کر چوس رہا تھا کہ میں نے اجنبی بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا اٹھ جاؤ صبح ہوگئی۔''

بچہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھا۔ ''نہیں..... نہیں... میری امی کو مت مارو...... اللہ۔''

میں نے بچے کو سینے سے لگا لیا۔ اور پیٹھ تھپک کر بولا۔ ''ڈرو نہیں بیٹا۔ یہ میں ہوں۔''

''امی میری امی.....'' بچہ سسکنے لگا۔ ''انہوں نے میری امی کو چھریوں سے مارا.... میری امی..... وہ سب بہت ظالم تھے...... گنیش چاچا' جوگیشور چاچا' سہدیو کری سب نے مل کر مارا.... امی کا جگہ جگہ سے گوشت کاٹ لیا۔ امی میری امی...''

''بیٹے تمہاری امی کو کچھ نہیں ہوا۔ تم نے خواب دیکھا ہوگا۔'' میں نے دلاسہ دینے کی کوشش کی۔

''نہیں نہیں...... میں نے سب دیکھا تھا۔۔۔ جب حملہ ہوا امی نے جلدی سے مجھے بڑے صندوق کے پیچھے چھپا دیا۔ میں نے خود دیکھا...... امی کمرے میں ادھر سے ادھر بھاگ رہی تھیں...... جوگیشر منڈل۔ کیشو لال..... سب مل کر امی کو چھرے سے مار رہے تھے.... اتنا خون نکلا تھا۔۔۔۔ یہ اتنا...... امی گر گئیں تو انہوں نے امی کا سینہ کاٹ لیا.... امی میری امی.... میں دودھ پیوں گا... امی بھوک لگی ہے....'' وہ پھر سے رونے لگا۔

پتا نہیں اتنا کچھ دیکھنے کے بعد اس کا دماغ پھر گیا تھا یا وہ اب تک اثر سے نکل نہیں پایا تھا۔ اس کی دماغی حالت کو سدھارنے کے لیے۔ توجہ ہٹانے کے لیے میں نے دوسری روٹی اسے دے کر کہا۔ ''کھاؤ بیٹا۔ امی ابھی آجائیں گی۔''

روٹی دیکھ کر اس نے ہاتھ بڑھا دیا۔ شاید اسے شدید بھوک لگی تھی۔ وہ گود سے اتر آیا۔ اس نے روٹی کو بغور دیکھا۔ نوالہ توڑا۔ منہ تک لے جاتے جاتے نوالہ روک لیا پھر جلدی سے اسے منہ میں رکھ لیا۔

اس بچے کی ایک ایک حرکت عجیب تھی۔ پھر وہ جلدی جلدی نوالہ توڑنے لگا۔ کھانے لگا۔

جب روٹی ختم ہوگئی تو میں نے پوچھا۔ ''بیٹے! اور کھاؤ گے۔''

''نہیں کہہ کر اس نے میری گود میں سر رکھ دیا۔ میں دھیرے دھیرے اس کا سر سہلا رہا تھا کہ وہ پھر چیخ کر اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں جمع تمام لوگ چونک اٹھے۔

''کیا ہوا بیٹے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ منے کو..... منے کو....''

''کیا ہوا منے کو؟'' میں نے پھر سوال کیا۔

''انہوں نے.... انہوں نے منے کو دیوار میں گاڑ دیا..... دیوار پر ابو کی تصویر لگی تھی۔ اس

تصویر کو اتار کر کہا.....مردہ تصویر.....اسے پھینک دیا۔ پھر.....پھر ایک نے اس جگہ منے کو دیوار
سے لگایا.....اس کے سینے پر..... ننھے سے سینے پر، روتے ہوئے منے کے سینے پر منڈل چاچا نے
چھری رکھی ......جوگیشور چاچا نے ہتھوڑا اٹھا کر چھری پر مارا...... میرا منا چیخ کر خاموش
ہو گیا......میرا منا........''

میں شش و پنج میں تھا کہ بچے کا کیا کروں......اس کی ذہنی کیفیت ایسی نہیں تھی کہ
اسے کسی کو سونپ سکوں۔ پتا نہیں اس کے عزیز اقارب زندہ بھی ہیں یا نہیں.....ماں کے بارے
میں تو بتا رہا تھا مگر باپ کے بارے میں خاموش تھا۔ دوسرے کسی رشتے دار کا بھی کچھ پتا نہیں پایا
تھا۔ اس حالت میں اسے کس کے حوالے کروں؟ نفسا نفسی کا وقت تھا۔ خود غرضی عروج پر تھی۔
موت کو سامنے دیکھ کر بھی لوگ خود کو بھول نہیں پا رہے تھے۔ روٹی بٹتے وقت میں نے دیکھا تھا کہ
لوگ کمزوروں کو کیسے دھکیل کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ان حالات میں میں کیا کروں سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

اور میں بھی بچے کے ساتھ چیخ چیخ کر رونے لگا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جواد جو روٹی
چوس رہا تھا پھندا لگنے کی وجہ سے لمبی سانس لے کر خاموش ہو گیا تھا۔ اس کا سر ڈھلک گیا تھا۔

میرے قہقہے اب بھی بلند تھے۔ میرے ہاتھ اپنے ہی بالوں کو نوچ رہے تھے۔ موت
مجھے اب تک نہیں آئی تھی کہ ایک ایمبولینس آ کر رکی اور سفید کپڑوں میں ملبوس نرسیں اور ڈاکٹرز
اترنے لگے۔ دو ڈاکٹر اور ایک نرس میری طرف بڑھے میری حالت دیکھ کر نرس نے میرے بازو
میں انجکشن لگا دیا۔ میں تڑپ کر رہ گیا۔ دونوں ڈاکٹروں نے مجھے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ انجکشن لگنے
سے میرا ذہن تاریکی میں ڈوبنے لگا۔ مجھے پھر کوئی ہوش نہیں رہا کہ میں کتنے عرصے بے ہوش رہا۔
آنکھ کھلی تو ہسپتال کے کمرے سفید چادر پر آرام سے لیٹا ہوا تھا۔

آنکھ کھلتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا کہ اب تک میں انتہائی ڈراؤنا خواب دیکھتا رہا
ہوں۔ اچانک تڑپ اٹھا، ایک معزز شخص نے آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ رکھا اور مجھے تسلیاں
دینے لگے۔ ''آپ پلیز لیٹے رہیے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں پاکستانی سفارت خانے سے آیا
ہوں۔ جلد آپ کو پاکستان بھجوا دوں گا۔ ہمیں از حد افسوس ہے کہ ہم آپ کے خاندان کو نہ بچا
سکے۔ ان سب کو دفن کر دیا گیا ہے۔ آپ کے گھر کے تمام افراد کے اس بہیمانہ قتل پر مجھے افسوس ہے،
آپ بھی صبر کریں۔ اگرچہ سب کا پاسپورٹ ہمیں حویلی کے جلے ہوئے سامان میں مل گیا تھا پھر بھی
آپ کی حالت دیکھتے ہوئے ہم نے یہاں روک لیا۔ کیوں کہ آپ کے پاس سے بوسیدہ برٹش پاس
پورٹ ملا ہے۔ آپ تو برٹش نیشنل ہیں اگر چاہیں تو یہاں سے ڈائریکٹ لندن جا سکتے ہیں۔''

''نہیں میں پاکستان سے آیا تھا وہیں لوٹ کر جاؤں گا۔''

''جیسی آپ کی مرضی۔ انتظام کر دیا گیا ہے۔''

واپسی کے وقت میں فلائٹ کی سیٹ سے ٹیک لگائے یہ سوچ رہا تھا کہ کیا بھارت میں
مسلمان ہونا جرم ہے؟ کیا یہاں انصاف نام کی کوئی چیز نہیں ہے؟

☆☆☆

مجھے ہندوستان سے پاکستان آئے پورے دس دن ہو چکے تھے۔ امی فہمیدہ اور ابو کی
کوششوں سے میں بھارت کے دردناک واقعہ کو بھولنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ فہمیدہ ہمہ وقت
مجھے ہنسنے ہنسانے کی کوشش میں لگی رہتی۔

یہ اسی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ غم کے بادل دل سے چھٹ رہے تھے۔ اور میں زندگی کے
ہنگاموں میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ اب میں اکیلا بھی شہر دیکھنے نکل پڑتا تھا۔ میں نے اچھی طرح شہر
دیکھ لیا تھا۔ ابو نے بتا دیا تھا کہ میں ادھر ادھر زیادہ نہ جایا کروں کیوں کہ ان دنوں شہر کے حالات
صحیح نہیں ہیں۔ سیاسی کشمکش جاری ہے۔ یہاں کی ایک پارٹی کے دو دھڑے بن گئے ہیں اور وہ
دونوں ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں۔ کبھی کبھی غیر متعلق بندہ بھی اس چکر میں آ جاتا ہے۔ اس
لیے عقل مندی کا تقاضہ یہی ہے کہ زیادہ انجان جگہوں پر نہ جایا کروں مگر میں نے ان کی باتوں پر
توجہ نہیں دی۔

اس دن میں صبح ہی صبح گھر سے نکل گیا تھا۔ میں فاطمہ سے ملنے چلا گیا تھا۔ اسی سے
جس سے فلائٹ پر لندن سے آتے ہوئے ملاقات ہوئی تھی۔ میں بھارت کے زخم کو بھولنے کے
لیے خود کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی لیے اسے فون کیا تھا' کارڈ پر
لندن کا پتا درج تھا صرف فون نمبر یہاں کا تھا۔ فون کیا تو اس کے والد نے کال ریسیو کی تھی۔ اپنا
تعارف کرانے کے بعد میں نے فاطمہ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ انھوں نے اپنے گھر کا
پتا بتا دیا تھا۔ وہ لوگ نارتھ کراچی کے علاقہ بفرزون میں رہتے تھے۔ ان کے یہاں پہنچ کر پتا
لگ گیا کہ فاطمہ کیوں اتنا اتراتی ہے۔

بہت ہی معمولی گھر تھا۔ والد کسی محکمے میں کلرک تھے۔ آٹھ بہن بھائی تھے سب کی
شادیاں ہو چکی تھیں۔ یہ سب سے چھوٹی تھی۔ سب کے شوہر معمولی عہدوں پر تھے اتفاق سے ان
کے ایک دور کے رشتے داروں میں کسی کی بیوی مر گئی اس کا ایک چھوٹا بچہ تھا۔ اس نے پیغام دیا۔
لندن کا سن کر اس کے گھر والے فوراً راضی ہو گئے اور یہ بیاہ کر لندن چلی گئی۔ زندگی بھر غریبی میں

گزارا تھا اس لیے لندن کی فضا میں پہنچ کر یہ ہواؤں میں اڑنے لگی ہے۔ گھر میں بھی کسی کو منہ نہیں لگاتی۔ میاں کے امیر ہونے پر مغرور ہے۔ میں نے دو چار باتوں میں ہی جان لیا کہ اس کا میاں بھی بس ایویں سا ہے۔ دو ہزار پاؤنڈ تنخواہ ملتی ہے۔ گویا لندن کے حساب سے غریب تھا مگر میں نے راز کھولا نہیں اور ہنسی خوشی باتیں کر کے لوٹ آیا۔

وہاں سے اتنی آسانی سے اجازت نہیں ملی تھی۔ اس کے والد بہت اخلاق والے تھے۔ زبردستی کھانے پر روک لیا۔ کھانا کھاتے کھاتے تقریباً رات کے گیارہ بج گئے۔ مجھے ٹیکسی مل کر نہیں دے رہی تھی اس لیے میں پیدل آگے بڑھتا رہا۔ کافی دور جانے کے بعد منی بس ملی جس نے سڑک پر اتار دیا۔ وہاں سے پیدل ہی گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ میری نظر ایک پارک پر پڑی۔ کبھی پارک ہرا بھرا ہوا کرتا تھا مگر اب وہ اجاڑ پڑا تھا۔ ادھر روشنی بھی کم کم پڑ رہی تھی اس لیے وہاں اندھیرا کچھ زیادہ تھا۔ اس اندھیرے میں بھی دو ہیولے مجھے نظر آ گئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نوجوان کو دو آدمی کھینچتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ اسے گھونسے بھی مارتے جا رہے تھے۔ میں نے اتنا دیکھتے ہی شور مچا دیا۔ چیختا ہوا ادھر دوڑا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ آواز لگائی تھی "خبردار میں گولی چلا دوں گا۔" میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا مگر انھیں ڈرانے کے لیے میں نے یہ کہا تھا۔

میری آواز پر وہ دونوں گھبرا اٹھے تھے۔ انھوں نے گولیاں بھی چلائی تھیں۔ ایک مجھ پر اور دوسری اس نوجوان پر جس کو کھینچتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ میری قسمت کا ستارہ بلند تھا۔ میں اتفاقی طور پر جھک گیا تھا اور یہی بات میری زندگی کی ضمانت بن گئی تھی۔ گولی میرے کان کی لو کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ دوسری گولی انھوں نے لڑکے پر چلائی تھی مگر اس لڑکے کی چیخ سنائی نہیں دی۔ مجھے حیرت ہوئی تھی کہ میں نے اندھیرے میں بھی چنگاری لپکتے دیکھی جو اس کے جسم سے ٹکرائی تھی۔ انسان کتنا ہی بہادر کیوں نہ ہو زخم کا درد ضرور محسوس کرتا ہے۔ چیخ نہ سہی سسکاری ضرور لیتا ہے۔ اس نے آواز کیوں نہیں نکالی۔ یہ الجھن ضرور تھی مگر غور کرنے کا وقت نہیں تھا اس لیے میں نے بھرپور قوت سے آواز نکالتے ہوئے دھمکایا۔

مجرم کتنا ہی بہادر کیوں نہ ہو اس کا دل ہمیشہ چھوٹا ہوتا ہے۔ وہ بھی جرائم پیشہ تھے۔ کسی کی جان لینے جیسا گھمبیر جرم کر رہے تھے۔ میرے چلانے پر ڈر گئے اور گھبراہٹ میں فائر کرتے ہوئے بھاگ اُٹھے تھے۔

میں بھاگتا ہوا اس نوجوان کے پاس پہنچا تھا۔ اس کے نزدیک پہنچنے پر ادراک ہوا تھا

کہ اس لڑکے کے منہ میں کپڑے ٹھونسے ہوئے تھے، اسی لیے وہ آواز نکالنے سے قاصر تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ بھی پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ میں نے جلدی جلدی اس کے ہاتھ کھولے۔ لڑکے کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ بمشکل اٹھارہ انیس سال ہوگی۔ بہت حوصلہ مند تھا۔ آزاد ہوتے ہی اس نے کہا "بھیا آپ کا بہت شکریہ آپ نہ آتے تو یہ لوگ مجھے جان سے مار دیتے۔"

"جان سے مار دیتے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"اور کیا اسی لیے تو وہ لوگ مجھے لے کر یہاں آئے تھے۔" اس نے ہاتھوں میں پڑے نیل کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"کسی کو جان سے مار دینا کیا اتنا آسان ہے۔ پولیس انھیں چھوڑ دیتی' قانون تخت الثرا سے بھی ان کو کھینچ لاتا۔" تبھی میرا ہاتھ اس کی آستین سے چھو گیا۔ وہ چپچپا رہی تھی۔ شاید خون نکل رہا تھا۔ میں نے چونک کر کہا۔ "تمھیں گولی لگی ہے کیا؟"

"جی ہاں' بازو میں لگی ہے مگر۔۔۔۔"

"یہ اگر مگر چھوڑو چلو تمھیں ہسپتال لے کر چلتا ہوں۔"

"ہسپتال جانے کا مطلب ہے مصیبت کو دعوت دینا' آپ جلدی سے پٹی باندھ دیجیے بعد میں میں پرائیویٹ علاج کرا لوں گا۔"

"یہ تو جان سے کھیلنا ہے۔"

"اس وقت ہم جان ہی سے تو کھیل رہے ہیں۔ ساری دنیا تعصب کی بنا پر ہماری دشمن بن گئی ہے۔ خود ہمارے اپنے بھی اپنے مفاد کی خاطر ہمیں دیوار سے لگانے کی کوشش کرنے کے لیے مفاد پرست افسران کے کندھے پر چڑھ کر ہمارا صفایا کرنے کے لیے شہر میں دندناتے پھر رہے ہیں۔ جلدی کیجیے۔ گولی کی آواز دور تک گئی ہوگی کسی بھی وقت پولیس آ سکتی ہے۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ ہمیں پولیس سے مدد لینے کے لیے پولیس اسٹیشن تک جانا نہیں پڑے گا۔"

"نہیں بھیا! اس وقت ہم پر عرصہ حیات تنگ ہے۔ ہماری پارٹی کو کئی طرف سے نشانہ بنایا جا رہا ہے۔"

میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ کوئی گینگ وینگ کا چکر ہے۔ اس وقت تو میرے فرشتوں کو بھی پتا نہ تھا کہ یہاں سیاسی چپقلش میں بھی خون خرابہ ہوتا ہے۔ سیاست تو رہبری کا نام ہے۔ اسلام کے رہبروں نے کتنی خوبصورتی سے سیاست کر کے دکھائی کہ مدینہ میں ایک کتا بھی بھوکا

نہیں رہتا تھا۔ سیاست کرنے والے تو خوف خدا سے لرزنے والے ہوتے ہیں کہ عوام کی حق تلفی نہ ہو۔ اور یہاں اسلام کے دیس میں یہ کیسی سیاست ہو رہی ہے؟ میں نے سوچتے ہوئے لڑکے کی طرف دیکھا۔ وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

میں نے لڑکے کو جانے دیا اور خود اپنی گلی کی جانب چل پڑا۔ ابھی میں کچھ ہی دور گیا ہوں گا کہ سامنے سے آتی ہوئی کسی گاڑی کی ہیڈلائٹ میری آنکھوں پر پڑی۔ میری آنکھیں چندھیاں گئیں۔ میں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ تبھی بریک چرچرائے اور گاڑی کے رُکنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ سفید رنگ کی ہائی روف تھی۔ اس کا دروازہ کھلا اور دو لڑکے باہر نکلے۔ انھوں نے بغیر کوئی سوال جواب کیے مجھے دھکا دے کر گاڑی میں دھکیلا اور میری کنپٹی پر پستول رکھ کر کہا۔ ”اسی طرح پڑے رہو ورنہ گولی اندر دم باہر۔“

میں کسی جانور کی طرح دو سیٹوں کے درمیان پڑا ہوا تھا اور مجھ پر دونوں چڑھے بیٹھے تھے۔ اپنی درگت بنتے دیکھ میں نے پوچھا ”کیوں بھائی میرا قصور تو بتا دو۔“

”ابھی پتا چل جائے گا۔“ ایک لڑکے نے جواب دیا۔ ”اب خاموشی سے پڑا رہ ورنہ خواہ مخواہ ہمیں بارہ روپیکی گولی خرچ کرنی پڑے گی۔“

میں نے بھی خود کو حالات کے بھروسے پر چھوڑ دیا کہ قسمت سے کون لڑ سکتا ہے جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔

کچھ دیر کی ڈرائیو کے بعد گاڑی رکی اور مجھے کھینچ کر نیچے اتارا گیا۔ پھر کھینچتے ہوئے ہی اندر لے گئے۔ اندر لے جا کر ایک کرسی سے باندھ دیا گیا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے کیوں اغوا کیا گیا ہے۔ نہ میرے پاس کوئی بڑی رقم ہے نہ کوئی میرے لیے تاوان دے سکتا ہے۔ ابو کی معاشی حالت کے بارے میں بھی اندازہ ہو گیا تھا۔

ابھی میں سوچ میں گم تھا کہ ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر مجھے لانے والے نے کہا۔ ”بھائی یہ ہے وہ جس نے اس حرام زادے کو ہم سے چھینا ہے۔“

اس نوجوان نے بغیر کچھ پوچھے‘ مجھے ایک تھپڑ رسید کر دیا پھر بولا۔ ”کس یونٹ سے تعلق ہے؟“

”میں تو آپ کے یہاں نیا آیا ہوں۔ مجھے پتا ہی نہیں میرے ایریا کو یونٹ کہتے ہیں یا بلاک۔ مجھے تو صرف اتنا پتا ہے کہ میں جس محلے میں ٹھہرا ہوں اس کا نام کیا ہے۔“

”تو اس کا مطلب ہے تُو کوئی خاص بندہ ہے‘ بتا اس کو کہاں چھپایا ہے۔ کس کس نے

اسے اغوا کرتے دیکھا تھا۔“

”میں نے بتایا نا کہ میں دس دن پہلے ہی لندن سے آیا ہوں۔ میں یہاں کسی کو نہیں جانتا۔ آپ کس کے چھپانے کی بات کر رہے ہیں؟“

”لندن سے آیا ہے؟ اس کے معنی ہیں کہ یہ بہت امپورٹینٹ بندہ ہے۔“

پاس کھڑے ایک بندے نے پاکٹ سے بلیڈ نکال کر کہا ”یہ ایسے نہیں بتائے گا۔ اس کی پیشانی پر چیرا لگاتا ہوں۔ کھال اترنا شروع ہو گی تو فرفر بولنے لگے گا۔“ پھر وہ قدم بہ قدم آگے بڑھنے لگا۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اچھی نیت سے آگے نہیں بڑھ رہا ہے پھر بھی میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی:

”بھائی میرے پہلے یہ تو بتاؤ کہ تم کس بندے کے بارے میں پوچھ رہے ہو۔“

”اتنا تو تُو بھولا نہیں ہے۔ اب ہم اس کے بارے میں پوچھ رہے ہیں جسے تو نے ہمارے بندے سے بچایا تھا۔ وہ یونٹ کا خاص بندہ ہے اس نے ہمارے تین بندوں کو لڑھکایا ہے۔ اسے زندہ نہیں چھوڑنا تھا۔“ اس نے پستول نچا کر کہا۔

پتا نہیں یہ میری قسمت کی خوبی تھی یا اس لڑکے کی بے وقوفی کہ وہ کچھ زیادہ ہی جوش میں آگے بڑھا۔ اس کا پیر میرے پیر سے ٹکرایا اور وہ جھٹکا کھا کر ڈگمگایا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر میری گود میں گرا پھر اچھل کر پیروں میں چلا گیا۔

غفلت کا یہ لمحہ گو مختصر تھا مگر میرے لیے کافی تھا۔ میں اسے گنوا دیتا تو یہ میری حماقت کہلاتی۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے میں نے چھلانگ لگا دی۔

میرے کودتے ہی مجھ پر ایک ساتھ کئی فائر ہوئے۔ میں گرا تھا۔ گرتے ہی میں لڑھکتا چلا گیا تھا۔ کافی دور آنے کے بعد میرا جسم ایک آرائشی ستون سے ٹکرا کر رکا تھا۔ رکتے ہی میں نے خود کو دبکا لیا۔ تقریباً 20 منٹ کے بعد کوئی آتا ہوا نظر آیا۔ اس وقت مجھے ریوالور کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے ہی وہ قریب آیا‘ مجھے دیکھتے ہی وہ کھڑا ہو گیا۔ میں اُس کی جانب لپکا۔ اس نے کمر میں اڑسا چاقو نکال کر اس کا دستہ میری پیشانی پر دے مارا۔ خون کا گیلا پن مجھے محسوس ہوا۔ دماغ تک ہل گیا۔ میں پیچھے کی جانب جھکا۔ اس نے پھر حملہ کیا۔

میں ایک سرعت سے نہ ہٹتا تو میرے چہرے کا جغرافیہ بدل جاتا۔ پھر بھی دستہ میرے شانے سے ٹکرا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا میں نے اس پر تیندوے کی طرح چھلانگ لگا دی اور اُس سے بری طرح ٹکرا گیا۔ اس کے ہاتھ سے چاقو چھوٹ کر دور جا گرا۔

وہ مجھ سے ٹکراتے ہی گر گیا تھا لیکن برق سرعت سے اُٹھ کر کھڑا ہوا اور پھر ہم دونوں کے درمیان زندگی اور موت کی جنگ شروع ہو گئی۔ اب ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہی زندہ رہ سکتا تھا۔ میں نے پھر اُس پر چھلانگ لگائی۔ اُس نے کمال ہوشیاری سے خود کو بچایا اور ایک طرف ہو کر میرے جبڑے پر اتنی زور سے مکا مارا کہ میری ریڑھ کی ہڈی تک میں آگ بھر گئی۔ میں اس کے حملے سے سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ اس کے مضبوط ہاتھوں کا ایک بھرپور وار میرے گلے سے نیچے پڑا۔ میں درد سے کراہ اُٹھا۔

وہ بھی لڑائی میں ماہر تھا۔ وہ مجھ پر بھاری پڑ چکا تھا۔ یہ میری خوش بختی تھی کہ اندر سے ابھی تک کوئی اور باہر نہیں نکلا تھا۔ صرف وہی مجھے رگیدنے کی کوشش کیے جا رہا تھا۔

مگر وہ اپنے فن سے کام لینے کے بجائے اپنے ریوالور سے کام لینا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے جو نیم جان سا دیکھا تو اپنی جیب سے دوسرا ریوالور نکالنے لگا۔ اس وقت وہ میرے قریب تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے مجھ پر گھونسا تانا مگر میں اُس پر سبقت لے گیا۔ میں نے اس کے سر پر ایک زوردار ہاتھ دے مارا جس سے وہ بری طرح ڈگمگا گیا۔ لیکن اس نے اس کے باوجود میری پسلی پر ایک مکا رسید کر دیا۔ میں مدافعت کرنے لگا۔ اس کے گھونسوں میں بڑی طاقت تھی جس کی میں تاب نہیں لا رہا تھا۔ وہ مجھ پر مسلسل مکوں کی بارش کرتا تو شاید میں بچ نہ پاتا۔ اس نے ہولسٹر سے ریوالور نکالنے کی کوشش کی، وہ اُسے مہنگی پڑی۔ میں نے پھر اُس پر ایک اور جست لگا دی اور ہم دونوں زمین پر آ رہے۔ وہ میرے نیچے دبا ہوا تھا۔ میں نے بغیر کسی تاخیر کے اس کے منہ، سینے اور نازک مقامات پر جنونی انداز سے مکے برسانا شروع کر دیئے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس خبیث کا سر ڈھلک گیا۔

سفاک، وحشی اور ظالم جس کے نامۂ اعمال کی فہرست میں نجانے کتنے بے گناہوں کا خون شامل تھا، تعفن آمیز گندگی کے درمیان پڑا تھا۔ یہ میری غلطی تھی کہ میں نے اُسے کمزور سمجھ لیا تھا۔ میرے دل کو خوشی ہو رہی تھی کہ میں نے انتقام لے لیا۔ نووارد اور اس کا ساتھی ابھی اندر ہی تھے۔ شاید اس مغالطہ میں تھے کہ میرے پاس بھی پستول یا اس قبیل کا کوئی اسلحہ ہے اسی لیے باہر نہیں آ رہے تھے۔

کچھ دیر ستانے کے بعد میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اس لیے کہ مجھے یاد آ گیا تھا کہ میں ابھی بھی خطرے میں ہوں۔ سامنے کی طرف دیکھا' کوئی نظر نہیں آیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ان دونوں کا خطرہ ٹل گیا۔ وہ ابھی بھی میری تلاش میں ہوں گے۔ کسی بھی وقت میرا نشانہ لے سکتے

ہیں۔ میں محتاط انداز میں قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ سامنے ہی ایک دروازہ نظر آیا۔ میں اس سے اندر داخل ہو گیا۔

اندر گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے ریڈیم ڈائل کی گھڑی پر نظر ڈالی دس بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ گویا مجھے ان دو سے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا۔

میں اندر کی طرف کچھ اور آگے بڑھا۔ سامنے سیڑھیاں نظر آئیں۔ گو کہ مجھے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس عمارت کا اندر سے لے آؤٹ کیا ہے پھر بھی میں آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ کچھ آگے جانے کے بعد مجھے سیڑھیاں سی محسوس ہوئیں اور میں نے سنبھل سنبھل کر پیر رکھنا شروع کر دیا آہستہ آہستہ میں اُوپر کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اُوپر پہنچ کر میں نے محسوس کیا کہ اب لمبی راہ داری ہے۔ میں اس راہ داری میں بڑھنے لگا۔ میں دیوار کو ٹٹولتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک دروازے سے ہاتھ ٹکرایا۔ میں اس میں داخل ہو گیا۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے دیوار سے پیٹھ لگائی اور کھڑا ہو گیا' پھر زخم پر جلد بازی میں بندھی پٹی پر ہاتھ پھیرا' پٹی گیلی ہو رہی تھی۔ ہاتھ میں چپچپاہٹ سی آ گئی تھی۔ یقیناً یہ خون کی چپچپاہٹ تھی۔ سختی سے پٹی باندھنے کے بعد بھی خون نہیں رکا تھا' صرف بہاؤ میں فرق آ گیا تھا اور اب رس رہا تھا جس سے پٹی تر ہو گئی تھی۔ اس کام کو انجام دے کر میں کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔

وہ کھڑکی بغیر پلڑے کی تھی' جیسے ضرورت ہو گی' اس نے موقع پا کر اکھاڑ لیا ہو گا یا پھر مالکان خود کھول کر لے گئے ہوں گے۔ میں اسی کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ باہر ستاروں کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ گاؤں دیہات میں ستاروں کی روشنی تیز ہوتی ہے مگر شہروں میں یہ روشنی بھی پرانی ثقافت کی طرح دم توڑ دیتی ہے' بڑی مدھم نظر آتی ہے' میں اسی مدھم روشنی میں دور' کافی دور جلتی بجھتی روشنی کو دیکھ رہا تھا جبکہ ذہن میں موت کا خوف تھا' کسی بھی وقت موت کے ہرکارے پہنچ سکتے تھے۔

دفعتاً قدموں کی آواز ابھری تھی۔

یہ آواز نیچے سے آئی تھی۔

میں نے کان لگا دیئے۔

وہ دو آدمیوں کے قدموں کی آواز تھی۔

تبھی کسی نے کہا۔ "وہ اوپر آیا تھا۔ زخمی بھی ہے۔ یہ دیکھو خون کے دھبے!"

اس آواز نے دہلا دیا۔ گویا موت کے دونوں فرشتے یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔

"ارے یہ دیکھو گرد پر قدموں کے نشان بھی ہیں۔ اوپر کی طرف جا رہے ہیں۔" اس آواز کو سنتے ہی کلیجہ منہ کو آ گیا۔

"تم یہیں ٹھہرو میں دیکھ کر آتا ہوں' ٹارچ بھی بجھا دو' وہ ہوشیار ہو سکتا ہے۔"

قدموں کی آواز اب اُوپر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں پوری طرح ہوشیار ہو گیا۔ دیوار سے بالکل چپک کر کھڑا ہوا تھا۔ پیچھے ہٹنے کی وجہ سے میرے پیروں سے کوئی چیز اُلجھی تھی۔ میں نے جھک کر اسے اٹھایا تو دل خوش ہو گیا۔ وہ تار تھا' اسکوٹر کا کلچ وائر۔ تقریباً دو فٹ کا ہو گا۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں اس کے دونوں سرے لپیٹ لیے۔ اب وہ ایک خطرناک ہتھیار بن گیا تھا۔ اب میں پوری طرح قدموں کی آواز کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

قدموں کی آواز اب راہ داری میں آ رہی تھی پھر وہ آواز کمرے کے دروازے پر آ کر رک گئی۔ شاید اس نے گرد پر بنے قدموں کے نشان سے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اسی کمرے میں ہوں۔

میں نے دروازے اور فرش کے درمیان کے خلا میں دیکھا ہلکی روشنی اندر تک آ رہی تھی۔ شاید اس کے ہاتھ میں پنسل ٹارچ تھی پھر وہ روشنی بجھ گئی۔ میں مزید ہوشیار ہو گیا کیوں کہ دروازہ آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ پھر پستول کی نال کی جھلک نظر آئی اور ایک سر داخل ہوا۔ وہ جو کوئی بھی تھا' بڑی احتیاط سے داخل ہو رہا تھا۔

دروازے کے پیچھے کھڑا میں پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ یہ لمحہ ہی اتنا تناؤ بھرا تھا' اعصاب جواب دے رہے تھے۔

میں نے کلچ وائر کے دونوں سرے کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور دونوں ایڑیوں پر کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگا' بالآخر ایک ڈیڑھ سکنڈ بعد وہ اندر آ گیا مگر جیسے ہی اس نے اندر قدم رکھا' میں نے اچھل کر اس کی گردن میں وائر سے حلقہ کیا اور پھر اسے کستا چلا گیا۔ آنے والا لڑکھڑایا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ شکار کرنے آیا تھا اور خود شکار ہو گیا تھا۔ یہی تو اس دنیا کا قانون ہے' جو کمزور پڑا' وہ شکار ورنہ شکاری۔

میں پوری قوت سے تار کے دونوں سرے کو کھینچ رہا تھا۔ دشمن بری طرح مچل رہا تھا' تڑپ رہا تھا۔ آزادی کی کوشش کر رہا تھا مگر میں نے ذرا بھی موقع نہیں دیا اور سرے پر اتنی قوت صرف کی کہ اس کی دونوں آنکھیں باہر ابل پڑیں۔

اس کا زور لگاتا جسم ساکت ہو گیا اور وہ لہراتا ہوا زمین پر گرتا چلا گیا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی ایک چیونٹی تک نہیں ماری تھی۔ کراٹے کی ٹریننگ لے کر بھی رنگ تک محدود تھا مگر

آج قسمت نے مجھے قاتل بھی بنا دیا۔ اگر میں اسے نہ مارتا تو وہ مجھے مار دیتا۔

اپنی جان کی حفاظت میں ہی سہی مگر قتل جیسا جرم تو کر بیٹھا تھا۔

یہی کچھ سوچتا ہوا میں نے تار کو گچھے کی شکل دے دی۔ اور اسے لپیٹ کر جیب میں رکھ لیا۔ اب یہی میرا ہتھیار تھا اسی سے آگے بھی کام لینے تھے۔ اس زور آزمائی میں بری طرح تھک گیا تھا۔ زخم کی پٹی پر نظر ڈالی وہ پھر سرخ ہو گئی تھی۔ اس کی طرف توجہ دینا فضول تھا' میں نے ادھر سے نظریں ہٹا کر لاش کی طرف نظر ڈالی۔ وہ سیدھا سیدھا دروازے پر پڑا تھا۔ وہ جب نیچے نہیں جائے گا تو اس کا ساتھی اُوپر ضرور آئے گا۔ اس کی نظروں سے لاش کو چھپانا ضروری تھا۔ میں نے لاش کو کھینچ کر دروازے کے پیچھے دھکیلا تا کہ اندر گھسنے کے ساتھ لاش نظر نہ آئے پھر پہلے کی طرح دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

مجھے پورا یقین تھا کہ اس کا ساتھی اسے ڈھونڈتا ہوا اُوپر ضرور آئے گا۔

ابھی زیادہ وقت نہ گزرا تھا کے میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹ گونجی پھر آنے والا دروازے تک پہنچ گیا۔ اس نے پہلے آواز دی۔

"راحل اوراحل۔" وہ پکارتا ہوا دروازے کے اندر داخل ہوا۔

میں سمجھ گیا کہ مرنے والے کا نام راحل تھا۔ تیسری بار وہ آواز دیتا کہ میں نے ریوالور کا دستہ پوری قوت سے اس کے سر کی گدی پر مارا۔ وہ چیختا ہوا زمین پر گرا اور گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

"ہنہ' مجھے تر نوالہ سمجھ کر شکار نے آئے تھے اور خود شکار ہو گئے۔" میں نے اسے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا پھر وہیں بیٹھ کر پٹی بدلنے لگا۔ اس بار میں نے پٹی کے لیے بے ہوش شخص کی قمیص کو پھاڑا تھا۔

اس کام سے فرصت پا کر میں سیڑھیوں سے نیچے اترتا چلا گیا۔

عین اسی وقت باہر سے گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ میں اپنی جگہ دبک گیا۔ اندر کمرے میں جاؤں یا باہر دوڑ لگا دوں ابھی میں اسی بات پر غور کر رہا تھا کہ کچھ لڑکے اندر داخل ہوئے۔ ان سب کے ہاتھوں میں کلاشن کوفیں تھیں۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر مجھے سہارا دیا۔ میں نے تشکر بھری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ باقی اندر کی طرف پوزیشن لے کر بڑھے تبھی میں نے کہا۔ "اندر کوئی نہیں ہے۔ اوپر دو لاشیں ہیں۔"

"لاشیں؟ کس کی؟" مجھے سہارا دینے والے نے کہا۔

"ان کی جو مجھے پکڑ کر لائے تھے۔ ان میں ایک وہ بھی تھا جس پر مجھے شک ہے کہ وہی

ان کو مارتا ہوا اندھیرے گراؤنڈ میں لے جا رہا تھا۔" میں نے اس لڑکے کی طرف اشارہ کیا جسے میں نے بندھن سے آزاد کرایا تھا اور جس کی پاداش میں وہ لوگ مجھے پکڑ کر لے آئے تھے۔ اور مجھ پر تشدد کر رہے تھے۔ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ میں کس یونٹ کا بندہ ہوں۔

"آؤ جلدی کرو، باہر نکلو۔ کسی بھی وقت پولیس آسکتی ہے۔" اسی لڑکے نے آگے بڑھ کر کہا۔

اتنی دیر میں دوسرے لڑکے نے میرے سر پر پٹی باندھ دی تھی جس کی وجہ سے سر پر جو ضرب لگی تھی اس سے بہنے والا خون بند ہو گیا۔

وہ مجھے ساتھ لے کر باہر آئے۔ سڑک پر ایک ہائی روف کھڑی تھی۔ انھوں نے مجھے اس میں سوار کرایا۔ ہمارے بیٹھتے ہی وہ چل پڑی۔ کچھ دور جانے کے بعد ان میں سے ایک لڑکے نے پوچھا۔ "ہاں بھائی، کس یونٹ سے تعلق ہے؟"

"میں..... کس یونٹ سے؟ ان لوگوں نے بھی مجھ سے یونٹ کا پوچھا تھا۔ اب تم بھی پوچھ رہے ہو۔ یہ یونٹ کیا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"اتنے معصوم نہ بنو۔ ہم اپنے لوگ ہیں، یونٹ ایک سو پانچ کے بندے ہیں۔"

"معاف کیجیے، میں پاکستان میں بالکل نیا بندہ ہوں۔ لندن سے آیا ہوں۔ وہ تو انسانیت کے ناطے میں نے ان کی مدد کر دی تھی اور یہی بات میرے لیے گلے کا پھندا بن گئی ہے۔" میں نے تقریباً رو دینے والے انداز میں کہا۔

میری بات نے ان سب کو چونکا دیا۔ وہ سب تعجب بھرے انداز میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ پھر ان میں سے ایک بندے نے دوسرے سے کہا۔ "بھائی اس کا کیا اچار ڈالنا ہے چلتا کرو۔"

"ہاں جب اپنا بندہ نہیں ہے تو رسک لینے سے فائدہ..... چلتا کرو۔" دوسرے لڑکے نے کہا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے لڑکے نے بریک پر دباؤ بڑھا دیا۔ ہائی روف رک گئی۔ اسی لڑکے نے مجھ سے کہا۔ "جا بھئی جا مگر یاد رکھیو کبھی کسی سے ہمارا ذکر مت کیجیو۔"

میں نے نیچے قدم رکھتے ہوئے ایک بار پھر ان لڑکوں کی طرف دیکھا اور آگے قدم بڑھا دیا۔

اُس سوزوکی سے نکل کر میں باہر آیا، رات اچھی خاصی ہو گئی تھی مگر سڑک پر زندگی

رواں دواں تھی۔ لوگ اپنے اپنے کاموں کے لیے آ جا رہے تھے۔ میں بھی ان کا حصہ بن گیا۔ کچھ دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ آتے جاتے لوگ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہے ہیں۔ اس کی وجہ یقیناً میرے سر پر بندھی پٹی ہو گی کیوں کہ جلد بازی میں بندھی تھی۔ ضرور اوپر بھی خون آ گیا ہو گا۔ نظروں سے بچنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ اندھیرے کی بانہوں میں پناہ لے لوں اور میں ایک گلی میں مڑ گیا۔ وہاں ہر طرف اندھیرا تھا، ماحول پر سکوت طاری تھا۔ پتا نہیں، وہ کون سا علاقہ تھا؟ میں آگے ہی آگے بڑھنے لگا۔ مجھے امید تھی کہ میں زخمی ٹانگ کے ساتھ بھی یہ فاصلہ طے کر لوں گا۔ اگر میں سڑک تک پہنچ گیا تو رکشا، ٹیکسی ضرور مل جائے گی۔ میں اسی خیال سے لنگڑاتا ہوا دھیرے دھیرے آگے بڑھتا چلا گیا۔

ناہموار راستہ، زخمی پیر، پھر بھی میں نے کافی فاصلہ طے کر لیا تھا۔ اب سڑک زیادہ دور نہ تھی۔ میں نے کچھ دیر سستانے کا فیصلہ کیا اور وہیں ایک طرف بیٹھ گیا۔

گو کہ میں نے بہت زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا، بہت زیادہ پیدل نہیں چلا تھا پھر بھی تھکن مارے ڈال رہی تھی۔ شاید یہ بہت زیادہ خون نکل جانے کا اثر تھا۔ میں نے ٹٹول کر پٹی کو دیکھا، وہ چپچپا رہی تھی۔ گویا خون اب بھی رس رہا تھا مگر میں رکا نہیں، چلتا رہا۔

وہ رات......

اُس رات کو میں بھول نہیں سکتا، رینگنے کی رفتار سے میں چل رہا تھا، فاصلے سمٹ رہے تھے، سمٹتے ہوئے فاصلے نے بالآخر مجھے اُس جگہ پہنچا دیا جسے سڑک کہہ سکتے ہیں۔

یہ سڑک نہ پختہ تھی اور نہ کچی، برسوں پہلے کولتار سے بنی ہو گی مگر اب چھوٹے بڑے کھڈوں کا مجموعہ تھی۔ آثار بتا رہے تھے کہ دن بھر میں ایک دو بار کوئی نہ کوئی سواری گزرتی ہو گی مگر اُس وقت وہ ٹوٹی پھوٹی سڑک کسی عاشق کے دل کی طرح ویران نظر آ رہی تھی۔

جدھر سے روشنی نظر آئی تھی، میں اُدھر ہی بڑھنے لگا۔ وہ روشنیاں اب اور واضح ہو چکی تھیں۔ کلو دو کلومیٹر کا فاصلہ رہا ہو گا کہ میرا دل دھڑک اٹھا۔ عقب سے ہارن کی آواز آئی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تھا، واقعی وہ کسی رکشے کا ہیولہ تھا جو نزدیک آتا جا رہا تھا۔ میں اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ کچھ وقت گزرا تھا کہ رکشا نزدیک آ گیا۔ اُسے قریب دیکھ کر میں نے کہا۔ "بھائی...... چلو گے؟"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔" اُس نے جلدی سے کہا۔ اُس کی عجلت سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اُدھر ہی جا رہا تھا۔

رکشے والے نے ہاتھ راڈ پر رکھ دیا تھا۔ یہ اشارہ تھا کہ میں اُس پر سوار ہو جاؤں اور

میں سوار ہو گیا۔

رکشے والے نے رکشا اسٹارٹ کر دیا۔ ٹوٹی ہوئی سڑک' جا بجا اینٹ پتھر کے ٹکڑے' رکشے کا پہیہ اچھل اچھل جاتا مگر رکشے والا بے پروا سا چلائے جا رہا تھا۔

اگر میں زخمی نہ ہوتا تو کبھی رکشے میں نہ بیٹھتا۔ وہ رکشا نہیں' تذلیل تھی۔ پہلی بار ایسے رکشے کو دیکھ کر میں نے یہی سوچا تھا مگر ابھی مجبوری تھی' اِسی لیے پچھلی سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھا رہا۔ رکشے والا دوڑتا رہا۔ رکشا آگے بھاگتا رہا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ہم پکی سڑک پر پہنچے۔

سڑک پر آتے ہی میری متلاشی نظریں دکانوں کے بورڈز پر پھسلنے لگیں کہ انگریزی میں لکھا ایک بورڈ نظر آ گیا' تب پتا چلا کہ اُس وقت ہم 5D گلشن کے علاقے میں ہیں مگر یہاں سے ہمارا محلہ کتنی دور ہے' یہ پتا نہیں تھا۔ یکا یک مجھے خیال آیا کہ جیب بھی چیک کر لوں' کہیں افراتفری میں روپے گر نہ گئے ہوں۔

میں نے پینٹ کی پچھلی جیب کو ٹٹولا اور اطمینان ہو گیا' جیب پھولی ہوئی تھی۔ اِس جیب میں سو سو روپے کے تقریباً بیس نوٹ رکھے تھے جو اَب بھی موجود تھے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ رکشے والے کو اتر کر سو روپیا دے دوں گا جو اُس کے لیے نعمت ہوگا۔ میں نے دیکھا تھا کہ لوگ تیس چالیس روپے سے زیادہ کرایہ اَدا نہیں کرتے تھے۔

میں سوچ میں ڈوبا بیٹھا تھا کہ رکشے والے نے اپنی رفتار کم کرنا شروع کر دی۔ اِس رکشے میں ایک خرابی یہ بھی تھی کہ یہ یکلخت نہیں رکتا' ڈرائیور آہستہ آہستہ اِس کی رفتار کم کرتا تھا۔ میں نے اَزراہِ تجسس پوچھ لیا۔ ''کیوں بھائی! رک رہے ہو کیا؟''

''جی! مجھے پیشاب کرنا ہے' یہاں سناٹا ہے' آرام سے فارغ ہو جاؤں گا۔ بڑی سڑک پر بیٹھا تو پولیس والے چالان کر دیں گے۔ جرمانہ دینا ہوتا ہے۔ ہم غریب کہاں سے اَدا کریں گے؟''

رکشا روک کر وہ سڑک کنارے جا بیٹھا۔ میں اُس کے لوٹنے کا انتظار کر ہی رہا تھا کہ یکا یک ہی دو نوجوان اندھیرے سے نکلے اور رکشے کی دو طرف کھڑے ہو گئے۔ ہلکی روشنی میں اُن کے ہاتھوں میں پکڑے چاقو نظر آ گئے۔ یہ کون ہیں' کیا چاہتے ہیں' ابھی میں پوچھنے ہی والا تھا کہ اُن میں سے ایک بولا۔ ''گھڑی اور پرس میرے حوالے کر دو......''

میں نے ناقد نظروں سے اُن کا جائزہ لیا پھر بولا۔ ''کیوں بھئی' ایسا ظلم کیوں کر رہے ہو؟''

''چاقو دیکھا' ابھی گلے پر لکیر بن جائے گی۔'' داہنے جانب کھڑے ایک قد آور جوان نے کہا۔

''اور اگر میں نہ دوں تو......؟'' میں نے اطمینان بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''لگتا ہے' چاقو شہ رگ پر چلے گا......''

''اگر تمھیں پرس چاہیے تو یہ لو......'' رکشے سے نیچے اترتے ہوئے میں نے کہا۔

یہ دو نوجوان میرا کیا بگاڑ سکتے تھے۔ نیچے اترتے ہی داہنی جانب کھڑا نوجوان میری زد پر آ گیا۔ میں نے اترتے ہی ہاتھ چلا دیا تھا۔ اپنی کلائی سے اُس کی کلائی پر مارا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کھلا چاقو تھا جو چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔ اپنے ساتھی کی حالت دیکھ کر دوسرا نہایت تیزی سے میری طرف بڑھا۔ درمیان میں رکشا تھا' وہ گھوم کر آیا تھا۔ میں پہلے سے تیار تھا۔ جیسے ہی نزدیک پہنچا' میں نے زخمی ٹانگ پر وزن ڈالا اور دوسری ٹانگ اٹھا کر پوری قوت سے گھوم گیا۔ میرے جوتے کی نوک اس کے چہرے سے ٹکرائی۔

جوتے کی سختی' گھومنے کی قوت' اس کا تھوبڑا بگڑ گیا' منہ سے خون کی چھینٹیں نکل آئیں۔ وہ ہائے ہائے کرتا ہوا بیٹھ گیا۔ اس کی حالت دیدنی تھی۔ رکشے والا جو کچھ دوری پر بیٹھا پیشاب کرنے کا ڈرامہ کر رہا تھا' اپنے ساتھیوں کو پٹتے دیکھ ان کی مدد کو آ گیا۔ آتے ہی اس نے گھونسا چلایا مگر اس کا گھونسا مجھ پر کیا پڑتا' میرے گھونسے نے اس کا مزاج پوچھ لیا۔ ساتھ ہی ساتھ میں نے کہا۔ ''کیوں بیٹے! یہ اوور ٹائم لگا رہے تھے ناں' شہریوں کو لوٹنے کا اچھا طریقہ نکالا ہے۔''

جواب میں اس نے ایک موٹی سی گالی دی' اس گالی نے کمال کر دکھایا۔ میری رگوں میں خون کی جگہ غصہ دوڑ گیا اور میں نے گالی کا جواب دینے کے نام پر ایسا گھونسا رسید کیا جو اس کے لیے یقیناً یادگار رہا ہوگا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ وہ پیچھے ہٹا تو اس کا پہلا ساتھی جس نے لات کھائی تھی' میری طرف دوڑا بالکل ایسے جیسے وہ ٹکر مار کر مجھے گرا دے گا۔ میں نے فوراً ہی اس کا جواب دیا۔ پوری قوت سے اس کے سر پر گھونسا مارا اور وہ ایک ہی گھونسے میں زمین پر گرا۔ کچھ دیر تڑپا پھر لمبا لمبا لیٹ گیا۔ اب دو بچ گئے تھے' میرے لیے ان دونوں کی کوئی حقیقت نہ تھی مگر میں زخمی بھی تھا' ڈھیر سارا خون بہا تھا بلکہ اَب بھی بوند بوند رِس رہا تھا جس کی جانب میری توجہ نہیں تھی۔ غصہ پاگل پن کی ایک قسم ہے' پاگل پن میں درد تکلیف۔ ہوا ہو جاتی ہے' انسان خونخوار ہو جاتا ہے' میں بھی خونخوار بن چکا تھا اور ان دونوں کو خونی نظر سے گھور رہا تھا۔ وہ دونوں اب سہمے سہمے نظر آ رہے تھے۔ یہ میرے حق میں بہتر تھا۔ میں نے مزید رعب ڈالنے کے لیے کہا۔ ''اگر مرنے کی تمنا ہے تو ٹھہرے رہو' پٹتے رہو اور اگر زندگی عزیز ہے تو موقع کا فائدہ اٹھاؤ اور نو دو گیارہ ہو جاؤ......''

شاید وہ بھی فرار چاہتے تھے' میرا جملہ ختم ہوتا کہ اُن دونوں نے دوڑ لگادی۔ رکشے کو بھی لینا گوارہ نہ کیا۔ میں اکیلا کیا کرتا' سو میں نے قدم بڑھادیے۔ کچھ دور چلنے کے بعد اسٹریٹ لائٹ کی قطار نظر آ گئی۔ میں نے قدم تیز کردیے جبکہ مجھ سے چلا نہیں جا رہا تھا پھر بھی لنگڑاتے ہوئے بڑھتا جا رہا تھا۔ سڑک پر پہنچتے ہی ایک چائے خانہ نظر آ گیا۔ اس چائے کی دکان کے سامنے ایک ٹیکسی بھی کھڑی تھی' اس ٹیکسی نے میرے جوش کو آواز دے دی۔ میں مزید تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ رکشے والے کی حرکت نے مجھے ہوشیار کردیا تھا۔ لٹیرے ہر ملک' ہر جگہ ہوتے ہیں مگر یہاں کے لٹیرے تو پلانرز تھے۔ کتنی عمدہ پلاننگ کی تھی' ویران جگہ پر کھڑے ہوگئے کہ اکیلا راہی ملے گا تو اُسے لوٹ لیں گے۔

انہوں نے تو لوٹ لیا ہوتا اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا۔ یہ تو میری قوتِ ارادی تھی کہ زخمی ہوتے ہوئے بھی میں نے مقابلہ کیا۔ کہیں یہ ٹیکسی والا بھی لٹیرا نہ ہو' اسی شش و پنج میں ڈوبا ہوا میں اس دکان تک پہنچ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور پٹھان تھا' اس سے میں نے کہا۔ "خان بھائی......! چلو گے؟"

"چلے گا کہاں جانا ہے؟" اس نے چائے کا سِپ لے کر کہا۔

میں نے وقت گنوانا مناسب نہیں سمجھا اور دروازہ کھول کر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ اِس طرح دکان میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی میری طرف متوجہ نہیں ہوئے اور میں سیٹ سے ٹیک لگا کر سوچ کے گرداب میں کود پڑا۔

رکشا دوڑ رہا تھا مگر اس سے بھی تیز میرا ذہن دوڑ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ دنیا بھر میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس سے یہ لوگ سبق کیوں نہیں لے رہے ہیں۔ کیوں آپس میں ہی لڑ رہے ہیں۔ اسلام تو آفاقی مذہب ہے۔ امن اور آشتی کا مذہب ہے۔ یہ جنگ و جدل کیوں در آیا ہے۔ رحمت العالمین کے ماننے والے زحمت کیوں بن رہے ہیں۔ یہ سب کس راستے پر چل پڑے ہیں۔

"صاحب جی دستگیر آ گیا ہے۔" رکشے والے کی آواز پر خیالات کے تانے بانے بکھر گئے۔ میں نے چونک کر باہر دیکھا۔ سامنے ہی وہ گلی تھی جس کے ایک گھر میں میرے ابو وغیرہ رہ رہے تھے۔ میں نے کرایہ دینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تھا کہ دل دھک سے رہ گیا۔ مجھے خیال ہی نہیں تھا کہ اُچھل کود میں میرا پرس گر چکا ہے۔ اب میں رکشے والے کو پیسے کہاں سے دوں اسی پر غور کر رہا تھا کہ گلی سے ایک لڑکا باہر نکلا جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی وہ ٹھٹک گیا پھر نہایت تیزی سے میرے قریب آیا اور بولا "آپ... آپ کو اس طرح باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔"

"میں اس رکشا والے کو کرایہ دینے کی سوچ رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"کتنا کرایہ دینا ہے۔" اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے پوچھا تھا۔

اس نے کرایہ ادا کر کے میرا ہاتھ پکڑا اور تقریباً کھینچتا ہوا مجھے اپنے ساتھ گلی میں لایا اور اپنے گھر کے کھلے ہوئے دروازے کے اندر دھکیل کر بولا۔ "آپ نے بہت بڑا رسک لیا ہے۔"

"رسک کیسا رسک؟" میں نے پوچھا۔

"آپ بیٹھیے تو سہی!" اس نے صوفے پر تقریباً دھکیل دیا۔

میں حیران پریشان سا بیٹھ گیا۔ اس نے سامنے والے صوفے پر دراز ہوتے ہوئے کہا "آپ کو ابھی محلے کی طرف آنا نہیں چاہیے تھا۔"

"مگر کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اس لیے کہ آپ کی تلاش میں پولیس آئی تھی۔" اس نے کہا

"میری تلاش میں؟ مگر کیوں....میں نے تو کوئی جرم نہیں کیا۔ میں تو قانونی طور پر یہاں آیا ہوں۔"

"مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا مگر ایس آئی میرا دوست ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ آپ کے خلاف کسی نے رپورٹ درج کرائی ہے کہ آپ کا تعلق اس سیاسی جماعت سے ہے جو آج کل معتوب ہے۔ آپ کے خلاف بتایا گیا ہے کہ آپ ٹارچر سیل چلا رہے تھے۔ پولیس والوں نے آپ کے ابو کو دھمکی دی ہے کہ کہیں سے بھی آپ کو پیش کیا جائے۔"

میرا دماغ مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ میرے ساتھ ایسا بھیانک مزاق کس نے کیا ہے۔ میں تو سات سمندر پار سے پہلی بار یہاں آیا ہوں۔ مجھے یہاں کی سیاست سے کیا مطلب مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ یہاں کتنی سیاسی پارٹیاں ہیں۔ کون حزب اختلاف میں ہے۔ کون اقتدار میں۔ اس پر غضب دہشت گردی کا الزام۔ جب کہ میں تو اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ قرآن نے ظالموں پر لعنت کی ہے۔ کھلے الفاظ میں کہا ہے کہ دین میں جبر نہیں ہے۔

"کس سوچ میں ڈوب گئے؟" اس نے پوچھا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ میرا نام کسی جماعت سے کیوں منسلک کیا جا رہا ہے۔ پھر تم مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہو رہے ہو؟"

"آپ لندن کے کھلے ماحول سے آئے ہیں اس لیے بتا دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ دراصل میں فہمیدہ کو پسند کرتا ہوں۔ وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے۔ بہت جلد ہم ایک ہونے

والے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی سب راضی ہیں اور آپ کے یہاں بھی۔ اسی لیے میں آپ کو غیر نہیں رشتے دار سمجھتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں آپ کے لیے پریشان ہوا اٹھا ہوں۔"

اس کی بات پر میں حیران ہوا تھا۔ میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ بولا:

"آپ کا کسی سے جھگڑا وغیرہ تو نہیں ہوا ہے؟"

"جھگڑا تو نہیں کہہ سکتے ہیں غلط فہمی ضرور کہہ سکتے ہیں۔ ہوا یہ تھا کہ میں گھر واپس آرہا تھا۔ سامنے والے پارک میں ایک بندے پر کچھ لوگ تشدد کررہے تھے۔ میری نظر پڑ گئی میں نے اس بندے کو ان سے چھڑانے کی کوشش کی۔

اسے بچالیا۔

اسے وداع کر کے میں گھر کی طرف چل پڑا، ابھی اپنی گلی میں داخل بھی نہیں ہوا تھا کہ کچھ لوگوں نے مجھے زبردستی ایک گاڑی میں بٹھالیا۔ ایک گھر میں لے جا کر تشدد کررہے تھے کہ ایک دوسرے گروپ نے آکر چھڑالیا۔ بس یہی ہوا ہے۔" میں نے اسے پوری بات نہ بتا کر آدھی اور اُدھوری بات بتائی اور اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کی پیشانی پر فکر کی لکیریں ابھر آئیں۔

"آپ اسے غلط فہمی کہہ رہے ہیں۔ ارے جناب آپ نے ابلتے آتش فشاں میں خود کو گرا دیا ہے۔ یہاں دو پارٹیاں آپس میں ٹکرا رہی ہیں۔ ایک کو کچھ پولیس والوں کی حمایت حاصل ہے۔ وہ لوگ اپنے مخالفین کو پولیس کی مدد لے کر موت کی نیند سلا رہے ہیں۔ دوسری پارٹی بھی وہی کررہی ہے۔ آپ نے نادانستگی میں ان کو اپنا مخالف بنا لیا ہے۔ یہ انہی لوگوں کی کارستانی ہے کہ آپ کے خلاف پولیس میں رپورٹ کردی گئی۔"

"پولیس ایسے تو کسی کے خلاف ایکشن نہیں لیتی قانون بھی تو کوئی چیز ہے۔"

"قانون کی پاسداری آپ کے لندن میں ہوتی ہوگی یہاں تو جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون چلتا ہے۔ آپ بیٹھیے میں آپ کے ابو کو بلا لاتا ہوں پھر بیٹھ کر سوچیں گے کہ کیا کرنا چاہیے۔" کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔

وہ جا چکا تھا۔

کمرا خالی تھا۔

اکیلے کمرے میں بیٹھا تھا مگر میرے ذہن میں سوچ فکر کا ایک میلہ سا لگا تھا۔

فکر کا آکٹوپس چہار جانب سے جکڑے ہوئے تھا۔ دماغ میں اندیشوں کا بچھو بار بار ڈنک مار رہا تھا۔

ابھی میں سوچ کے گرداب سے نکلا بھی نہیں تھا کہ دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہوا۔ ابو اس کے ساتھ تھے۔ ان کا چہرہ فق پڑا ہوا تھا۔ لندن میں سنا تھا کہ پاکستانی تھانوں میں کسی کی عزت ایک منٹ میں اتار دی جاتی ہے۔ یقیناً ان کے ساتھ بھی کوئی برا سلوک ہوا ہے اسی لیے ان کا چہرہ کورے لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا ہے۔ انہوں نے آتے ہی مجھے سینے سے لگالیا۔ وہ سسک رہے تھے۔

"انکل حوصلے سے کام لیجیے۔ رونے دھونے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ کوئی ٹھوس حل سوچیے۔" اس نوجوان نے کہا۔

"میرا خیال ہے تم لوٹ جاؤ۔" ابو نے رندھے گلے سے کہا۔ ان کی آواز میں عجیب سا درد چھپا تھا۔

میں حیرت سے انہیں دیکھتا رہ گیا تھا۔ میری روح کی گہرائیوں میں ایک لرزہ سا محسوس ہوا تھا۔

"مگر کیوں؟ میں نے جب کچھ کیا ہی نہیں تو پھر فرار کا راستہ کیوں اپناؤں۔" میں نے جواب دیا۔

دراصل میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اخبار کا سہارا لوں گا۔ برٹش ایمبیسی کو انوالو کروں گا تاکہ میرے بعد ابو پر کوئی آنچ نہ آئے مگر انسان سوچتا کچھ ہے ہوتا کچھ ہے۔

ابو نے ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں کہا "تم کیا یہ چاہتے ہو کہ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگ جائیں۔ ابھی تو محلے داروں نے گواہی دے دی ہے کہ میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ میں نے "ب فارم" بھی دکھا دیا ہے مگر جب وہ لوگ تمہیں میرے گھر سے برآمد کریں گے تو میرا کیا حشر ہو گا؟ تمہاری ماں بہنیں تھانے میں کھڑی ہوں گی۔ تمہیں اگر مجھ سے محبت ہے تو تم چلے جاؤ۔ تمہیں میری قسم ہے۔"

میں سوچنے لگا کہ انسان بھی کتنا مجبور ہے۔

لاچار ہے۔

مجبوری کا خنجر پیار محبت کا گلا دبا دیتا ہے۔ اس لیے میں مہر بہ لب رہ گیا۔ ابو نے اپنی قسم دے دی تھی اور میں مجبور ہو گیا تھا۔ اسی نوجوان کے ساتھ میں ایئرپورٹ کے لیے اسی وقت نکل گیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے جو بھی فلائٹ ملے گی میں اسی سے نکل جاؤں گا۔

کیوں کہ میرے خواب بکھر گئے تھے۔ جن آنکھوں میں خواب بسے تھے وہاں اب

کرچیوں کا بسیرا تھا۔

خواب بکھرنے کی چبھن بے چین کر رہی تھی۔ دل یہی کر رہا تھا کہ میرے پنکھ لگ جائیں اور میں اڑ کر لندن پہنچ جاؤں۔ اس دیس میں جس کو میں نے کبھی اپنا نہیں سمجھا۔ جس کی محبت نے کبھی مجھے بے چین نہیں کیا۔ اور جس سرزمین کو میں نے اپنا وطن سمجھا۔ جس سرزمین کی چاہت میں دن رات تڑپتا رہا' وہاں کے عاقبت نا اندیش لوگوں نے میرے جذبات کو میرے خیالات کو میری حب الوطنی کو لہولہان کر دیا۔ میرا کیا حال کیا۔ مجھے رہ رہ کر رونا آ رہا تھا۔ میرا دل شکوہ کناں تھا علامہ اقبال سے' قائداعظم سے' قائد ملت سے کہ کیا انہوں نے اسی وطن کا خواب دیکھا تھا۔

راستے بھر وہ پتا نہیں کیا کیا پڑھ کر مجھ پر پھونکتا رہا۔ شاید وہ خود بھی خوف میں مبتلا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر مخبری ہو گئی تو کیا ہوگا۔ لیکن کرم اللہ کا کہ ہم بحفاظت ایئرپورٹ پہنچ گئے۔

اتفاق کی بات ہے کہ لف تھانسا ایئرپورٹ میں ایک کینسل شدہ سیٹ مل گئی اور میں وہاں سے بہ آسانی لندن کے لیے نکل پڑا۔ سیٹ سے ٹیک لگا کر میں سوچنے لگا' میرا جرم یہی ہے نا کہ میں مسلمان ہوں۔ کیا مسلمان ہونا جرم ہے؟ جس کی سزا دنیا کے ہر کونے میں دی جا رہی ہے۔ دشمن بھی دے رہے ہیں اور دوست بھی؟ آخر مسلمانوں کا مستقبل کیا ہے؟

سوتے جاگتے۔ آنسو بہاتے ہوئے ہیتھرو تک پہنچ گیا۔

کسٹم والوں نے میرے سامان کی تلاشی لی تو انہیں ایک قابل اعتراض چیز مل گئی۔ ایک ٹین کا چھوٹا سا ڈبا جس میں میرے پاک وطن کی مٹی تھی، جسے میں نے اس خیال سے لے لیا تھا کہ اس کی خوشبو مجھے وطن کی یاد دلاتی رہے گی۔ اس وطن کی جو میرے والد کا وطن ہے۔

دوسری قابل اعتراض چیز قران پاک کا نسخہ تھا۔ ان لوگوں کو حیرت تھی کہ ایک برٹش پاکستان سے آ رہا ہے۔ قرآن ساتھ لا رہا ہے تو یقیناً دہشت گرد ہوگا۔

میں سوچ رہا تھا یہ کیسا وقت آ گیا ہے کہ مسلمان ہونا۔ قران پاک رکھنا جرم بن گیا ہے۔ ہمیں اس نہج تک پہنچایا کس نے؟ کیوں ہمارے لیے مسلمان ہونا جرم بنا دیا گیا ہے....

کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟

